باہتمام مولوی عبد الحق صاحب مالک مطبع رفاہ عام سٹیم پریس لاہور

البرہان

یہ ایک علمی۔ اخلاقی۔ تاریخی۔ تمدنی ماہوار رسالہ ہے۔ جس کا مقصد اعلےٰ تائید حق۔ اثبات حق و اظہار حق ہے۔ اور اپنے براہین و دلائل سے ہر ایک امر کی حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس میں حقیقت و حقیت اسلام اور اُس کی سچی تعلیم فضائل اور کمالات اور علوم انبیاءؑ۔ حقیقت نبوّت۔ انبیاء اور اُن کے اوصیائے کرام علیہم السّلام کے اخلاق حسنہ تاریخی واقعات۔ جدید اکتشافات وغیرہ مسائل پر عقلی و نقلی دلائل سے بحث کی جاتی ہے۔ اسلام کے برخلاف جملہ اعتراضات و ایرادات کا جواب نہایت متانت سے دیتا ہے۔ علمائے کرام و مُلک کے اہل قلم اور گریجوئیٹ صاحبان کے اعلےٰ مضامین درج ہوتے ہیں۔ لکھائی چھپائی نہایت عمدہ۔ قیمت سالانہ صرف دو روپے آٹھ آنے (عہ/۸)۔ بازار حکیماں لاہور سے شائع ہوتا ہے *

بسم الله الرحمن الرحيم

اهتمام جلالة سلطان ايران بترويج العلم والدين

او

تمجيده لحضرة العلامة الشهرستاني والامر بنشر مطبوعاته بين المحصلين

ترجمة مرقومة
وزارة الدربار (...) الاعظم
نمرة (٩٠٧ ع ...)

من قابينة وزارة الدربار (المابين) الاعظم
٢٨ ميزان ٢٧ شوال سنه ١٣٢٩
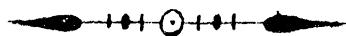
حضرة ... ملاذ الاسلام سيد العلماء الاعلام .. السيد (هبة الدين) الشهرستاني المؤلف المحترم لمجلة (العلم) الشريفه دامت افاضاته .
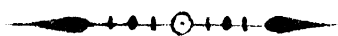
وصل كتابكم المستطاب (الهيئة والاسلام) ومجلتكم الشريفه (العلم) لحضور الحضرة الباهرة المنورة ذات الهمايونية الشاهانه خلد الله ملكه التام موقعاً كاملاً من الاستحسان .. والحق ان مندرجاتها الحاوية حقايق الاسلامية الناشرة لفلسفة العلوم الدينية الكاشفة لبدايع واسرار الاحكام الالهية تستوجب غاية التمجيد والتحسين وتستحق

انواع الترخيب والمرحى .. ونرجائنا الوثيق بميامن الاهتمامات ومحاسن التنبيهات والايقاظات من هذه المجلة الفريدة ان ترغب عموم الملل المتنوعة الى الاقتدآء والاهتداء بالدين المبين الاسلامي عسى ان يستيقظ العالم البشرى من بركات الحكم الدينيه والآثار الاسلاميه +

ولاجل زيادة الاستفادة من كتابكم المستطاب (الهيئة والاسلام) و اشاعة ما فيه من لطايف التطبيقات واستنباطكم مسائل الهيئة الجديدة والكشفيات الاروپاوية من الاخبار الاسلامية اهدى ثمن ١٠٠ نسخة من الحضرة المقدسية الملوكية ادام ارباب البريه .. بواسطة جناب المستطاب قطب الشريعه عمدة العلماء آقا حاج ملا باشى دامت بركاته وارسل الى خدمتكم العالية السعيدة كى توزعوا مئة نسخة من الكتاب المزبور بين اهل العلم حتى تعم وتنتشر فيوضاتكم ومباديكم الساميه +

ونأمل مزيد التأييدات الالهية لجنابك المستطاب ونسئل من الله تعالى نجاح مقاصدكم العاليه +

من سامى مقام الحضرة الشاهانيه
جلالة السلطان احمد شاه القاجار
ايد الله سلطانه وايد اعوانه

الوزير الاعظم للدربار
(المابين) الهمايونى
(موثق الدوله)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اہتمام اعلیحضرت پادشاہ جمجاہ ایران

بترویج معارف و دین اسلام

یا

تمجید کتاب مستطاب (الہیئة والاسلام)

وامر بنشر آن بین علماء اعظام

وزارت دربار اعظم
نمرہ (۴۹۰۷)

خروج از کابینہ وزارت دربار اعظم
۲۸ میزان ۲۷ شہر شوال سنہ ۱۳۲۹ھ

جناب مستطاب ملاذ الاسلام سید العلماء الاعلام آقاے السید (ہبة الدین) الشہرستانی
مؤلف محترم مجلہ شریفہ (العلم) دامت افاضاتہ ۔

کتاب مستطاب (الهیئة و الاسلام) و مجلۂ شریفہ (العلم) بحضور باہر النور همایونی خلد الله ملکه رسیده موقع کمال استحسان پذیرفت ۔ الحق مندرجات آنها که حاوی حقایق اسلامیه و ناشر فلسفه علوم دینیه و کاشف بدایع و اسرار احکام الهیه بود مستوجب نهایت تمجید و تحسین و شایان انواع ترحیب و آفرین است +

رجاے واثق آنکه میامن اهتمامات و محاسن تنبیهات و تیقظات این مجله فریده عموم ملل متنوعه را به پیروی وگرویدن دین مبین اسلام ترغیب بلکه عالم البشریت را از حکم و آثار اسلامیت آگاه سازد و براے مزید استفادات از کتاب مستطاب (الهیئة و الاسلام) و اشاعه لطایف تطابقیکه اخبار اسلامیه را با علم هیئت جدیده اروپا ۔ از این کتاب حاصل است ۔ وجه یکصد نسخه از طرف قرین الشرف ملوکانه خلد الله سلطانه اهداء شده و بتوسط جناب مستطاب شریعتمدار عمدة العلماء آقاے حاجی ملا باشی دامت برکاته خدمت باسعادت عالی ایصال میشود ۔ که یکصد نسخه از کتاب مزبور را منتشر و فیما بین محصلین توزیع فرماید ۔ که تا یک درجه این فیوضات سامیه را تعمیم حاصل کردد +

مزید تائیدات الهیه را در پیش رفت مقاصد عالیه آنجناب مستطاب از حق تعالی سائل و نیاز مندم +

از طرف قرین الشرف اعلیحضرت همایونی
السلطان احمد شاه قاجار خلد الله سلطانه

وزیر اعظم دربار همایونی
موثق الدوله

ترجمۂ اردو

ترویج معارف و دین اسلام میں اعلیٰحضرت شاہ جمجاہ ایران خلد اللہ ملکہ کا اہتمام

یا

کتاب مستطاب الہیئۃ والاسلام کی تعریف و تمجید اور علمائے اعلام میں اس کی اشاعت کا حکم

وزارت عظمےٰ
نمبر ۳۹۰۷

دفتر وزارت عظمےٰ
۲۸ میزان مطابق ۲۷ شوال ۱۳۲۹ھ

بخدمت جناب مستطاب ملاذ الاسلام سید العلماء الاعلام آقائے سید ہبۃ الدین شہرستانی اڈیٹر رسالہ "العلم" دامت برکاتہ +

کتاب مستطاب "الہیئۃ والاسلام" اور رسالہ شریفہ "العلم" اعلےٰ حضرت ہمایوں خلد اللہ ملکہ کے شرف حضور سے مشرف ہو کر خلعت قبولیت و پسندیدگی سے ممتاز ہوئے۔ بلا اشتباہ ان کے مضامین عالیہ (جو حقایق اسلامیہ پر حادی اور احکام اسلامیہ کے اسرار غریبہ کے کاشف اور فلسفہ علوم دینیہ کو ظاہر کرنے والے ہیں) مستوجب تمجید و تحسین و مستحق صد آفرین ہیں +

امید قوی ہے کہ اس رسالہ شریفہ کی ہدایات و تنبیہات و اہتمامات کی برکتیں تمام مذاہب مختلفہ دنیا کو دین اسلام کی پیروی اور اعتقاد کی ترغیب دینگی۔ بلکہ تمام بنی نوع انسان کو حکم و آثار اسلامیت سے آگاہ کر دینگی۔ کتاب مستطاب الہیئۃ والاسلام سے زیادہ مستفید ہونے اور احادیث و اخبار نبویہ کی ہیئت جدیدہ کے ساتھ اس عجیب و لطیف مطابقت کی اشاعت کی غرض سے اعلےٰ حضرت شاہنشاہ خلد اللہ سلطانہ کی طرف سے ایک سو جلد کی قیمت کا ہدیہ جناب مستطاب شریعت مدار عمدۃ العلماء آقا حاجی ملا باشی دامت برکاتہ کی معرفت ارسال خدمت ہے۔ تاکہ آپ کتاب موصوف کی ایک سو جلدیں طالبعلموں میں تقسیم فرمائیں۔ جس سے آپ کے ان فیوضات عالیہ کو فی الجملہ عمومیت حاصل ہو +

حصول مقاصد و مطالب آنجناب کے لئے مزید تائیدات و توفیقات خداوندی کا حق تعالےٰ سے طالب و مستدعی ہوں +

از طرف قرین الشرف اعلےٰ حضرت ہمایوں
سلطان احمد شاہ قاچار خلد اللہ سلطانہ

وزیر اعظم دربار ہمایوں
موثق الدولہ

فہرست کتاب البلد التمام اردو ترجمہ

الہیئۃ والاسلام

حصّہ اوّل

فہرست

حصۂ دوم

به

طریقۃ الصلوٰۃ

یعنی

فرقہ شیعہ اثنا عشری کی نماز کا رسالہ

اس رسالے کا نام ہی اس کے مضمون پر دلالت کرتا ہے۔ یہ ایک نہایت مختصر مگر جامع رسالہ ہے۔ جس میں نماز کے مسائل اس ترکیب سے بیان کئے گئے ہیں۔ کہ ہر ایک اردو خواں شخص نماز ہائے مندرجہ کے طریق کو آسانی سے سمجھ کر یاد کر سکتا ہے۔ اس رسالے میں بڑی خوبی یہ ہے۔ کہ جن مسائل کی عموماً نمازی کو ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اور بڑی بڑی کتابوں نہایت تلاش سے دستیاب ہوا کرتے ہیں۔ اس میں نہایت آسان اور سہل طریق سے بیان کئے گئے ہیں۔ مرد اور عورت کی نماز کے فرق کو بھی بہت خوبی سے بتایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ہر قسم کی واجبی نماز اور سنتی نمازوں میں سے مشہور مشہور نمازوں کا طریقہ بیان کیا گیا ہے۔ اور روزانہ نماز کا ترجمہ بھی ساتھ ساتھ مذکور ہے۔ الغرض یہ کہنا بیجا نہیں۔ کہ اتنا مختصر اور جامع رسالہ نماز آج تک نظر سے نہیں گزرا۔ ہر مومن کے پاس اس کا ہونا ضروریات سے ہے۔ لکھائی چھپائی نہایت نفیس۔ تقطیع نہایت مناسب ۲۲×۲۹۔ حجم ۸۴ صفحہ قیمت ۲ر بلا محصول۔

مختصر فہرست مضامین کتاب طریقۃ الصلوٰۃ

ترجمۂ کتاب

الہیئۃ والاسلام

حصۂ اوّل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَعَلَیۡہِ نَتَوَکَّلُ وَبِہٖ نَسۡتَعِیۡنُ

الحمد للہ والحمد حقہ کما یستحقہ ہو نعم المولے ونعم المعین والصّلوٰۃ علی محمّد وآلہ المیامین الذین بہما خصر عودا لاسلام والدین وقام بہم اس الشرع المتین +

امابعد یہ رسالہ ترجمہ ہے اُس رسالہ کا جسے فاضل محترم عالم عالی ہمم ذی الباع الطویل والمجد الاصیل جامع الفضائل والمناقب والمفاخر حائز الشرف کابراعن کابر السید الصالح الولی ہبۃ الدین السید محمد علی الشہرستانی دام مجدہ العالی نے اپنی جدید تحقیق اور نفیس تدقیق کے مطابق عربی زبان میں تصنیف فرمایا ہے +

جس زمانہ میں اس نیازمند کا ورود مشہد مقدس حسینی یعنی کربلائے معلّٰی میں بغرض زیارت ہوا۔ یہ رسالہ نظر سے گزرا۔ ازبسکہ اس کے مطالب کو نہایت اہم اور عوام اخوان کے لئے بہت مفید پایا۔ اس وجہ سے ہمّت نے تقاضا کیا۔ کہ اپنے اخوان ہندئیں کے لئے اس کو اردو میں ترجمہ کردوں۔ تاکہ ہر شخص آسانی سے ان مطالب عالیہ سے فائدہ اُٹھاسکے +

اس رسالہ میں اُن آیات واحادیث سے بحث کی گئی ہے۔ جو آج تک بسبب عدم اطلاع حقیقت کے معرض تاویل میں تھے۔ مگر جدید تحقیقات نے ثابت کردیا۔ کہ ہرگز یہ آیات واحادیث تاویل نہیں چاہتے۔ بلکہ اپنے مطلب کے سمجھانے میں صریح ہیں۔ البتہ وہ لوگ جو فلسفہ قدیم اور علم ہیئۃ یونانین

کی پرستش کرنے والے تھے۔ اپنی ناواقفیت کی وجہ سے ان آیتوں اور حدیثوں کے اُلٹے سیدھے معنی لگایا کرتے تھے۔ اب کہ پردہ کھُل گیا ہے۔ اور حقیقت حال روشن ہوگئی ہے۔ کوئی وجہ نہیں۔ کہ اُن کلمات قدسیہ میں بیجا تصرف کیا جائے۔ اور تحقیق حق کا خون کر کے قعر جہالت میں اپنے تئیں ڈالا جائے +

فی الواقع کہ اس رسالہ کے مصنف نے اپنی اس نفیس ولطیف اور دقیق وشریف تصنیف سے اہل اسلام وایمان پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اور وہ اعجاز جو طے آیات واحادیث میں مخفی تھا۔ اُسے نہایت عمدہ طور پر ظاہر کر کے ابراز حق کی داد دی ہے۔ کیونکہ وہ مطالب عالیہ علمیہ اور وہ اسرار مخفیہ جنہیں قرآن مجید نے اپنی آیتوں میں اور ائمہ معصومین علیہم السلام نے اپنی حدیثوں میں ارشاد فرمایا تھا۔ اور جو ہرگز بغیر مدد آلات وفراہمی اسباب کے عامہ ناس کو معلوم نہ ہو سکتے تھے۔ اُنھیں اخبار عن الغیب کے طور پر جو یقینی معجزہ ہے۔ بغیر مدد آلات رصدیہ کے بیان فرمایا۔ مگر چونکہ لوگوں کے پاس وہ ذرائع موجود نہ تھے۔ جن سے اُن مطالب کی یقینی طور پر تصدیق کر سکتے۔ اس وجہ سے اُن کلمات قدسیہ کے سمجھنے سے عاجز تھے۔ اور جب کہ واقعیت کو نہ معلوم کر سکتے۔ تو اپنے فہم کے مطابق تاویلیں کر دیا کرتے تھے۔ اس جدید زمانہ میں جب کہ علوم نے ایک حد تک ترقی کی۔ اور تحقیق حقیقت کے بہت سے سامان واسباب وآلات مہیا ہو گئے۔ اُن کے استعمال سے معلوم ہوا کہ جو کچھ قرآن وحدیث کا ارشاد ہے۔ اُس کے واقعی معنی یہ ہیں۔ جو اس نئی تحقیق نے ثابت کیا ہے۔ نہ وہ جسے قدما سمجھا کرتے تھے جس سے صدرجہ کا کمال روحانی اور شروق نفس ائمہ طاہرین علیہم السلام کا بھی ثابت ہوتا ہے۔ کہ ان بزرگواروں نے اُن باتوں کو جنہیں زمانے نے بہزار دقت وہزار مشقت بارہ تیرہ سو برس بعد کتنے آلات واسباب کی مدد سے اور کتنے صرف کثیر کے بعد ظاہر کیا ہے۔ بغیر استعمال آلات وادوات کے محض اپنی قوت ربانیہ اور الہامات الہیہ سے سرسری طور پر اپنے اصحاب کے جلسوں میں اس لطف سے بیان کر دیا ہے۔ جس سے بالاتر ممکن نہیں۔ اگرچہ بلحاظ کلموا الناس علے قدر عقولھم اجمال سے بھی کام لیا ہے۔ مگر اُس وقت بھی وہ جانتے تھے۔ کہ روزے از روزہا یہ پردہ ضرور کھُل جائیگا۔ اور حقیقت واضح ہو جائیگی۔ اُس وقت لوگوں کو تصدیق ہوگی۔ کہ ہادیان برحق نے کیسی متیقن باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ اور اُن کا وہبی علم کس درجہ پر تھا۔ مگر ناظرین پر اس قدر ضرور واضح رہے۔ کہ مترجم رسالہ ہر مطلب کا ذمہ وار نہیں ہے۔ بلکہ بعض بعض امور میں اس رسالہ کے اختلاف رائے رکھتا ہے۔ اور بعض استدلال بھی

نظر و بحث سے خالی نہیں ہیں۔ لیکن مقام ترجمہ میں ہونے کی وجہ سے اُن مباحث سے قطع نظر کی گئی ہے۔ اور نیز اس وجہ سے کہ اُن انظار کے سبب اصول مہمہ رسالہ میں کوئی خلل نہیں پڑتا تھا۔ لہذا امید ہے کہ ناظرین رسالہ مترجم کو متہم نہ فرمائیں۔ والسلام ✦

اس کتاب کی تصنیف سے جو غرضیں مصنف ادام اللہ بقائہ کے مدنظر ہیں۔ وہ اُن کے اِن بیان ذیل سے معلوم ہوتی ہیں۔ اور یہیں سے ترجمۂ کتاب بھی شروع ہوتا ہے ✦

پہلی غرض (اِس کتاب کی تصنیف سے)

یہ ہے کہ جو لوگ علوم جدیدہ کو حاصل کرتے ہیں۔ اُن کے عقائد میں خلل نہ پڑنے پائے۔ خصوصاً جدید علم ہیئت کہ جو عجیب و غریب انکشافات پر مشتمل ہے اور قدماء فلسفین اور حکماء سابقین کی رائے سے بالکل مخالف ہے اس میں مشغول ہونے والوں کے اعتقادات محفوظ رہیں۔ کیونکہ لوگ خیال کرتے تھے۔ کہ شارع (خدا و رسولؐ و ائمہ طاہرین علیہم السلام) نے فلکیات (علم ہیئت) کے بیان میں وہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ جو حکماء سابقین کا تھا۔ اور یہ کہ شریعت مقدسہ علم ہیئت قدیم کے مطابق ہے اسی وجہ سے اب جو دلائل سے فلسفۂ قدیم کی غلطی ثابت ہوتی جاتی ہے۔ تو مسلمانوں کے قدم لغزش میں پڑتے جاتے ہیں۔ اور بیانات لسان شریعت کے ماننے میں ضعف پیدا ہوتا جاتا ہے۔ اس لئے میں نے چاہا کہ اس تصنیف کے ذریعے سے ثابت کردوں۔ کہ اسلامی شریعت بطلیموسی ہیئت کے بالکل مخالف اور جدید علم ہیئت کے مطابق ہے۔ لہذا چاہئے۔ کہ جو لوگ علوم جدیدہ کے معتقد ہیں۔ اُن کے عقائد مذہبی بھی مستحکم ہو جائیں۔ اور جناب رسالت مآبؐ اور ائمہ طاہرینؑ کے باقی ارشادات کی دل سے تصدیق کریں۔ (کہ جو کچھ ان بزرگواروں نے فرمایا ہے۔ حق و صدق ہے۔ اور اگر بعض بیانات اس وقت سمجھ میں نہیں آتے۔ تو جس طرح ان ارشادات کا ثبوت اتنے دنوں بعد نئی تحقیقات سے ہو گیا ہے۔ اُسی طرح اُن بیانات کا بھی حق ہونا آئندہ کسی وقت ضرور ثابت ہو جائیگا) ✦

دوسری غرض (اِس کتاب کی تصنیف سے)

یہ ہے کہ جو لوگ ہمارے مذہب کے مخالف ہیں۔ اور مسلمانوں پر جناب رسالت مآب صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی متابعت کی وجہ سے الزام لگاتے ہیں۔ اُن پر حجت تمام کردوں۔

(اور ثابت کر دوں۔ کہ مسلمانوں کا رسولِ خدا کو سچا رسول جاننا بلا وجہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ البتہ غیب کی خبر دیتے تھے۔ جو یقیناً معجزہ ہے۔ اس وجہ سے اہلِ اسلام اُن کی تبعیت کو عقلاً واجب و لازم سمجھتے ہیں)۔ کیونکہ میں نے اس کتاب میں جس قدر جناب رسول خداؐ اور اُن کے حُفّاظِ شریعت واوصیائے برحق کے بیانات کو لکھا ہے۔ وہ سب اخبار بالغیب ہیں۔ اور بے شبہ وشک ایک منصف آدمی کے لئے حجت کاملہ ہیں۔ اس لئے کہ جو بزرگوار قطعی طور پر اُن چیزوں کو بیان کرے۔ جن کا وجود عقلاً ضروری نہیں ہے۔ اور نہ وہ حس سے محسوس ہو سکتی ہیں (مگر وہ فی الواقع موجود ہیں)۔ وہ بالضرور خدا کا ولی ہے۔ اور تمام عالم کے اسرار کا جاننے والا ہے۔ اور ایسا شخص اگر کسی امر کا دعوےٰ کرے۔ تو ہرگز وہ جھوٹا نہیں سمجھا جا سکتا چنانچہ ہم اس مطلب کو تیسرے اور چوتھے مقدمے میں بیان کرینگے۔

(رہی یہ بات کہ) جدید تحقیقات اور اس زمانے کے فلاسفروں کی رائیں ایسی ہی ہیں۔ کہ جن کا وجود عقلاً لازم نہیں ہے۔ اور نہ بغیر آلات و اسباب کاملہ کے محسوس ہو سکتی ہیں۔ اس میں ہرگز کسی کو شک نہیں ہو سکتا (مثلاً ستاروں میں آبادی کا ہونا۔ اور ہر ستارے کا بجائے خود ایک زمین ہونا جن کے لئے علیحدہ علیحدہ آسمان اور آفتاب و ماہتاب وغیرہ ہیں۔ یا بعض جدید ستاروں کا ثابت ہونا۔ ہرگز بغیر آلات و دوربینوں کے نہ محسوس ہو سکتا تھا۔ نہ اب محسوس ہو سکتا ہے۔ پس ایسی چیزوں کا بغیر دوربینوں کے استعمال کئے ہوئے بتا دینا جو اب ہزاروں دوربینوں کے استعمال سے معلوم ہوئے ہیں۔ ضرور اخبار بالغیب اور معجزہ ہے۔ جس سے ہمارے رسولؐ کی رسالت اور ائمہ طاہرینؑ کی حقیقت و امامت ثابت ہوتی ہے)۔ اور ظاہر ہے۔ کہ یہ آلات و وسائط (جن سے ان امور کی تحقیق ہوتی ہے۔ رسول اللہؐ یا اُن کے خلفائے برحق کے وقت میں نہ تھے)۔ بلکہ ایک ہزار ہجری کے بعد ان کی ایجاد ہوئی ہے۔ جن کے موجدین کو اور نیز ایجاد کے زمانے کو اور جہاں وہ آلات ایجاد ہوئے ہیں اُن مقامات کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ صدر اسلام میں تو ان کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ بلکہ عربوں کے دماغوں میں وہی پرانے جاہلیت کے خرافات خیالات ابتدائے اسلام سے دوسو برس تک رہے۔ یہاں تک کہ سلاطین عباسیہ نے فارس و یونان کی کتابوں کا ترجمہ کرایا۔ جسے مسلمان وغیر مسلمان سب ہی جانتے ہیں۔ جیساکہ امریکہ کے محقق فلاسفر فاندیک نے تصریح کی ہے۔ پس جو کچھ میں نے اس کتاب میں اپنے رسولؐ کے اقوال کو بیان کیا ہے۔ وہ بہترین معجزات ہیں۔ اور اسلام کے برحق ہونے کی سچی نشانیاں ہیں۔ جن کے مثل کسی اور مذہب میں (سوائے اسلام کے) کسی منصف مزاج شخص کو نہیں مل سکتے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی

مذہب کا خبر دینا غیبی امور سے اُس مذہب کی سچائی کی پوری دلیل ہے +

تیسری غرض

بعض مشککین اور زندیقوں کے اُس شبہ کا بھی دفع کرنا ہے۔ جو یہ کہتے ہیں۔ کہ بانی دین اسلام نے (کچھ اپنی طرف سے نئی باتیں نہیں کہیں۔ بلکہ) اگلے فلاسفروں کے اقوال و خیالات کا ترجمہ کر کے بیان کیا کرتے تھے +

مَیں نے اِس تصنیف سے یہ غرض رکھی ہے۔ کہ ظاہر کردوں۔ کہ اِس شریعت (اسلامیہ) کے اقوال اگلے فلاسفروں کی رائے سے بالکل مخالف ہیں۔ اور (اگر) موافق ہیں (تو) متاخرین کی تحقیقات جدیدہ سے (تو بھلا کوئی عاقل درصورت اختلاف کیسے کہ سکتا ہے۔ کہ بانی اسلام گذشتہ فلسفیوں کی رائے کے مترجم تھے)۔ اور اس طرح موافق ہیں۔ کہ اگر یہ متاخرین اپنے دعووں کے ثبوت میں آلات رصدیہ وغیرہ سے مدد نہ لیتے۔ تو کہا جاسکتا۔ کہ یہ تمام باتیں ان لوگوں نے شریعت اسلام ہی سے لی ہیں +

ہاں ایسا ضرور ہوا ہے۔ کہ صدر اسلام میں مسلمان فلسفیوں نے آیات و روایات کی تاویلیں اُنہیں معانی کے موافق کی ہیں۔ جو قدماء فلاسفہ کی رائے کے موافق تھے۔ اس وجہ سے کم فہم لوگوں پر یہ امر مشتبہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ ناواقف لوگوں نے سمجھ لیا۔ کہ یہ ترجمہ ہے قدماء کے خیالات کا۔ ورنہ جو شخص بانی اسلام علیہ السلام کے ظواہر کلمات سے اپنے مطلب کو استنباط کرتا ہے۔ وہ خوب سمجھ سکتا ہے۔ کہ فلسفہ قدیم اور بیان شریعت میں بہت بڑا فرق ہے۔ اور کتنی ہی ایسی باتیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ نے فرمائی ہیں۔ جن کی ہوا تک بھی اگلوں کو نہیں لگی۔ (اور نہ قدماء فلاسفہ کے ذہن میں کبھی وہ باتیں آئیں۔) اور کس قدر حضرت ؐ نے فلسفیوں کی متابعت سے منع فرمایا۔ اُن کے علم کو ذلیل بنایا۔ اور اُن کے عقائد کو سست ظاہر فرمایا۔ (پس کیونکر کوئی جرأت کرسکتا ہے اس بات کے کہنے کی۔ کہ آنحضرت ؐ نے متابعت فلسفیوں کی فرمائی ہے) +

چوتھی غرض

یہ بھی ہے۔ کہ میری اس تصنیف سے اکثر مشکل آیات و احادیث کی تفسیر واضح ہو جائے۔ جنہیں علمائے قدیم متشابہات فرماتے تھے۔ کیونکہ ظاہر مضمون اُن آیات و احادیث کا اُن کے

مقبولہ فلسفہ کے مخالف تھا۔ اس وجہ سے خواہ مخواہ ان آیات کی توضیح و شرح میں خاک بیزی کی۔ اور دور از کار تاویلوں سے بایں وجہ کام لیا۔ کیونکہ ان علوم جدیدہ کی اُنہیں ہوا بھی نہ لگی تھی۔ اور نئی تحقیقات کی بُو بھی نہ سونگھی تھی۔

پس اس کتاب کی تصنیف سے اُن مشکل آیات و احادیث کا حل کر دینا مقصود ہے۔ تاکہ راز اصلی واضح ہو جائے۔ شبہات دفع ہوں۔ اس شریعت کی صفائی ظاہر ہو جائے۔ صبح حق تجلی ہو۔ اور ظلمت باطل دفع ہو۔ اور عزت خدا و رسولؐ و مومنین ہی کے لئے رہے۔ (جیساکہ واقع میں بھی ہے)۔

تتمۂ دیباچہ

میرا گمان غالب یہ ہے۔ کہ صدر اسلام میں جو اختلافات پیدا ہوئے۔ جن کی وجہ سے دین اسلام میں تفرقہ پڑ گیا۔ اور بیشمار مذہب نکل آئے۔ اس کے چند اسباب ہیں۔ سب سے بڑا سبب یہ ہے۔ کہ مسلمانوں میں گذشتہ فلسفیوں کے خیالات پھیل گئے تھے۔ اور ان کو اُن کے مسائل و اصول پر پورا بھروسہ تھا (کہ جو کچھ فلاسفہ قدیم نے بیان کیا ہے وہی حق ہے)۔ خود سے کوئی تحقیق نہیں کی۔ اور جب دیکھا۔ کہ اسلامی اصول اور اُس کے مطالب ظاہرا فلسفیوں کے بیانات کے خلاف ہیں۔ اور اعتقاد ان کے بیانوں پر ہو ہی چکا تھا۔ اس سبب سے چاروں طرف بھٹکنے لگے۔ کسی نے تو صاف صاف اصول شریعت کا انکار کر دیا۔ (اور کہدیا۔ کہ ازبسکہ یہ مطالب فلسفہ قدیم کے مخالف ہیں۔ لہذا غلط ہیں۔ اور یہ نہ سمجھے۔ کہ دراصل جو کچھ زبان شرع نے بیان کر دیا ہے۔ وہی صحیح ہے۔ فلسفیوں ہی کے خیالات غلط و باطل ہیں)۔ اور کوئی اُن اقوال کی تاویلیں کرنے لگا۔ کہ کسی طرح کھینچ تان کر اُن کو فلسفۂ قدیم کے مطابق ثابت کر دے۔ اور کچھ بیچارے ایسے بھی تھے۔ جنہوں نے یہ ٹھان لی۔ کہ چاہے فلسفہ قدیم بیان شریعت کے مطابق ہو یا مخالف۔ مگر ہے وہی صحیح۔ جو بانی شرع نے بیان کیا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اُن کلمات قدسیہ کی حفاظت کرتے رہے۔ جو آج ہمارے لئے مایۂ فخر و ناز ہوا۔

بعض ایسے بھی ہو گذرے ہیں۔ جنہوں نے علانیہ طور پر شریعت کی مخالفت نہیں کی۔ خواہ یہ بات کسی کے خوف سے رہی ہو۔ یا طمع سے۔ مگر بنام زیب لباس میں ہو کر دین میں طرح طرح کے

مفاسد و بدعات پھیلاوئینگے۔ کیونکہ شریعت کے بیانات پر اُن کو کچھ اعتقاد ہُوا نہیں۔ لہذا وہ شرع کو مہمل سمجھے۔ اور قدیم فلسفہ کی حمایت میں در پردہ مفاسد ایجاد کرتے +

اور میں سچ کہتا ہوں۔ کہ جو کچھ اُس قدیم فلسفہ کا اثر مسلمانوں پر پڑا تھا جس سے ہزاروں قسم کی خرابیاں پیدا ہوئیں۔ دین اسلام میں تفرقے پڑ گئے۔ وہی نتیجہ اس فلسفۂ جدید کا بھی ہونیوالا ہے۔ کیونکہ یہ بھی ابھی اُسی طرح ناقص ہے۔ جس طرح فلسفہ قدیم ناقص تھا۔ اور اس زمانے کے لوگ بھی اُسی دل ودماغ کے ہیں۔ جس دل ودماغ کے وہ لوگ تھے۔ البتہ اگر محققین مذہب اس خرابی کی کچھ اصلاح کرنا چاہیں۔ اور فلسفۂ جدیدہ کے مفاسد کے دفع کی کوشش کریں۔ اور عقائد حقہ شریعت کی ترویج میں سعی بلیغ کریں۔ تو ممکن ہے۔ کہ اس خرابی میں کچھ کمی ہو +

میرا مقصود یہ نہیں ہے۔ کہ ہر شخص اس فلسفہ جدیدہ کی بلا میں جو اُس کے نقصان کی وجہ سے مبتلا ہو جائیگا۔ بلکہ وہی لوگ مبتلا ہونگے جن کے نفوس کمزور عقلیں قاصر اور قلوب متزلزل ہیں۔ ورنہ جو لوگ متمسک بحبل اللہ والرسولؐ ہیں۔ اور جنہوں نے حدیث و قرآن پر عمل کرنے کو لازم سمجھ لیا ہے۔ خصوصًا وہ لوگ جو تمام علوم کو اچھی طرح پرکھ چکے ہیں۔ اُن پر اس کا اثر نہیں پڑیگا۔ بلکہ اس فلسفہ جدیدہ کی وجہ سے اُن کے ایمان میں اور زیادتی ہوتی جائیگی۔ اور یقین زیادہ ہوگا +

مَیں خدائے تعالےٰ کے فضل عام ولطف تمام سے یہ امید کرتا ہوں۔ کہ وہ میری اِس کتاب سے عامہ مسلمین کو فائدہ پہنچائے۔ بلکہ عمومًا ہر اُس شخص کو جو اسے مطالعہ کرے۔ اور اس کے مطالب میں غور کرے۔ اور امید کرتا ہوں۔ کہ خدائے تعالےٰ بروز قیامت میری مغفرت فرمائے +

اب مقصود یہ ہے۔ کہ اصل مطلب سے پہلے چھ ایسے مقدمے بیان کردوں۔ جو آئندہ تحقیق دلائل کے موقع پر فائدہ مند ثابت ہوں +

پہلا مقدمہ

اُن کتابوں کے بیان میں جن سے اس کتاب کے مطالب لئے گئے ہیں۔ اور از بسکہ اُن کتابوں کی سندوں کا صحیح ثابت کردینا نہایت ضروری امر تھا۔ اس وجہ سے مجھ کو اچھا معلوم ہُوا۔ کہ ایک بیان مفصل اس کے متعلق لکھوں۔ (ضروری ہونے کی وجہ یہ ہے۔ کہ مجھ سے بعض

مقدسین نے بیان کیا۔ کہ ایک غیر مسلم آدمی نے کوئی ایسی حدیث سُنی۔ جس سے اس زمانے کی جدید تحقیقات کا کوئی مسئلہ معلوم ہوتا تھا۔ تو اُسے بہت تعجب ہُوا اور کہنے لگا۔ "اگر مجھ کو یقین ہو جائے۔ کہ یہ کلام بانی اسلام یا اُن کے کسی وصی کا ہے۔ تو میں حضرتؐ کی شریعت پر ایمان لاؤں۔ اور اُن کی تصدیق کروں"+

فی الحقیقت کسی شخص کے کلام پر مطلع ہونے کے چند طریقے ہیں۔ جن میں سب سے بہتر طریقہ یہ ہے۔ کہ خود اُس کے بیان کرنے والے کی زبان سے سُنا جائے۔ مگر یہ بات اُسی وقت ہو سکتی ہے۔ جب کہ اُس کی ملاقات بھی حاصل ہو۔ اُس سے متاخر زمانے کے لوگوں کے لئے یہ امر ممکن نہیں۔ (دوسرا طریقہ) یہ ہے۔ کہ خود متکلم کا لکھا ہُوا ملے۔ جس کی نسبت اُس شخص کی طرف تواتر یا قرائن قطعیہ سے ثابت ہو۔ (تیسرا طریقہ) یہ ہے۔ کہ کہنے والے کا کلام تواتر کے ذریعے سے نقل ہُوا ہو۔ یعنی اتنے آدمیوں نے اُس کلام کو نقل کیا ہو جن کی نسبت یہ گمان نہ ہو سکے۔ کہ ان سب لوگوں نے جھوٹ بولنے پر اتفاق کر لیا ہوگا۔ (چوتھا طریقہ) یہ ہے۔ کہ کوئی ایسا شخص متکلم کے اُس کلام کو نقل کرے۔ جو قابل اعتماد ہو۔ اور اس میں کچھ فرق نہیں ہے۔ کہ جو کلام کسی کے واسطہ سے نقل ہُوا ہو۔ ایک ہی شخص درمیان میں واسطہ ہو۔ یا کئی شخص ہوں۔ البتہ یہ ضرور ہے۔ کہ جتنے نقل کرنے والے ہوں۔ وہ معتبر ہوں۔ سچے ہوں۔ امین ہوں+

جو کلام ان چار طریقوں سے نقل ہُوا ہوگا۔ وہ ضرور قابل اطمینان ہوگا۔ کہ بیشک یہ اُسی شخص کا کلام ہے۔ جس کی طرف اس کی نسبت دی جاتی ہے۔ (مثلاً رسول خداؐ یا اُن کے کسی وصی کی حدیث کی صحت کا اُسی وقت اطمینان ہو سکتا ہے۔ جبکہ خود اُن بزرگواروں سے سُنا ہو۔ یا اُن کے ہاتھ سے لکھا ہُوا دیکھا ہو۔ یا اُس حدیث کو بہت سے لوگوں نے نقل کیا ہو جن کا متفق علے الکذب ہونا عادۃً محال ہو۔ یا کسی نہایت سچے معتبر با فہم و عقل آدمی نے اپنی کتاب میں اُسے نقل کیا ہو۔ یہی معیار ہر کلام کے صحیح طریقہ اور صحیح طور پر نقل ہونے کا ہے۔ اور انہیں طریقوں پر معاملات و محاکمات و اقعات کا عرفاً اور عقلاً دارومدار ہے۔ اس میں کسی عاقل کو شبہ نہیں۔ اور ان امور مذکورہ پر اعتماد کر کے عمل کرنا کچھ مسلمانوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ (بلکہ دنیا کا بھی عام رواج دیکھئے۔ کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ ایک یا کئی شخصوں کے اقوال کسی کتاب میں محض اس غرض سے جمع کئے جاتے ہیں۔ کہ اُس کا نام باقی رہے جیسے حکمائے کی کتابیں ہیں۔ یا کتب مقدسہ (انجیل و توراۃ) ہیں۔ پس اس مقام میں دو قسم کی نسبتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ مؤلف کتاب نے

ان اقوال کو ان کے قائلین کی طرف مذکورہ سابق چار طریقوں میں سے کسی طریقہ سے نسبت دی ہے۔
پس اگر وہ نسبت ان میں سے کسی طریقہ کے مطابق ثابت ہو جائیگی۔ تو وہ کتاب اس لحاظ سے معتبر
سمجھی جائیگی۔ (اور کوئی اعتراض کسی کو اُس کے ماننے میں نہ ہوگا)۔ دوسرے یہ کہ یہ کتاب فلاں مصنف
کی ہے۔ اور اُس کی طرف منسوب ہے۔ مگر یہ بات اُن پانچ طریقوں سے ثابت ہوتی ہے۔ جو ہم
آئندہ بیان کرینگے۔ اور جو ہر مذہب و ملت کے مؤرخین و عقلا کے درمیان رائج ہیں۔ (کوئی خصوصیت
مسلمانوں کی نہیں ہے۔ بلکہ) عموماً تمام مسلمان اس طرح کے امور میں وہی رفتار رکھتے ہیں۔ جو
عاقلوں کی رفتار ہے۔ (کہ کسی قول یا کسی کتاب کو تب ہی معتبر سمجھتے ہیں۔ جب کہ باقاعدہ اُس کی نسبت
اُس شخص کی طرف ثابت ہو جائے۔ جس کی طرف وہ اقوال و کلمات منسوب ہیں)۔ بلکہ بہ نسبت اوروں
کے مسلمان اس بارے میں زیادہ سخت ہیں۔ (اور جانچ پرکھ بہت کرتے ہیں۔ جب تک پورے
طور پر ثابت نہیں ہو جاتا۔ کہ یہ قول رسول یا امام کا ہے۔ تب تک اُسے تسلیم نہیں کرتے)۔ اور
اگر تمہیں اعتبار نہ ہو۔ تو تمام دنیا کے مذاہب متمدنہ اور مورخین سے دریافت کرو۔ کہ کسی کے
کلام کو معتبر طور پر نقل کرنے کا یا اُس کی نقل کی صحت معلوم کرنے کا کیا طریقہ ہے۔ اگر وہ کہیں۔ کہ
جو طریقے مسلمانوں نے اپنے ہادیان برحق کے اقوال و احادیث کے جانچنے کے مقرر کئے
ہیں۔ اُس کے علاوہ ہمارے پاس موجود ہیں۔ تو میں ذمہ کرتا ہوں۔ کہ انشاء اللہ ویسے ہی طریقے
یا اُس سے بھی اکمل طریقہ ثابت کر دونگا جس کے مطابق ہمارے علماء کے اقوال یا ہمارے
ادیان دین کے کلمات و احادیث نقل کئے جاتے ہیں۔ اور اگر باوجود اس اہتمام کے بھی
آپ نہ مانیں۔ (اور کہیں کہ یہ کلام تو رسول یا امام کا نہیں ہے)۔ تو چاہئیے۔ کہ آئندہ آپ کسی
مؤرخ یا کسی عالم کے کلام کو تسلیم نہ کریں۔ البتہ تعصب کا کوئی جواب نہیں ہے۔

(تنبیہ) اسلامی شریعت کے وہ قابل اعتماد اقوال جنہیں ہم نے اس کتاب
میں نقل کیا ہے۔ چار طرح کے ہیں:۔

(۱) خدائے تعالےٰ کا کلام جو بذریعہ وحی کے جناب رسالتمآب صلعم پر نازل ہوا۔
اور وہ سب مجموعی حیثیت سے اُس مقدس کتاب میں درج ہے۔ جسے مسلمان قرآن کہتے
ہیں۔ اور اس کتاب کا مقدس ہونا مسلمانوں کے نزدیک اُس سے زیادہ ہے۔ جتنا عیسائیوں
اور یہودیوں کے نزدیک انجیل و توریت کا۔ اور اُس کا جناب رسالتمآب صلعم کی زبان سے
منقول ہونا اظہر من الشمس ہے۔ (کسی عاقل کو اس میں شبہ نہیں۔ کہ یہ قرآن بذریعہ وحی

رسول پر نازل ہوا۔ اور حضرتؐ نے اُسے اپنی زبان مبارک سے لوگوں کو سنایا) +

(۲) جناب رسالت مآبؐ (محمدؐ) کے اقوال جن میں سے بہت بڑا حصہ تو علماء اسلام کی کتابوں میں مندرج ہے۔ جو اُن تک طریق مذکورہ بالا میں سے کسی طریقہ سے پہنچا ہے۔ رہیں یہ خود کتابیں تو وہ ہم تک اُن طریقوں سے پہنچی ہیں۔ جو آئندہ مذکور ہونگے +

(۳) جناب رسالت مآبؐ کے خلفاء حقہ کے اقوال جن کی وصایت و خلافت و تقدس و ورع پر رسولؐ نے خود نص فرمادی ہے۔ اور وہ ہم شیعوں کے نزدیک بارہ ہیں۔ اول اُن میں سے امیر المومنینؑ ابن عم رسولؐ و اخی رسولؐ زوج بتولؑ علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہیں۔ دوسرے امام حسن علیہ السلام۔ تیسرے امام حسین علیہ السلام ہیں۔ جو امیر المومنین علیؑ کے فرزند اور رسول خداؐ کے نواسے ہیں۔ چوتھے جناب سید سجاد علیؑ بن الحسینؑ ہیں۔ پانچویں اُن کے فرزند امام محمد باقر علیہ السلام ہیں۔ چھٹے جناب امام جعفر صادق علیہ السلام ہیں۔ ساتویں امام موسیٰ کاظم بن جعفر علیہ السلام ہیں۔ آٹھویں امام علی رضاؑ بن موسےٰ کاظم علیہ السلام ہیں۔ نویں امام محمد تقی بن علی الرضا علیہ السلام ہیں۔ دسویں امام علی نقی بن محمد التقی علیہ السلام ہیں۔ گیارھویں امام حسن عسکری بن علی النقی علیہ السلام ہیں۔ بارھویں امام آخر الزماںؑ حجۃ منتظر مہدیؑ موعود بن حسن عسکری علیہ السلام ہیں +

(۴) اُن صحابہ کے اقوال ہیں جنہوں نے یا تو خود رسول خداؐ سے علوم کو حاصل کیا۔ یا اُن کے اوصیاء علیہم السلام سے۔ جیسے ابن عباس۔ ابن مسعود اور ابی ابن کعب وغیرہ۔ ان بزرگوں کا بیان بھی اس قسم کی علمی تحقیقات کے بارے میں اس امر کو ظاہر کرتا ہے۔ کہ یا تو خود رسول خداؐ سے یہ اقوال لئے گئے ہیں۔ یا ائمہ طاہرینؑ سے۔ جو زبان وحی الٰہی تھے۔ کیونکہ اصحاب کے علوم و کمالات کا مرجع وہی بزرگوار تھے۔ جس طرح مثلاً حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے حواریین کا بیان اگر کہیں ملے تو یہی سمجھا جائیگا۔ کہ وہ در اصل حضرت عیسےٰ علیہ السلام ہی کا قول ہے۔ (کیونکہ حواریین جو کچھ کہتے تھے۔ وہ حضرت عیسےٰؑ سے ہی سُنا ہُوا ہوتا تھا) +

یہ آخری تین قسم (حدیث رسولؐ و کلام اوصیاؑ و اقوال اصحاب) کے مقالات جو ہم نے ذکر کئے۔ اِن کا تھوڑا حصہ تو اُن مسلمانوں کی کتابوں میں مذکور ہے۔ جو حافظ قرآن و حدیث تھے۔ اور انہیں طریقوں سے اُس کی حفاظت کرتے تھے۔ جو (کسی شے کی حفاظت میں) بین العقلاء رائج ہے۔ رہیں وہ کتابیں۔ تو وہ بھی معتمد علیہ ہیں۔ اور یہ کتب مذکورہ انہیں حفاظ قرآن و احادیث کی تین یا پانچ طرح سے ثابت ہے۔ (اوّل) تواتر کے ذریعے سے (یعنی عموماً تمام

لوگ جانتے اور بیان کرتے ہیں۔ کہ یہ کتاب مثلاً فلاں مصنف کی ہے۔ ایک طبقے کے عامہ ناس کا جو
بیان ہے۔ وہی اُن سے سابق طبقے کا بیان ہے۔ وہی اُن سے سابق لوگوں کا اظہار ہے۔
کہ ہم نے اپنے سے سابق لوگوں سے یونہی سُنا۔ کہ یہ کتاب (مثلاً اصول کافی) فلاں مصنف (مثلاً
ملا محمد یعقوب کلینی) کی ہے۔ اسی طرح ہر زمانے کے لوگ اُس کتاب کو مصنف مذکور کی طرف نسبت
دیتے آئے۔ یہاں تک۔ خود مصنف کے زمانے کے لوگوں تک اس روایت کا سلسلہ جا ملا +

اِس قسم کے لوگ جن سے بہ تواتر حاصل ہوتا ہے۔ یا ہوتا ہے۔ کبھی تو اُسی قسم کے لوگ ہیں
جیسے خود اُن کتابوں کے مصنف (عالم و حافظ) تھے۔ اور کبھی عام لوگ جیسے مثلاً صحاح ستّہ کی
کی شہرت ہے کہ فلاں مصنف کی ہے۔ مثلاً صحیح بخاری امام محمد بخاری کی تالیف ہے۔ جامع ترمذی حکیم
ترمذی کی ہے۔ اور علے ہذا القیاس دیگر کتابیں)۔ اور جیسے شیعوں کی صحاح اربعہ ہیں کافی۔ استبصار۔
تہذیب اور من لا یحضرہ الفقیہ (کہ ان کی شہرت اور یہ کہ یہ کتابیں فلاں فلاں مصنف کی ہیں اس حد پر پہنچ
گئی ہے۔ کہ کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ پس اگر ہم کوئی حدیث ان کتابوں میں سے کسی ایک سے
نقل کریں۔ تو یقیناً سمجھا جائیگا۔ کہ یہ حدیث وہی ہے۔ جسے ملا یعقوب کلینی یا شیخ صدوق یا شیخ
ابو جعفر طوسی علیہ الرحمہ نے بیان کیا ہے۔ جو حافظ احادیث تھے)۔ اور یقیناً یہ حدیث رسولؐ یا امام
علیہم السلام تک سنداً پہنچی ہوئی ہے)+

(دوم) مؤرخین و لائف نویسوں کی تصریحات سے بھی یہ امر ثابت ہے۔ کہ فلاں کتاب فلاں
مصنف کی ہے۔ یہ وہ طریقہ ہے۔ جس پر ہر قوم و ملت کے علماء و عقلاء عمل کرتے اور اس کے
ذریعے سے اطمینان کر لیتے ہیں۔ کہ فلاں کتاب فلاں مصنف کی ہے۔ (مثلاً اگر ابن خلدون یا ابن
خلکان یا مؤرخ ابن اثیر کسی کتاب کی نسبت لکھ گئے ہیں۔ کہ فلاں کتاب اُس مصنف کی ہے۔ عام طور
پر لوگ اُن کے بیان کو مانتے اور تسلیم کرتے ہیں۔ کسی کو شبہ نہیں ہوتا)+

(سوم) سلسلہ روایت کے ذریعے سے معلوم ہو جائے۔ کہ یہ کتاب فلاں شخص کی ہے۔
مثلاً زید نے عمرو سے وہ کتاب حاصل کی۔ عمرو نے بکر سے۔ بکر نے خالد سے۔ خالد نے محمود سے۔
محمود نے خود مصنف سے۔ درحالیکہ یہ سب لوگ معتمد علیہ اور موثق بھی ہوں۔ اور احتمال افترا
بلا وجہ ان میں نہ ہو+

(چہارم) خود مصنف کے زمانے میں اُس کتاب کا چھپ جانا۔ یا کسی ایسے مطبع مشہور
میں اُس کے نام سے چھپنا جس سے پورا اطمینان ہو جائے۔ کہ بلا وجہ دوسرے مصنف کے

نام سے یہ کتاب طرح نہیں ہوئی۔ بلکہ اُسی مصنف کی ہے۔ جس کا نام اُس میں لکھا گیا ہے۔ کیونکہ بلاوجہ جھوٹی نسبت دے کر کسی کتاب کو چھاپنا مطبعوں کی شان سے بظاہر مستبعد ہے +

(پنجم) قرائن معتبرہ سے ثابت ہو جانا۔ کہ یہ کتاب فلاں مصنف کی ہے۔ مثلاً کسی کتاب کی عبارت کا چند معتبر کتابوں میں نقل ہونا۔ یا اُس کتاب کے مصنف کی یا اُس کتاب کی مدح یا قدح کا معتبر کتابوں میں مندرج ہونا۔ اور مثلاً خود مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتاب کا ملنا۔ یا کسی مقام پر مصنف کے ہاتھ کا حاشیہ وغیرہ ہونا۔ یا علماء کا شہادت دینا۔ یا عموماً مشہور ہونا کہ یہ کتاب فلاں مصنف ہی کی ہے۔ دوسرے کی نہیں ہے۔ یہی وہ طریقے ہیں۔ جن کے ذریعے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ فلاں کتاب اُس مصنف کی ہے)۔ اور یہ طرق جس طرح تمام خلائق کے لوگوں میں رائج ہیں۔ اُسی طرح مسلمانوں میں بھی رائج ہیں۔ کیونکہ ہمیشہ ان میں یہ طریقے مستعمل رہے ہیں۔ بلکہ دیگر اقوام کی نسبت مسلمانوں نے ان باتوں کا زیادہ لحاظ رکھا ہے۔ بلکہ ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں۔ کہ جتنا اہتمام کسی حدیث یا کلام کے نقل کرنے یا کسی کتاب کے کسی مصنف کی طرف منسوب کرنے میں مسلمانوں میں رہا ہے۔ اُتنا کسی اور قوم میں نہیں رہا۔ کیونکہ تعلیم و تدریس و حفظ اخبار و آثار و احادیث کا شوق مسلمانوں کو صدر اسلام سے اب تک سب سے زیادہ رہا ہے۔ بخلاف دیگر مذاہب کے۔ کیونکہ اُن میں بہت سے تغیرات و تفرقے ایسے واقع ہوئے۔ جن کے سبب وہ اپنے آثار و اخبار کو پورے طور پر محفوظ نہیں رکھ سکے۔ (اِلّا بعض ملل مثل ہنود اہل ہند کے)۔ جیسا کہ تواریخ کے اوراق اُلٹنے سے یہ بات بخوبی واضح ہے۔ یہاں تک کہ مشہور ہے۔ کہ یہود وغیرہ کو اپنی کسی کتاب یا قول کی نسبت دعوے تواتر کرنا بالکل غیر صحیح ہے۔ کیونکہ اکثر قتل و غارت اور فتنے ان میں سابق میں ایسے واقع ہوئے ہیں۔ جس سے بعض زمانے بالکل ایسے لوگوں سے خالی گزرے ہیں۔ جن سے تواتر قائم ہو سکے۔ یا مثلاً اہل فرنگستان پر ایک مدت دراز تک جہالت کا غالب رہنا اس امر کو صاف واضح کر رہا ہے۔ کہ اگر یہ لوگ کسی اپنی مذہبی کتاب یا قول کی نسبت دعوے کریں۔ کہ اسی طرح وارد ہے۔ تو قابل سماعت نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایک مدت تک ان میں کوئی ایسا نہیں رہا ہے۔ جو حافظ اُن کتابوں کا ہو سکے۔ یہاں تک کہ سینکڑوں برس بعد مسلمانوں کے ان لوگوں نے تحصیل علوم کی۔ جیسا کہ وہ خود معترف ہیں۔ (بخلاف مسلمانوں کے کہ ہر زمانے میں ان میں عالم و حافظ و مہتمم و مدرس قرآن و احادیث و اخبار کے موجود رہے ہیں۔ اور اب تک بھی موجود ہیں) +

چنانچہ مسٹر ڈاوڈ ویرس امتھ صاحب انگلستانی لکھتے ہیں "کہ جس زمانے میں مسلمان اپنے نور علم سے عالم کو روشن کر رہے تھے۔ تقریباً پانچ قرن تک اہل یورپ خوابِ غفلت میں پڑے سو رہے تھے۔ اور محض جہالت میں مبتلا تھے۔ عرب ہی وہ قوم ہے جس نے آداب و علوم کلام کو لباس شہاب پہنایا۔ اقوال علمائے یونان کا ترجمہ کیا۔ علم زراعت و علم فلکیات کو ترقی دی۔ علم جبر و مقابلہ اور علم کیمیا کے موجد ہوئے۔ اور اپنے شہروں کو کتابوں اور مدرسوں سے اسی طرح زینت دی۔ جس طرح مسجدوں سے۔ اور قرطبہ سے یورپ والوں کو علم فلسفہ کی تعلیم دی۔ (یعنی فلسفہ ابن رشد سے یورپ والوں نے سبق لیا۔ جو قرطبہ کا رہنے والا تھا)" +

میں (مصنف) کہتا ہوں۔ یہ علوم مسلمانوں میں اُس وقت پھیلے جب کہ ایران والوں نے اسلام قبول کیا۔ اور کتابوں کا لکھنا شروع کیا۔ مگر چونکہ اکثر یہ لوگ اپنی کتابیں عربی زبان میں لکھتے تھے (بسبب اس زبان کی وسعت کے) تو انگریزوں نے نسبت ان علوم کی عربوں کی طرف کر دی۔ (ورنہ ناشر علوم فی الحقیقت اہل فرس ہیں)۔ بعض کا خیال ہے۔ کہ اس نسبت کا سبب یہ ہے۔ کہ اہل فرنگ نے ان علوم کو اہل اندلس سے حاصل کیا۔ جو عرب تھے۔ اسی وجہ سے یہ لوگ موجد علوم عربوں کو کہتے ہیں +

مؤرخ درری لکھتے ہیں۔ کہ "اہل یورپ تاریکی جہالت میں حیران پھر رہے تھے۔ انہیں اگر روشنی دکھائی بھی دیتی تھی۔ تو ایسی۔ جیسے سُوئی کے ناکے سے۔ کہ یک بیک ایک بڑا نور ملّت اسلامیہ کی طرف سے روشن ہُوا۔ یعنی مسلمانوں کے علم ادب۔ فلسفہ۔ صناعات اور دستکاریوں نے یورپ میں علمی روشنی پھیلائی۔ کیونکہ مسلمانوں کے ہی بلاد اُس وقت علوم و کمالات کے دائرے تھے۔ اور انہیں سے مختلف قوموں میں علم پھیلا۔ یورپ والوں نے ان ہی کی طفیل سے متوسط زمانے میں جدید تحقیقاتیں اور صناعات و فنون عظیمہ حاصل کئے" +

کتاب مشہد الکائنات کے حاشیہ پر مندرج ہے۔ کہ قاہرہ (مصر) کے مدرسہ میں سنہ ۳۲۵ھ میں فن نجوم کی کتابیں عربوں کی تصنیف کی ہوئی ساڑھے چھ ہزار موجود تھیں" +

(میں کہتا ہوں) اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ ابتدائے اسلام سے اس وقت تک مسلمانوں کو زیادہ اہتمام اپنے مذہبی علوم ہی کے رائج کرنے میں رہا ہے۔ نہ علوم ریاضیہ کے رائج کرنے میں۔ جن کی نسبت ان کے درمیان یہ مشہور ہے۔ کہ علوم ریاضیہ سے سوائے

فقر وافلاس اور فکر وغم کے کچھ حاصل نہیں پس باوجود اس خیال کے جبکہ ان کے ایک کتبخانہ میں ساڑھے چھ ہزار صرف نجوم کی کتابیں ہوں۔ تو ان کے مختلف شہروں کے کتبخانوں اور مدرسوں میں اسلامی مذہبی کتابیں کس قدر ہونگی جن میں ان کے رسولؐ وائمہ طاہرینؑ کے اقوال مندرج رہے ہونگے جن کے متعلق ان کو خاص اہتمام تھا۔ اور رضا وخلق خدا دونو کی خوشنودی انہیں کتابوں کے جمع کرنے اور پڑھنے پڑھانے میں چاہتے تھے +

اس بیان سے معلوم ہوا۔ کہ جو طریقے مسلمانوں کے ہاں ان کے نبی اُمیؐ اور ائمہ طاہرینؑ کے اقوال پر مطلع ہونیکے رائج ہیں۔ وہ تمام دنیا کے لوگوں کے طریقے سے زیادہ واضح اور صحیح ہیں۔ (لہٰذا کسی کو کسی حدیث یا کتاب کے قول کے ماننے میں ہرگز شبہ نہ ہونا چاہئے۔ اور نہ کسی کو یہ گنجائش ہے۔ کہ وہ کہ سکے۔ کہ یہ قول رسولؐ کا نہیں۔ یا تم نے جو فلاں شخص سے نقل کیا ہے۔ اُس کی یہ کتاب یا اُس کا یہ قول نہیں ہے) +

اس مفصل تمہید کے بعد عرض کیا جاتا ہے۔ کہ جن کتابوں کے اقوال یا احادیث ہمارے اس رسالے میں مندرج ہیں۔ اور جن کتابوں سے قدما ومتاخرین کی رائیں لی ہیں۔ اور جن سے اقوال رسولؐ وائمہ کرامؑ نقل کئے ہیں۔ اُن کے نام ذیل میں درج ہیں۔ مگر پہلے یہ کہدوں۔ کہ جن کتابوں سے میں نے اقوال رسولؐ وائمہ کرامؑ نقل کئے ہیں۔ وہ تین قسم کی کتابیں ہیں +

(قسم اوّل) وہ کتابیں ہیں جن کا منسوب ہونا اُن کے مصنفین کی طرف مذکورہ بالا پانچوں طریقوں سے ہمارے نزدیک ثابت ہوچکا ہے۔ یا اُن کی اسناد کا متواتر و مشہور ہونا اس حد پر واضح ہے۔ جیسے آفتاب دوپہر کے وقت۔ وہ سات کتابیں ہیں۔ (۱) مجلدات کافی مصنفہ حافظ جلیل ثقۃ الاسلام محمد بن یعقوب کلینی جن کا انتقال ۳۲۹ھ (جس سال ستارے ٹوٹے) میں شہر بغداد میں ہوا۔ یہ کتاب ہماری تمام کتب معتبرۂ حدیث سے زیادہ تر صحیح اور معتبر ہے۔ اور اس کے زمانہ تالیف سے اس وقت تک فرقۂ امامیہ کے احکام کا مدار اسی کتاب پر ہے۔ اور اس کے پُرانے اور صحیح نسخے بیشمار موجود ہیں۔ (۲) کتاب نہج البلاغۃ جو جناب امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ کے کلمات کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کو امامیہ مذہب کے بزرگ عالم جناب حافظ فاضل محمد شریف رضی نے مرتب فرمایا ہے۔ جن کی وفات ۴۰۶ھ میں ہوئی۔ اور اس کتاب کی شرحیں بھی متواترات سے ہیں۔ مثلاً فاضل کامل ابن میثم بحرانی کی شرح جن کا انتقال ۶۹۷ھ میں ہوا۔ اور حافظ عبد الحمید بن ابی الحدید معتزلی کی شرح۔ اور میرے پاس کتاب نہج البلاغہ کا ایک قدیم نسخہ موجود ہے۔ جو ۶۰۷ھ ہجری میں علامہ سید یوسف اصفہانی کے سامنے پڑھا گیا ہے۔ (۳) کتاب مجمع البیان فی تفسیر القرآن ہے۔ جو شیعہ عالم حافظ امین الاسلام حسن بن فضل طبرسی کی تصنیف سے ہے۔ جن کا انتقال ۵۴۸ھ ہجری میں ہوا۔ اور ہمارے شیخ علامہ نوریؒ کے کتب خانہ

میں اس کتاب کا ایک نسخہ موجود ہے۔ جس کو عبد العزیز ترمذی نے ۶۲۵ھ ہجری میں لکھا ہے۔
(۴) کتاب تفسیر قمی ہے جس کو ہمارے عالم علی بن ابراہیم قمی نے چوتھی صدی میں تصنیف کیا۔ اور ہمارے علماء کا ایک گروہ اس کتاب کو اس کے مؤلف کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اور اس کی شہرت کا کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ اور مجھ کو اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ ہاتھ لگا ہے۔ (۵) کتاب بحار الانوار مصنفہ جناب علامہ حافظ مولانا محمد باقر مجلسی علیہ الرحمہ ہے۔ جو علمائے امامیہ میں ایک بڑے پایہ کے عالم گزرے ہیں جن کی وفات ۱۱۱۱ھ ہجری میں ہوئی۔ اس کتاب کی چھبیس ضخیم جلدیں ہیں جس میں شریعت مقدسہ کے ہر علم اور ہر باب کا ذکر ہے۔ خواہ آیات کے متعلق ہو یا روایات کے حکمت سے تعلق رکھتا ہو۔ یا تحقیق تاریخ سے۔ اس قسم کی جامع کتاب آج تک تصنیف نہیں ہوئی۔ (۶) انوار نعمانیہ ہے۔ جو امامیہ عالم حافظ سید نعمت اللہ جزائری کی تصنیف ہے جن کا انتقال ۱۱۱۲ھ ہجری میں ہوا۔
(۷) کتاب وافی ہے۔ جس میں ہمارے ہاں کی کتب معتبرہ میں سے ہر فن کے متعلق احادیث معتبرہ جمع کی گئی ہیں۔ اس کتاب کے مصنف حافظ فاضل محمد حسن فیض کاشانی ہیں۔ جن کا انتقال ۱۰۹۱ھ میں ہوا۔ اور اس کتاب کا اپنے مصنف سے منسوب ہونا بذریعہ تواتر مسلم ہے۔

(**قسم دوم**) وہ کتابیں ہیں جن کا ہمارے نزدیک اپنے مصنف کی طرف منسوب ہونا مذکورہ بالا پانچ وجھوں میں سے تواتر کے سوا اکثر وجہوں سے ثابت ہے۔ اور وہ سات کتابیں ہیں۔ (۱) کتاب التوحید (۲) علل الشرائع۔ (۳) خصال۔ (۴) عیون الاخبار۔ (۵) معانی الاخبار۔ یہ پانچوں کتابیں حافظ جلیل شیخ صدوق (یعنی محمد ابن بابویہ قمی) کی تصنیف سے ہیں۔ جو اجل علمائے شیعہ سے تھے۔ انکا انتقال ۳۸۱ھ میں ہوا ہے۔ میں نے ان پانچوں کتابوں کو قلمی اور قدیم زمانے کی لکھی ہوئی دیکھا ہے۔ (۶) احتجاج حافظ ابو طالب طبرسی کی تصنیف ہے۔ جو علمائے شیعہ سے قرن پنجم ہجری میں گذرے ہیں حافظ محمد بن شہر آشوب متوفی ۵۸۸ھ نے کتاب مناقب میں تحریر فرمایا ہے۔ کہ میں نے کتاب احتجاج خود مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی پائی ہے۔ (۷) درمنثور۔ حافظ عبد الرحمان جلال الدین سیوطی شافعی کی تصنیف سے جنکا انتقال ۹۱۱ھ ہجری میں ہوا ہے۔

(**قسم سوم**) وہ کتابیں ہیں جن کا منسوب ہونا ان کے مصنفین کی طرف مذکورہ صدر چھ وجھوں میں سے بعض وجوہ سے ہوا ہے۔ وہ چھ کتابیں ہیں۔ (۱) تفسیر عیاشی حافظ محمد بن مسعود شیعی کی تصنیف ہے جو قرن چہارم ہجری میں گزرے ہیں۔ (۲) بصائر الدرجات۔ حافظ محمد بن حسن قمی صفار متوفی ۲۹۰ھ ہجری کی تصنیف ہے جو کہ شیعی علماء میں سے تھے۔ اور جناب امام حسن عسکری کی صحبت سے بھی فائز

ہوئے تھے۔ میں نے اس کتاب کا ایک نسخہ ایسا پایا ہے۔ جو سنہ ۱۱۰۰ھ میں لکھا گیا ہے۔ اور اس کے ۱۶۳ باب ہیں۔ (۳) منتخب البصائر، صاحب کتاب مختصر فاضل حسن بن سلیمان شیعی کی تصنیف سے جو قرن ہشتم ہجری میں گذرے ہیں۔ اس کتاب میں مؤلف نے حافظ شیخ سعد بن عبداللہ قمی متوفی سنہ ۲۹۹ھ کی کتاب بصائر الدرجات کا انتخاب کیا ہے۔ (۴) کتاب الاختصاص محقق علامہ قطب الشیعہ محمد مفید کی تصنیف سے ہے جن کا انتقال شہر بغداد میں سنہ ۴۱۳ھ میں ہوا ہے۔ ان کی تصنیف سے کئی سو کتابیں ہیں۔ منجملہ اُن کے کتاب (ارشاد) ہے۔ اور کتاب (المقالات)۔ میں نے کتب خانہ میں شیخ محدث میرزا حسین نوری (متوفی سنہ ۱۳۲۰ھ) کے ایک نسخہ منتخبہ کتاب اختصاص کا خود دیکھا ہے۔ جس کی ابتداء یہ ہے: "الحمد للہ الذی لا تدرکہ الشواهد" الخ۔ اس کتاب کا انتخاب شیخ ابو علی احمد بن حسین بن احمد بن عمران شیعی نے کیا اور سنہ ۱۰۵۵ھ میں یہ نسخہ لکھا گیا ہے۔ (۵) کتاب النجوم (جس کا نام فرج المہموم ہے) حافظ سید علی بن طاؤس کی تصنیف ہے جو علماء شیعہ سے تھے۔ اور سنہ ۶۶۴ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ (۶) تفسیر نور الثقلین حافظ شیخ عبد علی بن جمعہ عروسی کی تصنیف ہے جو علماء شیعہ سے گیارھویں صدی میں گذرے ہیں۔ مجھے اس کتاب کا وہ نسخہ ملا ہے۔ جو سنہ ۱۰۶۵ھ میں لکھا گیا ہے۔

باقی رہیں حکماء کی کتابیں جن میں سے اس کتاب میں اکثر متاخرین و قدماء کی رائیں نقل کی گئی ہیں۔ وہ دس ہیں۔ (۱) شفاء شیخ الحکماء رئیس فلاسفران مسلمین ابو علی حسین بن سینا متوفی سنہ ۴۲۷ھ ہے۔ شیخ مذکور کی یہ کتاب اہل اسلام وغیرہ کے درمیان بہت مشہور و معروف ہے۔ (۲) اصول الہیئۃ۔ (۳) ارواء الظماء فی الفتنۃ الزرقاء۔ (۴) النقش فی الحجر (فلسفہ جدیدہ میں)۔ یہ تینوں کتابیں فاضل فلسفی کرنیلیوس فاندیک امریکی عیسائی متوفی سنہ ۱۸۹۵ء کی تصنیف سے ہیں۔ (۵) مشہد الکائنات فی الخالق والمخلوقات۔ پروفیسر میخائیل مشاقہ عیسائی متوفی سنہ ۱۸۸۸ء کی تصنیف سے ہے۔ ان کی ایک کتاب اساطیر الاوّلین بھی ہے۔ (۶) ہیئۃ فلامریون عیسائی فرانسیسی کی تصنیف سے ہے۔ جو انیسویں صدی کے مشہور و معروف کاملین میں سے تھے۔ اس کتاب کا ترجمہ فاضل عبدالرحیم تبریزی المعروف بہ طالب اف نے کیا ہے۔ (۷) ہیئۃ فیلکس دو فرانسیسی کی تصنیف سے ہے۔ جو انیسویں صدی کے مشہور و معروف فاضل گذرے ہیں۔ اس کتاب کا ترجمہ نجم الدولہ منجم طہران متوفی سنہ ۱۳۲۰ھ نے کیا ہے۔ (۸) دائرۃ المعارف ہے جس کے مصنف علامہ بطرس بستانی عیسائی متوفی سنہ ۱۸۸۳ء ہیں۔ اس کتاب کی کئی بڑی بڑی جلدیں ہیں۔ (۹) عجائب المخلوقات ہے۔ جس کے مصنف فاضل قزوینی زکریا بن محمود انصاری ہیں۔ جن کا انتقال سنہ ۶۸۲ھ میں ہوا۔ (۱۰) حقائق النجوم ہے جسکی کئی بڑی بڑی جلدیں علم ہیئت جدیدہ میں بزبان فارسی ہیں۔ اس کے مصنف فاضل دبیر الملک ہشیار جنگ بہادر ہیں۔ یہ کتاب سنہ ۱۲۵۳ھ میں تصنیف ہوئی۔ (۱۱) کتاب آیات بینات فی عجائب الارضین والسماوات ہے۔

جس کے مصنف فاضل ابراہیم آفندی حوارنی ہیں۔ جو کتاب بیروت میں ۱۸۸۳ء میں چھپی ہے +

اس میرے عنوان بیان سے معلوم ہوسکتا ہے۔ کہ جو شخص کسی اسلامی کتاب کی یا مقالات شرع مقدس کی تصدیق و توثیق چاہے۔ وہ اس کے طریقے مسلمانوں میں نہایت واضح و مستحکم پائیگا۔ اور یہ اُسی قسم کے طرق ہیں۔ جو تمام دنیا کی قوموں میں رائج ہیں۔ بلکہ اُن سے زیادہ مکمل و مستحکم ہیں +

پس اگر کوئی شخص اسلامی کتابوں کی اسناد کو باوجود اس اہتمام و استحکام کے بھی نہ مانے۔ تو اُسے لازم ہے کہ پھر دنیا کی کسی منقول عبارت یا کتاب کو بھی تسلیم نہ کرے خواہ وہ حکماء کی کتابیں ہوں یا مذہبی تاریخیں ہوں (حالانکہ لوگ بڑے حسن قبول سے ان کتابوں کو لیتے اور مانتے ہیں۔ تو لازم ہے۔ کہ اُسی حسن قبول سے اسلامی کتابوں کے مطالب کو بھی تسلیم کریں) +

دوسرا مقدمہ

ظاہر ہے۔ کہ ہر عاقل آدمی اُسی امر کو دل سے تسلیم کرسکتا ہے جس کا اُسے یقین حاصل ہو چکا ہے۔ پھر اگر وہ کوئی عملی چیز ہے۔ تو اُسی کے مطابق عمل بھی کرتا ہے۔ اور اگر علمی شے ہے تو اُس کے مطابق اعتقاد رکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اور جس امر کا اُسے یقین ہو چکا ہے۔ وہ کبھی زائل نہیں ہوتا۔ جبتک کوئی اُس سے زیادہ قوی ذریعہ اُس کے مخالف یقین کا نہ پیدا ہو۔ مثلاً اگر کسی شخص کو دس بیس ہزار آدمیوں کے بیان سے یقین ہو گیا ہو۔ کہ فلاں شخص مر گیا۔ تو اگر دس آدمی اس خبر کے مخالف بیان کریں۔ کہ وہ شخص ابھی زندہ ہے مرا نہیں۔ تو کبھی پہلا یقین ان دس آدمیوں کے بیان سے زائل نہ ہوگا۔ البتہ اُن کے بیانات کے ساتھ کچھ ایسے قوی و مضبوط شواہد ہوں جنہیں عقل ترجیح دے سکتی ہو۔ تو بیشک پہلا یقین بدلا جاسکتا ہے۔ لہذا معلوم ہوا۔ کہ عقل ہمیشہ قوی ترین اعتقاد کی تابع ہے۔ اور ضعیف اعتقاد کو تسلیم نہیں کرتی۔ اور خفیف ترین تدبیر سے اپنے اعتقاد کی اصلاح بھی کرلیتی ہے۔ مثلاً اگر آپ سے کوئی شخص بیان کرے۔ کہ جناب موسےٰ پیغمبرؑ نے جمع بین الضدین کو جائز بتایا ہے۔ (یعنی ایک مقام پر ایک ہی وقت میں سیاہ و سپید مثلاً دو نو جمع ہوسکتی ہیں)۔ اور آپکو حضرت موسےٰؑ کی رسالت و عصمت کا بھی علم ہو۔ نیز یہ بھی معلوم ہو۔ کہ دو ضدوں کا ایک مقام پر جمع ہونا محال ہے تو بے شبہ آپ اُس شخص کی خبر کی کوئی جائز و ممکن تاویل کرینگے۔ (مثلاً یہ کہینگے۔ کہ شاید ضدین سے حضرت موسیٰؑ کی کچھ اور مراد ہو۔ یا جمع ہونے کے کوئی اور معنی ہوں۔ نہ معنی متعارف جو محال ہیں)۔ اور اگر اُس خبر کی تاویل ناممکن ہوگی۔ تو ضرور ہے۔ کہ آپ اُس خبر دینے والے کی

تکذیب کرینگے۔ (اور کہینگے کہ لابد حضرت موسیٰ نے ایسی مہمل بات نہ فرمائی ہوگی بلکہ یہ شخص آنحضرت پر تہمت لگاتا ہے) ۔ خود حضرت موسےٰ کی تکذیب آپ سے نہ ہوسکیگی ۔ اور نہ جمع بین الضدین کی تصدیق ہی آپ سے ہوسکیگی ۔ اس وجہ سے کہ حضرت موسےٰ کی نبوت اور جمع بین الضدین کا محال ہونا آپ کو تیقن طور پر معلوم ہے ۔ بخلاف اس خبر مخالف کے جو شخص ثانی نے بیان کی ہے ۔ اور ظاہر ہے ۔ کہ ایک قوی و مضبوط الیقین غیر قوی یقین سے ہرگز ٹوٹ نہیں سکتا +

علےٰ ہٰذا القیاس اگر شریعت اسلامی میں کوئی کلام ایسا ملے ۔ جو بظاہر کسی امر یقینی کے مخالف ہو ۔ (اور خلاف عقل معلوم ہوتا ہو) تو ہم پر واجب ہے کہ اُسی طریقہ عقلیہ عقلائیہ پر عمل کریں ۔ یعنی قوی ترین اعتقاد وہی کو ترجیح دے کر اُس کا علاج اخف ادویہ سے کر دیں ۔ اوّل تو اس بات کی کوشش کریں کہ اُس کلام کی کوئی معقول تاویل ہاتھ آئے ۔ اور اگر کوئی تاویل مناسب نہ مل سکے ۔ تو اُس خبر ہی کی تکذیب کر دیں ۔ (نہ یہ کہ شریعت اور بانی شریعت کی تکذیب کرنے لگیں ۔ بلکہ یوں کہیں ۔ کہ ازبسکہ شریعت اسلامیہ حکمت و عقل کے مطابق ہے ۔ لہٰذا ایسا کلام جو خلاف عقل ہے ۔ اور ہم تک پہنچا ہے ۔ وہ ہرگز اُس کا بیان کیا ہوا نہیں ہے ۔ کسی جھوٹے شخص نے اپنی طرف سے تصنیف کر کے شریعت کے سر تھوپا ہے) +

علاوہ ازیں اسلامی شریعت کے اقوال میں ایک خاصیت اور بھی ہے جس کی وجہ سے کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی ۔ کہ (درصورت مخالفت ظاہر عقل) اُس کے ناقل کی تکذیب ہی کر دیں ۔ کیونکہ اس زمانے میں اور نیز اس سے پہلے بھی ہمیں اپنی شریعت کے ایسے اقوال ملے ہیں جو بظاہر اُن اقوال کے مخالف ہیں جنہیں حکماء و فلسفین نے علم ہیئۃ و سائنس و علم سیاست وغیرہ میں بیان کیا ہے ۔ اسی مخالفت کی وجہ سے ہمارے اگلے علماء اُن اقوال شریعت کی تاویلیں کیا کرتے تھے ۔ (تاکہ کسی طرح زبان شریعت کو بیان فلسفہ قدیم سے مطابق کر دیں) مگر بعد اس کے کہ زمانہ حال میں جدید تحقیقات کا خزانہ کھلا اور قوی و مستحکم رائیں معلوم ہوئیں (جو مطابق بیان شریعت کے تھیں) ۔ تو ہمیں معلوم ہو گیا ۔ کہ در اصل اُن حدیثوں کا مطلب وہ نہ تھا ۔ جسے علماء سابقین کہتے تھے ۔ بلکہ وہ ان تحقیقات کی خبر دے رہے تھے جو اس زمانے میں ظاہر ہوئی ہیں ۔ مگر چونکہ ہمیں یہ تحقیقات پہلے سے نہ معلوم تھی ۔ اس وجہ سے ہم تاویل بیجا کیا کرتے تھے +

اگرچہ ہم یہ خوب جانتے ہیں کہ جس طرح آج ہم قدیم فلسفہ پر ہنستے ہیں ۔ اُسی طرح ایک زمانے میں لوگ ہمارے اس جدید فلسفہ کی بعض بعض باتوں پر بھی ضرور ہنسینگے (کیونکہ ہرگز یہ یقین نہیں ہو سکتا ۔ کہ

یورپ کے فلاسفروں نے جو کچھ تحقیق کی ہے۔ وہ وقعی درست ہے۔ بلکہ بہت اچھی طرح ممکن ہے کہ آئندہ کوئی ایسا شخص پیدا ہو جو ان جدید تحقیقات کے بعض بعض مطالب پر پانی پھیر دے۔ اور انہیں از سر غلط ثابت کر دے)۔

پس اگر ہماری شریعت کے اقوال میں کوئی قول ایسا نظر آئے۔ جو بظاہر کسی جدید یا قدیم تحقیق کے مخالف ہو تو چاہئے کہ پہلے ہم اپنے علم کے نقصان پر ٹالیں۔ اور کہیں کہ جس طرح بہت سی باتیں اُن میں کی رفتہ رفتہ ہمیں تحقیق ہوئی ہیں۔ اور اُس سے پہلے ہمیں معلوم نہ تھیں۔ اُسی طرح ممکن ہے۔ کہ جس قدر آلات و اسباب مہیا ہوتے رہیں۔ آئندہ ہم کو باقی چیزیں بھی معلوم ہو جائیں۔ سر دست ہم کو اُن کی حالت پر چھوڑ دینا چاہئے کیونکہ مثل مشہور ہے کہ کم ترک الاول للآخر۔ بسا چیزیں ایسی ہیں کہ متقدمین کو معلوم نہ ہو سکیں۔ اور متاخرین نے انہیں دریافت کیا۔

اور اگر ایسا ہو کہ اُس کے خلاف کا یقین ہی ہو جائے۔ اور عقل اُس کے برخلاف نہ تجویز کر سکے۔ (اگرچہ ایسا شاذ و نادر ہے)۔ تو اُس وقت علاج یہ ہوگا کہ اُس کلام کی کوئی تاویل معقول کیجئے۔ اور اگر کوئی تاویل معقول بھی نہ بن پڑے۔ تو بعد کوشش بلیغ و اجتہاد تام اُس کا علاج آپ یہ کر سکتے ہیں کہ ناقل و راوی کی تکذیب کریں جس نے ائمہؑ سے نقل کیا ہے۔ (یعنی کہ راوی نے جھوٹ کہا ہے معصومؑ نے ایسا نہیں فرمایا)۔

تیسرا مقدمہ

یہ معلوم ہونا کہ فلاں کلام مثلاً زید کا ہے دوسرے کا نہیں ہے کئی طرح سے ہو سکتا ہے۔ اول یہ کہ خود اُس کہنے والے سے سُنا جائے۔ دوسرے یہ کہ خود تو نہ سُنا ہو۔ مگر معتبر و موثق لوگوں نے بیان کیا ہو۔ کہ ہم نے اُس شخص سے یہ بات سُنی (جیسا کہ خبر متواتر میں ہوتا ہے)۔ تیسرے یہ کہ کوئی ایسا شخص اُسے بیان کرے۔ جو مقدس و معصوم ہو۔ اس کے علاوہ اور بھی طریقے معلوم کرنے کے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص کسی کلام بلیغ و فصیح کو کسی ایسے شخص سے نقل کرے۔ جو انتہا درجے کا بلیغ و فصیح ہو۔ تو اُس کے سُننے ہی سے یقین ہو جائیگا۔ کہ واقعی یہ کلام اُسی قائل کا ہے۔ کیونکہ پہلے فرض ہو چکا ہے۔ کہ وہ قائل ابلغ متکلمین ہے۔ جس طرح اُس کلام کا نہایت بلیغ ہونا معلوم ہوا ہے۔ پس اگر کوئی شخص (باوجود اس کے) یہ تجویز کرے۔ کہ یہ کلام تو اُس کا نہیں ہے۔ تو دو حال سے خالی نہیں۔ یا اُس شخص کے حد درجے بلیغ ہونے کا یقین نہ رہیگا۔ (حالانکہ یہ خلاف فرض ہے)۔ پس ضرور ہوا کہ یہ یقین کیا جائے کہ بیشک یہ کلام اُسی کا ہے۔ (یا اُس کے بلیغ ہونے کا یقین باقی ہوگا۔ پھر ایسی صورت میں کیونکر کوئی کہ سکتا ہے۔ کہ یہ کلام بلیغ اُس شخص بلیغ کا نہیں ہے)۔

یا مثلاً کوئی شخص کسی ولی آدمی کا ایسا کلام نقل کرے جس میں غیب کی کوئی خبر ہو جس کا حس سے ادراک نہ ہوسکتا ہو۔ اور نہ عقل کے نزدیک اُس کا وجود لازم ہو۔ تو تمہیں اُس کلام کے سُنتے ہی یقین ہو جائیگا۔ کہ بیشک یہ کلام اُسی ولی کا ہے۔ کیونکہ تمکو یقین ہے۔ کہ غیب کے امور سے خبر دینا صرف ولی کی شان ہے۔ جو تمام حقائق عالم کی چیزوں کو جانتا ہے۔ اور عقل مجردہ رُوحانیہ سے اپنے علوم میں مدد لیتا ہے۔ اور اگر باوجود اس کے تم کہو۔ کہ یہ غیبی خبر اُس ولی کی دی ہوئی نہیں ہے بلکہ اور نے بیان کی ہے۔ تو گویا تم نے اپنے اُس پہلے یقین کو باطل کر دیا۔ (کہ غیب کی خبر دینا صرف ولی کی شان ہے) +

میرا مطلب اس بیان سے یہ ہے کہ وہ حدیثیں جنہیں میں اس کتاب میں رسول خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم یا اُن کے اوصیاء کرام ؑ سے نقل کرونگا چونکہ انکشافات غیبیہ پر مشتمل ہیں۔ اور قبل ان آلات جدیدہ کے معلوم نہ ہوسکتی تھیں۔ اُنکی بابت یقین کرنا چاہئے۔ کہ بیشک یہ اُنہیں بزرگواروں کا ارشاد ہے۔ (موضوع اور جعلی نہیں ہیں) کچھ اس رُو سے بحث کرنیکی ضرورت نہیں ہے۔ کہ راوی ان حدیثوں کے کیسے ہیں معتبر ہیں یا ضعیف ہیں۔ اور وہ کتاب جس سے یہ حدیث نقل کی گئی ہے ضعیف ہے یا معتبر۔ کیونکہ یہ باب مثل دیگر ابواب کے نہیں ہے۔ جس میں اہتمام کی ضرورت ہو حتّٰی کہ اگر ایسی غیبی خبر دینے والی کوئی حدیث کسی ضعیف سے ضعیف کتاب میں بھی مذکور ہوگی۔ تو وہ ہمارے نزدیک معتبر ہوگی بشرطیکہ وہ کتاب تاریخاً اس مکاشفہ جدیدہ سے مقدم ہو۔ (ورنہ کہا جائیگا۔ کہ حال میں جو یہ تحقیق ہوئی ہے۔ اُسے سُن کر کسی نے اپنی کتاب میں لکھ دیا ہے اور کسی امام کی طرف منسوب کر دیا ہے) کیونکہ ہم یقیناً جانتے ہیں کہ وہ خبر خبر غیبی ہے۔ اور غیبی خبر سوائے ولی خدا کے اور کوئی نہیں دے سکتا جنکا ارتباط خود پروردگار عالم سے ہے +

یہ دونوں مقدمے مفیدہ خود خبر و روایت کو لازم ہیں۔ راوی سے کچھ بحث نہیں۔ خواہ وہ کیسا ہی ہو۔ البتہ اگر یہ معلوم ہو جائے۔ کہ وہ کتاب آخر زمانے میں لکھی گئی ہے۔ اور یہ تحقیق جدید اُس سے پہلے ہو چکی ہے۔ تو البتہ وہ خبر اُس ولی کی نہ سمجھی جائیگی۔ پس اس امر کا لحاظ رکھنا ضرور ہے۔ دیکھئے۔ حکمائے فرنگ کے سامنے جب کوئی خبر یا روایت ایسی بیان کی جاتی ہے۔ جس میں کوئی مکاشفہ غیبی مندرج ہو تو پہلے وہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ کوئی پُرانے زمانے کی لکھی ہوئی کتاب اُن کو ملے جس میں وہ خبر مندرج ہے۔ جس سے اُن کو تصدیق ہوسکے۔ کہ فلاں معصوم یا ولی نے اسے بیان کیا ہے۔ راوی کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتے +

یہی وجہ ہے۔ کہ میں نے اِس بات کی کوشش کی ہے۔ کہ ہر موقع پر بہت سی کتابیں پیش کروں۔ جن میں وہ حدیث مروی ہے۔ اور اُن کتابوں کے سنہ کتابت و لنسخ بھی

(پہلے مقدمہ میں) لکھ دئے ہیں۔ تاکہ لوگوں کو اطمینان ہو سکے کہ یہ خبر اس جدید تحقیق کے زمانے سے کہیں پہلے کی ہے +

مثلاً ایک ہی حدیث کو کافی۔ تفسیر قمی۔ احتجاج۔ مجمع البیان۔ بحار اور بصائر وغیرہ سے میں نے اس رسالہ میں نقل کیا ہے جس سے دیکھنے والے کو شاید یہ خیال ہو سکتا ہے۔ کہ حدیث مذکور ہر کتاب میں علیحدہ علیحدہ سندوں سے مذکور ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ ایک ہی سند سے سب میں مذکور ہے۔ مگر میرا مقصود بہت سی کتابوں کے نام لینے سے یہ ہے۔ کہ معلوم رہے۔ کہ حدیث مذکور کا صدور جدید تحقیق کے زمانے سے بہت پیشتر ہو چکا ہے۔ اور یہ بات بغیر متعدد کتب کے ذکر کئے ہوئے پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ جن میں وہ حدیث درج ہے۔ اور اس جدید تحقیق کے زمانے سے بہت قبل تالیف کی گئی یا لکھی گئی ہیں +

مگر جیسے یہ معلوم ہے۔ کہ کب سے مغربی علوم کی شہرت مشرقی ملکوں میں ہوئی۔ اُسے ہماری مقدم الذکر تمہید کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ امر یقینی ہے۔ کہ علوم جدیدہ اور تحقیقات مغربیہ کی شہرت بلاد مشرقیہ میں بارھویں صدی ہجری کے بعد ہوئی ہے۔ (اور ہم جن حدیثوں کو پیش کرتے ہونگے۔ وہ یقیناً اس زمانے سے پہلے کی بیان کی ہوئی اور لکھی ہوئی ہیں۔ پس ہرگز یہاں یہ شبہ نہیں ہو سکتا۔ کہ ان تحقیقات کو سننے کے بعد کسی نے حدیث بنائی ہے۔ اور اور ہماری کتابوں میں درج کر دی ہے)۔ نیز یہ کہ تمام مؤرخین جانتے ہیں۔ کہ پہلے پہل ملک مصر اور سور میں مغربی علوم نے بذریعہ نپولین بونا پارٹ فرانسیسی متوفی ۱۸۲۱ء کے شہرت پائی ہے۔ (اس سبب سے کہ نپولین کو یہ خیال تھا۔ کہ ممالک مشرقیہ کی تسخیر اُن کے علوم ہی کی وجہ سے ہوئی ہے) +

بعد ازاں علوم مغربیہ نے ملک جاپان میں شہرت پائی۔ (جو بالفعل نہایت صاحب ثروت ملک ہے۔ اس کی صنعتیں اور رفتار حکومت بھی نہایت شاندار ہے)۔ اس ملک نے نہایت کشادہ دلی کے ساتھ علوم مغربیہ کا استقبال کیا۔ اور کچھ لوگ اپنے ملک سے ایسے منتخب کئے۔ جو بلاد یورپ کا سفر کریں۔ (اور وہاں سے علوم حاصل کر کے اہل ملک کو فائدہ پہنچائیں) +

اس کے بعد ملک ہند میں یہ علوم پھیلے۔ پھر ملک ایران میں فتح علی شاہ قاچار طاب ثراہ کی سلطنت کے دور میں ان علوم نے سرایت کی۔ مگر ظہور اُس کا ناصر الدین شاہ قاچار کے

وقت میں ہوا۔ اور ثمرہ اُس کا ہمارے اس زمانہ میں ظاہر ہوا جب کہ ہم تمام ملک اسلام کو دیکھ رہے ہیں کہ اپنے گذشتہ مراتب عالیہ کے دوبارہ حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت چاہتے ہیں۔ اور دستوری حکومت اور نور علم کے ذریعہ سے اپنے وطن (ایران) میں نئی روشنی پھیلانا چاہتے ہیں +

چوتھا مقدمہ

فراست اور اظہار امر غیب میں کیا تفرقہ ہے؟ اور ان کے احکام کیا کیا ہیں؟

غیب کی خبر دینا یا غیبی امور کا ظاہر کردینا جو انبیا اور اولیا کا معجزہ ہے۔ یہ ہے۔ کہ وہ ایسے امور کو ظاہر یا بیان فرمائیں جو حواس خمسہ سے محسوس نہیں ہوتے۔ اور نہ عقلاً اُن کا وجود لازم ہے مثلاً ہمارے رسولؐ کا یہ ارشاد کہ فضا ٔ آسمان میں بہت سے مخلوقات ہیں۔ اور مثلاً اُن کے وصی علیؑ کا یہ ارشاد کہ پانی میں پیشاب نہ کرو۔ کیونکہ پانی میں بھی جاندار رہتے ہیں علیٰ ہذا القیاس اور باتیں جو بظاہر حواس خمسہ سے بغیر مدد آلات کے نہ محسوس ہوسکیں اور نہ کوئی دلیل عقلی اُس کے وجود کی مقتضی ہے۔ (جس طرح اُس کے عدم کی بھی مقتضی نہیں ہے) +

اس قسم کے امور وہ ہیں جنہیں وہی شخص جان سکتا ہے جو عالم کے تمام اسرار سے واقف ہو۔ اور جس کے سامنے ہر ظاہر و مخفی چیز روشن ہو۔ جیسے خود باری تعالےٰ یا وہ جن پر وحی نازل ہوتی ہو +

پس جو شخص دعوے نبوت و امامت کرکے اظہار مغیبات کرے۔ جو درک بحواس خمسہ نہیں ہوتیں۔ اور نہ صرف عقل ہی اُسے ظاہر کرسکتی ہے بیشک وہ ہر مذہب والوں کے نزدیک سچا سمجھا جائیگا کیونکہ اس بات پر سوائے ولی کامل کے جو کذب و افترا سے منزہ ہو۔ کوئی شخص قادر نہیں ہوسکتا +

رہی فراست۔ تو یہ اظہار غیب کے علاوہ ایک چیز ہے۔ کیونکہ فراست یا تفرس اُسے کہتے ہیں کہ کوئی شخص علامات و دقیق لوازم کے ذریعے سے کسی امر مخفی کو دریافت کرے۔ پس اگر وہ دریافت شدہ امر صفات نفس میں سے ہو۔ تو اس قسم کے تفرس کو **قیافہ** کہتے ہیں۔ جیسے کسی شخص کی قفا (پس گردن) کو عریض (چوڑی) دیکھ کر یہ تاڑ جانا۔ کہ بیشک یہ شخص احمق ہے۔

یا کسی کو نہ گردن کو دیکھ کر تفرس کر لینا کہ یہ شخص فطن و ذہین ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور اگر وہ امر معلوم شدہ از قسم واقعات آئندہ ہو۔ خواہ وہ واقعات خاص ہوں یا عام۔ تو اُسے تنبؤ کہتے ہیں۔ جیسے اہل سیاست کا دریافت کر لینا کہ آئندہ فلاں قوم کی کیا حالت ہوگی۔ یا کچھ آثار دیکھ کر یہ معلوم کر لینا۔ کہ آئندہ زمانہ میں کیا واقعہ پیش آئیگا۔ (اور اُس کی پیشینگوئی کرنا)۔ یا ہمارا یہ تفرس کہ ملک ایران دوبارہ اس واقعہ ۱۳۲۶ھ کے بعد دستوری سلطنت حاصل کریگا۔ مگر علم فراست (بجمیع اقسامہ) نبوت یا امامت کی دلیل نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ امر انتقال ذہن اور اسباب خفیہ میں زیادہ غور کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ یا ایسے اسباب کے دیکھنے سے جو بتدریج اُس مطلب تک پہنچانیوالے ہوں۔ یا اُس کے امثال و شواہد پر نظر کرنے سے +

ہماری شریعت اسلامی میں چند پیشینگوئیاں ہیں۔ جن میں دو نوہی احتمال ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم اُسی دلیل سے قطع نظر کریں۔ جن سے اُن کی خصوصیت نبوت کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ جیسے قرآن مجید کی یہ پیشینگوئی کہ سلطنت روم کو بعد مغلوبیت کے ضرور غلبہ حاصل ہوگا (چنانچہ ایسا ہی ہوا)۔ اِس بیان کی بابت کوئی اجنبی آدمی جو مسلمان ہو۔ احتمال دے سکتا ہے۔ کہ یہ اخبار بالغیب ہے۔ اور یہ بھی احتمال دے سکتا ہے۔ کہ تنبوء ہے۔ صرف رسول خداؐ نے اپنے انتقال ذہنی اور اسباب خفیہ پر نظر کرنے کے ذریعے سے جو انہیں معلوم تھے۔ یہ حکم لگایا تھا + لیکن حضرتؐ کی اس پیشینگوئی کے اخبار بالغیب ہونے کی دلیل یہ ہے۔ کہ سیاسی تفرسات ہمیشہ مفید ظن ہوتے ہیں۔ (اُن سے یقین نہیں پیدا ہوتا۔ کیونکہ بعض آثار کو دیکھ کر یہ کہدینا کہ آئندہ ایسا ہوگا۔ اِس سے یہ لازم نہیں ہے۔ کہ ویسا یقیناً ہو بھی جائے۔ یا کہنے والا بطور یقین کہے۔ کہ ایسا ہی ہوگا)۔ اور جو شخص کہ مدعی نبوت ہے۔ اُس سے بہت بعید ہے۔ کہ اپنے مخالفین اور دشمنوں کے سامنے اپنی ایسی کتاب میں جسے وہ ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ بتاتا ہو۔ کوئی ظنی و تخمینی بات یا محض ذہنی حادثہ بیان کرے۔ اور یقین کے طور پر اُس کی خبر دے کر کہے۔ کہ (غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْ اَدْنَی الْاَرْضِ وَھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِھِمْ سَیَغْلِبُوْنَ)۔ (پس معلوم ہوا۔ کہ حضرتؐ کا یہ ارشاد تخمینی پیشینگوئی نہ تھا۔ بلکہ بطور معجزہ اظہار غیب و اخبار بالامر الغائب تھا) +

بہر حال ہمارے اسلام میں بہت سی ایسی باتیں مذکور ہیں۔ جو اظہار غیب و کشف مغیب کے جانب کا پہلو رکھتی ہیں۔ جیسے امام رضا علیہ السلام کا یہ خبر دینا کہ ہماری جانب فوق میں سیادت

کے اندر بہت سی زمینیں ہیں۔ اور امام محمد باقر علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ ہمارے اس قمر محسوس کے علاوہ اور بہت سے چاند ہیں۔ اسی طرح بہت سے عالم اور بہت سے آفتاب وغیرہ ہونے کی خبریں ہیں جن کی بابت سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ بذریعہ وحی کے ان کو یہ باتیں معلوم ہوئیں۔ اور یہ کہ ازبسکہ خدا تعالےٰ سے ان کو ارتباط کامل حاصل ہے۔ اس لئے وہ ان کو ایسی مخفی باتوں سے مطلع فرما دیتا ہے۔ (جنہیں عام لوگ اپنے حواس خمسہ سے محسوس نہیں کر سکتے)۔ کیونکہ یقینی بات ہے۔ کہ محض حس و عقل سے ان امور کا ادراک نہیں ہو سکتا۔ اور متاخرین فلاسفروں نے جو انہیں معلوم کیا ہے۔ تو آلات جدیدہ کے ذریعہ سے معلوم کیا ہے جنکی ایجاد ایک ہزار سنہ ہجری کے بعد ہوئی ہے۔ (اور یہ ارشادات اُس سے بہت ہی پہلے کے ہیں)+

البتہ یہاں ایک شبہ ہو سکتا ہے کہ اکثر آیتوں اور روایتوں میں توصاف طور پر ان جدید کشفیات کا بیان ہے۔ اور بعض میں مجمل طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس کا کیا سبب ہے۔ تو ہم اس شبہ کا یہ جواب دینگے۔ کہ گفتگو کا موقع کبھی ایسا ہوتا ہے۔ کہ وہاں کسی قسم کا مانع موجود نہیں ہوتا۔ اُس مقام پر گفتگو کرنے والا صاف و صریح گفتگو کرتا ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے۔ کہ سُننے والے کے پاس کچھ شواہد مقامی یا عقلی موجود ہوتے ہیں۔ (جن پر نظر کرنے سے وہ فوراً سمجھ سکتا ہے)۔ وہاں متکلم کا فرض نہیں ہے۔ کہ خواہ مخواہ کلام کو طول دے۔ بلکہ وہاں اشاروں ہی سے سننے والے بسبب شواہد مقامیہ کے متکلم کا مطلب سمجھ جاتے ہیں۔ (لہذا متکلم مجملاً اُس بات کو بیان کرتا ہے)۔ البتہ جو لوگ اُس موقع پر موجود نہیں ہیں اُنہیں ازبسکہ وہ قرائن معلوم نہیں۔ اِس وجہ سے سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔ اور محتاج تفصیل و بیان ہوتے ہیں+

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ بسبب اختلاف زبان اور عدم معلومیت بعض حالات کے اجمال پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی متکلم مثلاً اپنے زمانے کی زبان کے مطابق کوئی لفظ بولتا ہے۔ اور آئندہ زمانے والے ازبسکہ اُس زبان سے یا اُن صفات و حالات سے واقف نہیں ہوتے متکلم کا مطلب واضح طور پر سمجھ نہیں سکتے۔ جیسا کہ چند روایتوں میں ہے۔ (جو ائمہ طاہرین علیہم السلام نے فرمائی ہیں)۔ کہ خدا تعالےٰ کے دو بڑے بڑے شہر اسی زمین پر ہیں۔ ایک مشرق میں ہے جس کا نام جابلقا ہے۔ دوسرا مغرب میں ہے۔ جس کا نام جابرسا ہے۔ ان شہروں میں جو لوگ آباد ہیں اُنہیں یہ بھی خبر نہیں۔ کہ آدم کون تھے۔ اور اُنکی اولاد کون ہے۔ (مگر

اِس زمانے میں بعد تحقیقات کثیرہ بھی نہ معلوم ہُوا کہ جابلقا و جابرسا کون سے شہر ہیں۔ اور کہاں ہیں)
پس اِس کے جواب میں ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ ممکن ہے۔ کہ جابلقا سے مراد جزیرۂ آسٹریلیا ہو۔ جسے کپتان
وویفکن نے ۱۶۰۶ء میں دریافت کیا۔ اسی وجہ سے اُس کو ہالنڈ جدید کہتے ہیں۔ اور یہ شہر جزیرۂ عرب
سے (جہاں سے اُس کلام کا صدور ہوا تھا) جانب مشرق میں واقع ہے۔ (رہا یہ کہ امامؑ نے جابلقا
فرمایا۔ اور اب اُسے آسٹریلیا کہتے ہیں۔ یہ صرف زبانوں کا تفرقہ ہے۔ اِس سے اصل خبر میں کوئی
اعتراض نہیں ہوسکتا)۔ اور جابرسا سے مراد جزیرۂ امریکہ ہو۔ جسے کولمبس وامریک نے ۱۴۹۲ء
میں دریافت کیا۔ اور یہ ملک جزیرۂ عرب سے جانب مغرب میں نصف دورہ سے کچھ آگے واقع ہے +

اس ہماری تطبیق میں سوائے اختلاف زبان اور اختلاف نام اور بعض صفات خفیہ کے
اور کوئی ایسی بات نہیں۔ جس سے ہمارا یہ احتمال درست نہ ہوسکتا ہو۔ (اگر کوئی کہنے والا کہہ سکتا
ہے۔ تو صرف اس قدر۔ کہ کجا جابرسا و جابلقا۔ اور کجا امریکہ و آسٹریلیا۔ مگر ہم کہینگے۔ یہ صرف زبانوں
کے اختلاف کی وجہ سے ناموں میں اختلاف ہوگیا ہے۔ ورنہ در اصل یہ اور وہ ایک ہی ہیں۔ جیسے
اِس زمانے میں بھی بہت سے ایسے شہر ہیں۔ جن کے نام سابق میں کچھ اور تھے۔ اور اب کچھ اور
ہیں۔ مثلاً بنارس کا ایک نام سابق میں محمد آباد تھا۔ اور اب کوئی اُسے جانتا بھی نہیں۔ تو اس عدم
واقفیت کی وجہ سے یہ نہیں کہا جاسکتا۔ کہ اُس کا نام محمد آباد نہ تھا۔ یا مثلاً جدید دہلی کا نام شاہجہان آباد
ہے۔ مگر سوائے چند آدمیوں کے لاکھوں آدمی ایسے ملینگے۔ جنہیں یہ نہیں معلوم ہے۔ کہ اسے کبھی
شاہجہان آباد بھی کہتے تھے۔ علےٰ ہذا القیاس اوروں کو بھی سمجھ لیجئے) +

علاوہ بریں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ متکلم کو کوئی خاص مانع درپیش ہو جاتا ہے جس کی وجہ
سے وہ اپنے کلام کو مختصر کر دیتا ہے۔ مثل اُس کے کہ اُس کا کلام ایسے مقدمات کے سمجھنے پر موقوف
ہو۔ جو بالفعل موجود نہیں ہیں۔ اور جن کے بغیر سننے والا اُس کلام کو سمجھ نہیں سکتا۔ اگر وہ مقدمات
موجود ہوتے۔ تو متکلم اپنے کلام کو اُن کے مطابق شرح کر سکتا تھا۔ لیکن از بسکہ وہ مقدمات اس
وقت موجود نہیں ہیں۔ اس لئے متکلم اُس مطلب کی تصریح نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے۔ کہ
یہ مطلب ایسے چند مقدمات پر موقوف ہے۔ جنہیں سامعین نہیں جانتے۔ پس اگر میں اس
مطلب کی توضیح زیادہ کرونگا۔ تو یہ لوگ بسبب اپنی نافہمی اور ناواقفیت کے میری تکذیب کرینگے
یا میری اہانت کرنے لگینگے۔ کیونکہ اُن کی جہالت ایک طرف۔ اور اصل مطلب کا دقیق ہونا ایک
طرف۔ پھر کیونکر وہ سننے والے جنہوں نے اُسے حس و عقل سے نہیں دریافت کیا ہے۔ اُس

مطلب کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ لہٰذا متکلم مصلحتاً اپنے کلام کو لباس اختصار یا لباس تشبیہ پہنا دیتا ہے
تاکہ کسی دشمن دانا یا دوست نادان کے ہاتھ میں آلۂ اعتراض نہ پڑ جائے۔ جس سے وہ بن سمجھے اعتراض
کرنے لگے۔ اور اصل غرض متکلم کی فوت ہو جائے۔ مثلاً مقام تشبیہ میں آنحضرتؐ کا یہ ارشاد کہ "فرّ
من المجذوم فرارک من الاسد" جذام والے سے اِس طرح بھاگو۔ جیسے کوئی شیر سے بھاگتا
ہے۔ اب کہ ڈاکٹروں نے تحقیق کی۔ اور جذام کے مقامات کو تشریح کرکے دیکھا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ اُن
مقامات میں شیر کی صورت کے سے کیڑے ہیں۔ جو مجذوم کے جسم سے نکل کر ہوا میں پھیلتے ہیں۔ اور
سانس کے ذریعے سے دوسرے لوگوں کے جسم میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جو اُس سے قریب بیٹھے۔
پس بعض اوقات اُس کا اثر یہ ہوتا ہے۔ کہ قریب بیٹھنے والوں کو بھی وہی مرض لاحق ہو جاتا ہے۔ پس
آنحضرتؐ کا تشبیہ دے کر فرمانا کہ "اُس سے اِس طرح بھاگو۔ جیسے شیر سے بھاگتے ہو" گویا اس مطلب
کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ کہ جذام کے جسم کے کیڑے شیر کی صورت میں ہوتے ہیں۔ اُن سے بچتے
رہو۔ یہ ایک لطیف عنوان ہے ادائے مطلب کا۔

(**نکتہ**) اکثر وہ باتیں جو عام لوگوں کے دیدہ و دماغ سے مخفی تھیں۔ شریعت اسلامیہ
نے اُنہیں بتدریج بیان فرمایا ہے۔ مثلاً اگر کوئی مشکل مسئلہ جو ذرا عام طور پر لوگوں کے فہم سے بعید
ہے۔ قرآن مجید بیان فرماتا ہے۔ تو مجملاً بیان کرتا ہے۔ علےٰ ہذا القیاس اگر ایسا کوئی غامض مطالب
رسول خداؐ کو بیان کرنا پڑتا ہے۔ تو بالاجمال بیان فرماتے ہیں۔ مگر ائمہ علیہم السلام اُن مطالب کو تصریح
سے تدریجاً ظاہر فرماتے ہیں۔ مثلاً یہی مسئلہ حرکت زمین کا لیجئے۔ کہ قرآن مجید کبھی تو اسے لباس تشبیہ
پہنا کر بیان کرتا ہے۔ کبھی (مہد گہوارہ) کہتا ہے۔ کبھی (ذلول۔ جہان مطیع و فرماں بردار) کہتا ہے۔
اور کبھی اجمالی لباس میں اُسے جلوہ دیتا ہے۔ اور فرماتا ہے۔ وتری الجبال تحسبہا جامدہ۔
(بخیال تمہارے پہاڑ ایک مقام پر جمے ہوئے ہیں)۔ مگر ائمہ علیہم السلام جب اسی مطلب کو ارشاد فرماتے ہیں
تو بتصریح جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔

نیز تعدد زمین کا مسئلہ قرآن مجید تو فرماتا ہے۔ ومن الارض مثلہن۔ یعنی زمین بھی مثل
آسمانوں کے متعدد ہے۔ اِس سے صرف بالاجمال تعدد زمین معلوم ہوتا۔ تصریح نہ معلوم ہوئی۔ کہ
کیونکر ہیں۔ کہاں ہیں۔ کیسی ہیں)۔ مگر ائمہ علیہم السلام تصریح سے ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ زمینیں
بھی سات ہیں۔ اور ہم سے اوپر کی جانب میں ہیں۔ ایسی ہیں ایسی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ (جیسا کہ
آئندہ مفصل معلوم ہوگا)۔ (علےٰ ہذا القیاس) بہت سے آفتاب بہت سے چاند اور متعدد عالم کے

وجود کا مسئلہ ہے۔ کہ قرآن مجید مجملاً اشارہ ارشاد فرماتا ہے۔ (رب العالمین) خدا تعالٰے تمام عالموں کا پالنے والا ہے۔ اور ائمہ علیہم السلام بتصریح بیان فرماتے ہیں۔ کہ علاوہ اس آفتاب محسوس کے اور بھی آفتاب ہیں۔ چاند بھی متعدد ہیں۔ ہمارے اس عالم کے علاوہ اور بہت سے عالم ہیں۔ جن میں مخلوقات آباد ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس دیگر باتیں ہیں۔ کہ قرآن میں وہ بالاجمال مذکور ہیں۔ احادیث اُن کی توضیح و تفصیل کرتی ہیں۔ میرے خیال میں اس کی چند وجہیں ہیں ؛

(ایک) یہ کہ قرآن مجید ایک عام کتاب ہے۔ یعنی ایسی کتاب ہے۔ جسے کسی زمانے اور کسی شہر سے خصوصیت نہیں ہے۔ تو اُس کے واسطے یہی مناسب تھا۔ کہ متوسط رفتار اپنے بیان کی رکھے۔ تاکہ ہر زمانے کے لوگوں کے مزاج کے موافق اُس کا بیان ہو۔ اور رغبت سے اُسے قبول کر کے غور و فکر کے ساتھ اُس کے مطالب کو سمجھ کر ایمان و ہدایت حاصل کریں۔

(دوسرے) یہ کہ اس اسلامی شریعت کا نشو و نما ایسی قوم میں ہوا ہے۔ جو انتہا درجہ کی جاہل تھی۔ مزخرفات و لاطائل باتوں کی غلامی کرتی تھی۔ پس اگر یہ شریعت مقدسہ یکدفعہ اُن کے تمام خرافات خیالوں کی تکذیب کر دیتی۔ اور تمام باطل عقیدوں کے مٹانے کا ارادہ فرماتی۔ اور چاہتی۔ کہ کل عبادات و معاملات و علوم الہیات اور اسرار عالم ایک ہی مرتبہ اُن کو تعلیم کر دے۔ تو یہ لوگ ایک بالشت بھی اس مذہب کے پاس نہ جاتے۔ (دُور سے اِس مذہب کی صورت کا خیال کر کے بھاگتے)۔ لہٰذا بمقتضائے عقل لازم ہوا۔ کہ ان میں علوم کا نشر آہستہ آہستہ اور بتدریج کیا جائے۔ رفتہ رفتہ اُن کے عقائد کا بطلان اُن پر واضح کیا جائے۔ تاکہ جس قدر اُن کی عقلیں روشن ہوتی رہیں۔ اُسی قدر وہ اُن مطالب علمیہ کا تحمل کرتے رہیں۔ (نہ یہ کہ ایک ہی مرتبہ تمام ایسی باتیں جو اُن کے جاہل دماغوں سے بہت دور ہیں بیان کر دے۔ جس سے گھبرا کر وہ اسلام ہی سے علیحدہ ہو جائیں)۔ اس لحاظ سے ہمارے رسول صلعم نے فرمایا ہے۔ انا معاشر الانبیاء امرنا ان نکلم الناس بقدر عقولھم۔ یعنی ہم گروہ انبیاء کو یہ حکم (جانب خدا تعالٰے سے) ملا ہے۔ کہ لوگوں کی عقلوں کے اندازہ کے مطابق اُن سے گفتگو کریں ؛

دیکھئے۔ کہ وہ قوم جو صرف اس وجہ سے کہ آنحضرت صلعم نے اُن کے بہت سے خداؤں کی نفی کر کے ایک خدا کی پرستش کا حکم دیا۔ اُن کو دیوانہ بتانے لگی۔ (اور کہنے لگی۔ کہ لو یہ دیوانہ رسول ہونے کا دعوے کرتا ہے۔ اور ایسی مہمل بات کہتا ہے۔ کہ صرف ایک ہی خدا ہے)۔ تو بھلا

وہ قوم اُس وقت کیونکر چپ چاپ حضرت مؐ کے اِس ارشاد کو قبول کر لیتی۔ کہ آپ فرماتے۔

مثلاً استارہ مشتری بھی ایک زمین ہے۔ مثل ہماری اِس زمین کے۔ اور ہزار درجہ اِس سے

کلاں ہے۔ اس میں بہت سے درخت۔ بہت سے دریا۔ بہت سے لوگ اور بہت سے شہر ہیں۔ (کیونکہ اُن کے اعتقاد میں تو مشتری ایک روشن کرنیوالی چیز تھی۔ جس میں کہیں آبادی وغیرہ کا نشان بھی نہ تھا۔ تو بھلا ایک دفعہ ہی اپنے اعتقاد کے برخلاف کیونکر رسولؐ کے قول کو مان لیتے)۔ پس عاقلانہ سیاست ملکی اور حکمت تمدن کا یہ مقتضا تھا۔ کہ بتدریج اُن کے ساتھ رفتار کی جائے۔ اور جتنی روشنی اُن کی عقلوں میں بڑھتی رہے اُسی کے مطابق علوم کی تعلیم اُن کو کی جائے۔ لہٰذا خود جناب رسالت مآب مؐ نے ان مطالب غریبہ کی طرف اشارةً تحریک فرمائی ہے۔ (اور جب اُن کے دماغوں نے اُس تحریک کو قبول کر لیا۔ تو) ائمہ علیہم السلام نے اُس کی شرح فرما دی +

اِس مقام پر اگر کوئی یہ اعتراض کرے۔ کہ اِس قسم کے امور کا بیان کرنا تو رسولؐ پر لازم ہی نہیں۔ (جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا)۔ پھر کیا باعث ہوا کہ آپ نے ان اسرار کے بیان کی ابتدا فرمائی۔ جس سے خطروں میں پڑنے کا خوف تھا۔ کیوں نہ اُسی طرح سکوت کیا۔ جس طرح دیگر گذشتہ شریعتوں نے ان چیزوں کے بیان سے سکوت کیا تھا۔ (تو ہم) یہ جواب دینگے۔ کہ اس میں بہت سی مصلحتیں تھیں بہت سے راز تھے۔ اسلامی شریعت کا قیاس دیگر شریعتوں پر نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اسلام ایک ایسا دین ہے۔ جو قیامت تک باقی رہنے والا ہے۔ اور انسانیت کو کامل کرنے کی غرض سے قائم کیا گیا ہے۔ لہٰذا آدمی کو چاہیئے۔ کہ اُس کے معجزات و آیات حسنہ کو ہر زمانہ میں غور کی نگاہ سے دیکھا کرے۔ جس سے اُن لوگوں کی ہدایت کا بھی باعث ہو۔ جو عہد رسولؐ میں موجود ہیں۔ اور اُن لوگوں کے لئے بھی مفید ہو۔ جو آئندہ زمانوں میں بتدریج آنیوالے ہیں۔ اور وہ ایسے معجزات ہونے چاہئیں۔ جو ہر عاقل کے مذاق کے موافق اور باہم متقارب و متجانس ہوں +

یہی وجہ ہے۔ کہ حکمائے فرنگستان کے سامنے اگر یہ معجزہ بیان کیا جائے۔ کہ رسول خداؐ نے ایک بچہ کو گویا کر دیا۔ یا سوسمار نے حضرتؐ سے گفتگو کی۔ یا پتھر کو آپ نے شق کر دیا۔ یا چاند کو دو ٹکڑے کر دیا۔ تو ان باتوں کے سننے سے اُن کو ہرگز ہدایت نہیں ہوتی۔ بلکہ بخیال خود وہ ایسی باتوں کو غلط سمجھتے ہیں)۔ بخلاف قرآنی آیات (اور احادیث رسولؐ و اوصیائے رسولؐ

کے کہ اگر مثلاً اُس میں ہوتا یعنی مگر نر و مادہ ہونا کچھ حیوانوں ہی سے مخصوص نہیں ہے ۔ اور جمادات ہونا اشجار و نباتات و حیوانات سب میں پایا جاتا ہے ۔ جیسا کہ سورۂ قٓ میں مذکور ہے وانبتنا فیہا من کل زوج بہیج ۔ اور سورۂ ذاریات میں ہے ۔ ومن کل شئ خلقنا زوجین ۔ تو اُسے سُن کر تعجب کرتے ۔ اور رسول خدا صلے اللہ علیہ و آلہٖ کی تصدیق کرتے ہیں بغیر اس کے کہ کسی اور معجزے کو دیکھیں ۔ یا قرآن مجید کی بلاغت کی طرف توجہ کریں ۔ (کیونکہ جدید تحقیقات نے جواب ثابت کر دیا ہے ۔ کہ نر و مادہ ہونا یا حمل حیوانات ہی سے نہیں متعلق ہے بلکہ نباتات میں بھی اس کا اثر موجود ہے ۔ تو ان کو یہ خیال ہوتا ہے ۔ کہ بیشک جس شخص نے تیرہ سو برس پہلے بن سیکھے اور پڑھے اور بغیر مدد آلات وغیرہ کے ایسے اسرار بتائے ہیں ۔ سچا رسول ہوگا) ۔

میں سچ کہتا ہوں ۔ کہ اسلامی شریعت کے اقوال مجملہ و مفصلہ دونوں ہی نے ہر زمانے اور ہر مقام میں اہل معرفت کے دلوں کو اپنا گرویدہ بنایا ہے ۔ ان ملفوظات کاملہ میں ایسی تاثیر کی ہے کہ ویسی اُن لوگوں کے دلوں میں کبھی نہ ہوئی ہوگی جو خود معجزات کو دیکھتے تھے ۔ اور سبب اس کا یہ ہے ۔ کہ وہ اقوال عجیب عجیب اسرار و رموز کو ظاہر فرماتے ہیں ۔ یہی سبب ہے ۔ کہ موحدین ہر زمانہ میں ان کلمات قدسیہ کی حقائق و دقائق کی روشنی حاصل کرتے اور متعجب ہوتے رہتے ہیں ۔

علیٰ ہذا القیاس حکماء سائنس و اہل ہیئت و بلغاء و مؤرخین خواہ قدماء ہوں یا متاخرین سب ہی کے لئے اسلام کی لطیف باتیں جو اُن کے مذاقوں کے موافق تھیں ہدایت کا باعث ہوتی رہی ہیں ۔

بڑے علماء علم سیاست اہل فرنگ وغیرہ ۔ وہ تو اس امر کا صاف لفظوں میں اقرار کر رہے ہیں ۔ کہ مغربی ممالک کی سیاست جو تقریباً دو سو برس سے بذریعہ انجمنوں کانفرنسوں اور پارلیمنٹ اور بڑے بڑے ہزاروں حکماء کاملین کی مدد کے حد کمال تک پہنچی ہے ۔ وہ بھی اب تک اُس تمدن اسلامی تک نہیں پہنچ سکی ۔ جو صرف ایک شخص (جناب محمد مصطفیٰ) کی ذات و تعلیم سے ظاہر ہوئی ۔ کیونکہ آنحضرت ؐ نے کوئی ایسی چیز اپنے بیان میں فروگذاشت نہیں کی ۔ جس کے عمدہ اصول و فروع کے مطابق مغربی سلطنتیں ترقی کر رہی ہیں ۔ بلکہ اس سے زیادہ اور بہتر بیان فرما دئے ہیں ۔ اور ان تعلیمات میں ہرگز وہ نقص و مفاسد نہیں ۔ جو بلاد مغربیہ میں پھیلے ہوئے ہیں ۔ جن کے دفعیہ کے لئے بڑے بڑے عقلا کوشش کر رہے ہیں ۔ مگر کامیابی نہیں ہوتی ۔ پس جو کہ اب تمدنی حیثیت کا اس جدید روشنی کے زمانے میں دیکھینگے ۔ وہ کمال آپ کو اسلامی

تمدن میں بھی ملیگا۔ اور جو نقص و عیب اس تمدن میں ہوگا۔ ہرگز اُس کا اثر اسلامی تمدن میں
آپ کو ڈھونڈے سے بھی نہ ملیگا۔ ذٰلک الدین القیم فلا تبتغ غیر الاسلام دینا۔ (یہ دین
قویم ہے۔ لہذا تم کو چاہئے۔ کہ سوائے اسلام کے کسی اور دین و مذہب کی تبعیت نہ کرو)

پانچواں مقدمہ

اگلے انبیاء علیہم السلام نے جو ان اسرار کے بیان میں اہتمام نہ فرمایا جن کو ہمارے رسولؐ
نے بیان کیا۔ اور ان تحقیقات جدیدہ کے مطالب کی طرف اپنے اقوال میں اشارہ نہ فرمایا۔ تو
سبب اس کا یہ ہے۔ کہ اصل غرض انبیاءؑ و اوصیاءؑ کے مقرر کرنے اور کتابوں کے نازل کرنے کی
یہ ہے۔ کہ بندگان خدا کو عبادت پروردگار عالم کی طرف ہدایت ہو۔ وہ اپنے اعمال خالصۃً لوجہ اللہ
بجا لائیں۔ اور مکروہ و ناپسندیدہ افعال کو ترک کریں۔ تاکہ نظام عالم میں خلل نہ پڑے۔ حفظ النفس
و نوع انسانی و کمال نفوس و صفاء قلوب باقی رہے۔ اور لوگ بارگاہ احدیت عزشانہ میں حاضر
ہونے کے لئے آمادہ و مہیا ہو جائیں۔ (اس وجہ سے انبیاء و رسل علیہم السلام کو جائز نہیں ہے۔
کہ ان امور میں جو مفید عبادات و معرفت ہوں خلل ڈالیں۔ کیونکہ یہی اُن کا وظیفہ ہے)

رہا یہ امر کہ عامہ ناس کو معاش کے وسائل بتانا دنیاوی امور کی تکمیل اور اُس کے
تجملات سکھانے۔ نیز ایسے علوم سکھانے۔ جو عقل و حس کی مدد سے حاصل ہوتے۔
اور بیان کئے جاتے ہیں۔ (مثلاً علم حساب۔ علم ہندسہ۔ علم طب وغیرہ کے) تو یہ انبیاء
کے وظیفے سے خارج ہے۔ (اُن کا فرض نہیں۔ کہ نماز روزہ وغیرہ سکھاتے ہوئے علم
نجوم و ہیئت کی بھی تعلیم کریں)۔ ہاں اگر وہ ان علوم میں سے کسی کو خود بیان فرما دیں۔ تو اُن کا
احسان و تفضل ہے۔ مگر اُسی قدر جو عامہ ناس کے لئے مناسب ہو۔ اُن کے حال کے موافق
ہو۔ کوئی مانع بھی بیان کا نہ ہو۔ خود انبیاء علیہم السلام پر اُن چیزوں کے بیان سے کوئی نقص یا عیب
نہ عائد ہوتا ہو۔ اور نہ اُن کے اصلی مقصد کے خلاف ہو)

مَیں نے جو اس امر کو بیان کیا ہے۔ تنہا میری ہی رائے نہیں ہے۔ بلکہ ہر حکیم عاقل متبحر
کی یہی رائے ہے۔ دیکھئے رسالہ مقتطف صفحہ ۵۴۷ سنہ ۱۳۱۴ھ۔ وہ کیا لکھتا ہے؟ ہم کئی مرتبہ کہ
چکے ہیں۔ کہ آسمانی کتاب کے نازل ہونے کی غرض اصلی یہ نہیں ہے۔ کہ وہ امور طبعیہ کی

تعلیم کرے۔ یا اُس کا رد کرے۔ پس اگر کسی موقع پر اُس کا بیان موافق یا مخالف علم سائنس کے ہو۔ تو وہ موافقت و مخالفت عرضی (غیر اصلی) سمجھی جائیگی (نہ یہ کہ بالقصد خدائے تعالے نے اُن علوم کے موافق یا مخالف اپنے بیان کو پیش کیا ہے) جس طرح ہمارے روزانہ کے معاملات ہیں۔ کہ کبھی علوم طبعیہ کے موافق ہوجاتے ہیں۔ اور کبھی مخالف (مگر ہمارا مقصود نہ موافقت ہوتا ہے نہ مخالفت بلکہ خود بخود ایسا اتفاق واقع ہوجاتا ہے)۔ اور رسالہ مشہد الکائنات ایک سائل کا جواب دیتے ہوئے (جبکہ اُس نے پوچھا ہے۔ کہ حضرت موسےؑ نے کیوں نہ ان علوم جدیدہ و تحقیقات حادثہ کو بیان کیا) لکھتا ہے۔ کہ نبی کا صرف یہ فرض تھا۔ کہ انسانی تاریخ بیان کردے۔ اسی وجہ سے حضرت موسےؑ نے مجملاً کیفیت خلقت زمین و آسمان بیان فرمادی ہے +

مَیں کہتا ہوں۔ کہ ہمارے رسولؐ اور اُن کے اوصیاء کرامؑ نے جو اسلامی شریعت کی زبانِ گویا تھے۔ علوم مفیدہ کے اکثر مبادی کو اور حکماء کے اکثر کشفیات کو بیان فرمایا ہے۔ مگر اُن میں سے کتابوں میں بہت کم نقل ہؤا ہے۔ اور جس قدر ہم تک پہنچا ہے۔ وہ اور بھی کم ہے۔ لیکن باوجود اس کمی کے بھی اس قدر ہے۔ کہ دریاؤں کے قطرات سے زیادہ اور بجلی کی گرج سے بہت زیادہ بلند آوازہ ہے۔ اور یہ کمی ہمارے ان اولیاء اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ بلکہ اُس زمانے کے لوگوں کا قصور یا تقصیر ہے (جن کا یہ فرض تھا۔ کہ جو کچھ وہ حضرات بیان کرتے ہیں۔ اُسے قلمبند کرتے جائیں)۔ کیونکہ بڑی مصیبت یہ تھی۔ کہ یہ بزرگوار ایسے زمانے میں تھے۔ جن میں بالکل جہالت ہی جہالت تھی۔ علم کی قدر اُس زمانے کے لوگوں کو کہاں تھی۔ اور کمالات کی قدر وہ کب جانتے تھے۔ بلکہ بعضوں کے دل تو پتھر سے بھی زیادہ سخت تھے +

اگر یہ دین جاہلیت عرب کے زمانے کے علاوہ معرفت و علم کے زمانے میں ظاہر ہوا ہوتا۔ تو آپ دیکھتے۔ کہ لوگ اس مذہب کے انوار و علوم سے کس قدر مستفید ہوتے۔ اور عالم میں کیسی روشنی پھیلتی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اسلامی علماء و حاملین روایات و علوم اکثر ایرانی ہوئے ہیں (جہاں پہلے سے بھی علم کی روشنی تھی)۔ جیسا کہ مورخ کامل جارجی زیدان وغیرہ نے تصریح سے بیان کیا ہے +

میرا مطلب اس بیان سے یہ ہے۔ کہ اسلامی شریعت اور اولیاء شریعت نے تو امت کے واسطے ما یحتاج سے کہیں زیادہ علوم و کمالات کو ظاہر فرمادیا تھا۔ مگر خود امت کا یہ قصور

ہے۔ کہ اُس نے کما ینبغی محفوظ نہ رکھا جس کی وجہ سے بہت کم باقی رہ گیا۔ اور زیادہ حصہ تلف ہو گیا۔ لیکن یہ تھوڑا بھی بہت ہے۔ (قلیلک لا یقال لہ قلیل)۔

چھٹا مقدمہ

اِس مقدمہ کی غرض یہ ہے۔ کہ ظاہر کر دیا جائے۔ کہ علم ہیئۃ میں قدماء و متاخرین نے کہاں کہاں اتفاق کیا ہے۔ اور کن کن امور میں اختلاف۔

اِس قدر تو تمام علم ہیئت جاننے والوں کے نزدیک مسلم ہے۔ اور نیز عام ناس بھی مانتے ہیں۔ کہ اجرام سماویہ موجود ہیں۔ آفتاب ماہتاب اور دیگر ستارے ایک شبانہ روز میں کبھی طلوع کرتے ہیں کبھی غروب کرتے ہیں۔ چاند کی مختلف صورتیں ہوتی رہتی ہیں۔ نیز اُس کے دیگر حالات گہن وغیرہ کو بھی سب ہی تسلیم کرتے ہیں۔ آفتاب کے بُعد و قرب کو سال میں ایک مرتبہ شمالی و جنوبی حصہ زمین سے بھی سب مانتے ہیں۔ اور نیز یہ بھی ہر شخص کے نزدیک مسلم الثبوت ہے۔ کہ ستاروں کے حالات عجیب قرب و بعد و اجتماع و افتراق سال کے مہینوں میں اور پھر اُن کا اپنے اپنے مقامات پر آ جانا بعد زمانہ معینہ تبدل پذیر ہوا کرتے ہیں۔ اور یہ اس قسم کے تغیرات محسوس ہیں۔ کہ کوئی حیوان بھی ان سے انکار نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ انسان۔

البتہ اختلاف اس امر میں ہے۔ کہ ان تغیرات کے اصلی اسباب کیا ہیں؟ اور اُن اسباب میں سے وہمی سبب کون ہے؟ اور حسی کون؟ مجازی کون ہے؟ اور حقیقی کون؟ اسی وجہ سے ہر زمانے میں حکماء مختلف الرائے ہوتے آئے ہیں۔ اور اپنے اپنے خیال و فہم کے بموجب ایک ایک مسلک اختیار کر لیا ہے۔ اور اپنا نظام اور ہیئۃ علیحدہ علیحدہ قائم کیا ہے۔ جن میں سے چھ رائیں اس وقت تک معلوم ہوئی ہیں۔ جو کتابوں میں منقول ہیں۔

(اوّل) وثیمراطیس حکیم کی ہیئۃ۔ (اور وہ نظام فلکی جسے اُس نے قائم کیا ہے) مجملاً اُس کا خلاصہ حسب بیان رسالہ مشہد الکائنات یہ ہے۔ کہ ا۔ فضا ہوا سے بھری ہوئی ہے۔
۲۔ تمام ستارے فضا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کوئی ستارہ کسی جسم (آسمان) میں جڑا ہوا نہیں ہے۔
۳۔ حرکت ان کی طبعی ہے بسبب جذب ہو کے۔ پس جس قدر کوئی ستارہ مرکز زمین سے قریب

ہوگا۔ اُسی قدر رفتار میں کم ہوگا۔ اور جس قدر دور ہوگا۔ اُسی قدر تیز رفتار ہوگا۔ جیسا کہ ہر اُس کُرّے کی حالت ہے۔ جو اپنے مرکز کے گرد گھومتا ہے۔ اسی وجہ سے اس حکیم نے بیان کیا ہے۔ کہ ثوابت ستارے بہ نسبت باقی ستاروں کے زیادہ تیز رفتار ہیں۔ اور زمین کے گرد تیزی سے ایک شب و روز میں گردش کرتے ہیں +

(دوم) بطلیموس مصنف کتاب مجسطی کی ہیئت جو حضرت عیسٰے کی ولادت سے ڈیڑھ سو برس پہلے گذرا ہے۔ اُس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ زمین ایک ساکن کرہ ہے۔ تمام کرات کے بیچوں بیچ میں واقع ہے۔ پانی اُس کے تین ربع کو چھپائے ہوئے ہے۔ اور مجموعہ کرۂ زمین و کرۂ آب کو ہوا محیط ہے۔ پھر ہوا کو کرۂ نار محیط ہے۔ نار کو فلک قمر۔ اس فلک میں سوائے چاند کے اور کوئی ستارہ نہیں ہے۔ پھر فلک قمر کو فلک عطارد محیط ہے۔ اُس سے اوپر فلک زہرہ ہے۔ پھر فلک شمس ہے۔ پھر فلک مریخ۔ پھر فلک مشتری۔ پھر فلک زحل ہے ہر ایک نیچے کا آسمان اوپر والے آسمان سے گھرا ہوا ہے۔ ان تمام آسمانوں میں سوائے ایک ایک ستارے کے اور کچھ نہیں ہے۔ جس کے نام سے وہ فلک معروف ہے۔ پھر فلک زحل کو آٹھواں آسمان محیط ہے۔ جس میں یہ تمام ثوابت ستارے ہیں۔ اور فلک ثوابت کو نواں آسمان محیط ہے۔ جس کا نام فلک اطلس ہے۔ اُس میں کوئی ستارہ نہیں۔ اور نہ اُس کی دبازت کی کوئی انتہا ہے۔ پھر آسمان فضائے عالم کو بھرے ہوئے ہے۔ اس کے اوپر کے حصے کا حال سوائے خدا کے کسی کو معلوم نہیں۔ یہ آسمان ایک شبانہ روز میں مع بقیہ آسمانوں کے جو اُس کے اندر ہیں دورہ پورا کر لیتا ہے۔ (دیکھو نقشۂ اول) اور علاوہ ثوابت ستاروں کے جتنے سیارے ہیں۔ اُن کی خاص خاص حرکتیں ہیں۔ جیسے وہ اپنے فلک کی حرکت کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی حرکتیں فلک اطلس کی حرکت کے مخالف جانب میں ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے ان ستاروں کو سیارات سبعہ کہتے ہیں۔ ان کی حرکتیں آپس میں بہت مختلف ہیں۔ (مثلاً کوئی ایک مہینے میں دورہ پورا کرتا ہے۔ جیسے چاند۔ اور کوئی ایک سال میں جیسے آفتاب۔ اور کوئی اس سے بھی زیادہ زمانہ میں جیسے مشتری و مریخ وغیرہ) نیز یہ کہ ان افلاک میں سے ہر فلک میں چھوٹے چھوٹے فلک اور بھی پائے جاتے ہیں۔ جس کی تفصیل ہیں قدما نے اپنی کتابیں لکھی ہیں۔ اور ہم بھی ان میں سے بعض بعض خیالات و مطالب کو ضمن مسائل میں آئندہ اس رسالہ میں ذکر کرینگے +

سنہ ۱۵۰۰ع تک یہ بطلیموسی نظام و ہیئت نہایت اچھی ترتیب و انتظام پر تھے۔ اگر اس کے معارض مخالف جدید تحقیقیں نہ پیدا ہو جاتیں۔ جنھوں نے اس اگلے نظام و اقوال کو بالکل ہی باطل کر دیا۔

جب سے ان کا ظہور ہوا ہے۔ اور فلاسفران حال نے انہیں تہ دل سے قبول کرلیا ہے۔ جس کی وجہ سے بالفعل تمام عالم متمدن میں انہیں جدید تحقیقات کے ماننے والے بھر گئے ہیں۔ اس بطلیموسی ہیئت کو ہم آئندہ ہیئۃ قدیمہ کے نام سے نامزد کرینگے +

(سوم) مصریوں کی ہیئۃ جو بطلیموسی ہیئت کے بالکل مخالف ہے۔ یہ لوگ عطارد و زہرہ کو آفتاب کے دو چاند بتاتے ہیں۔ اور آفتاب کی بابت کہتے ہیں۔ کہ باقی اجرام فلکیہ کے ساتھ زمین کے گرد حرکت کرتا ہے۔ جیسا فانڈیک نے نقل کیا ہے +

(چہارم) تیخو براہہ ڈنمارکی متوفی ۱۶۰۱ء کی ہیئت۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ زمین بیچ میں ساکن ہے۔ جیسا کہ بطلیموس کا خیال ہے۔ چاند زمین کے گرد حرکت کرتا ہے۔ اور باقی سیارات مثل چاند کے ہیں۔ جو آفتاب کے گرد حرکت کرتے ہیں۔ اور خود آفتاب مع ان تمام سیارات کے زمین کے گرد حرکت کرتا ہے۔ جیسا کہ فانڈیک نے نقل کیا ہے نیز دائرۃ المعارف میں بھی اسی طرح لکھتے ہیں۔ اس نظام کا قائل "لیکومنٹانوس" حکیم بھی ہے۔ مگر یہ کہ یہ حکیم حرکت زمین کا قائل ہے +

(پنجم) فیثاغورس یونانی کی ہیئت (جس کی ولادت شہر ساموس میں ۵۹۰ برس قبل مسیح کے ہوئی تھی)۔ اس کا خلاصہ بنا بر بیان تقویم المؤید ۱۳۱۹ھ کے یہ ہے۔ کہ از بسکہ عالم کا عمدہ سے عمدہ مقام عمدہ سے عمدہ عنصر کے لئے ہونا چاہئے۔ اور مرکز و محیط دونوں اشرف مقامات ہیں۔ لہذا عنصر ناری ان دونوں ہی میں ہے۔ جرم نار تو مرکز میں ہے۔ جس کے گرد باقی دس اجرام الیہ حرکت کرتے ہیں۔ اور یہ سب ثوابت ہیں۔ پھر سبع سیارات کا درجہ ہے۔ اُس کے بعد کرۂ زمین۔ بعد کرۂ قمر کے نواں کرہ ہے۔ اُس کے بعد وہ خیالی ستارے ہیں۔ جنہیں فیثاغورسیوں نے خیال کیا ہے۔ وہ اس نظام عالم کے مکمل ہیں۔ اس بنا پر کرۂ زمین گرد کرۂ نار مرکزیہ کے دائرۂ مائلہ پر حرکت کرتا ہے۔ بعد ازاں زمین آپ اپنے مرکز کے گرد ایک خط وھمی پر حرکت کرتی ہے۔ جو اُس کے دونوں قطبوں کے درمیان واقع ہے۔ اسی دورہ سے رات اور دن پیدا ہوتے ہیں۔ مگر (ارشارک) حکیم نے جو فیثاغورس کے تابعین میں سے ہے۔ اتنا تغیر دیا کہ نار محیط کوئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک فضا ہے۔ جس کی کوئی انتہا نہیں۔ اور نار مرکزی کی اُسی آفتاب سے تعبیر کی۔ اسی سبب سے یہ نظام جدید علم ہیئۃ کے نظام سے بہ نسبت اور رایوں کے یک گونہ قریب ہے +

(ششم) فلاسفران یورپ کی ہیئت جنھوں نے مسلمانوں کی ترقی کے بعد

اپنی علمی ترقی میں کوشش کی ہے۔ اسی وجہ سے اس ہیئۃ کا نام نظام حادث۔ ہیئۃ عصریہ۔ ہیئۃ غربیہ یا ہیئۃ جدیدہ وغیرہ ہے۔ اور چونکہ اس علم ہیئت کی بنیاد یہ ہے۔ کہ زمین حرکت کرتی اور دیگر سیارات بھی آفتاب کے گرد بحرکت وضعیہ و انتقالیہ گردش کرتے ہیں۔ جسے سب سے پہلے کوپرنیک پروسی متوفی ۱۵۴۳ء نے قبل ایک ہزار ہجری کے برہان سے ثابت کیا ہے۔ اس وجہ سے اس ہیئت کی نسبت کوپرنیک فلاسفر کی طرف کی جاتی ہے۔ حالانکہ اُس کے وقت میں اور بہت سی جدید تحقیقاتیں جو اب ہو رہی ہیں معلوم نہ ہوئی تھیں۔ بلکہ اُس کے اکثر اقوال کے قائل اُس سے سابق کے حکماے یونان و فرس ہو چکے ہیں لیکن اسی کا نام کیوں لیا جاتا ہے؟ اس کا سبب یہ ہے۔ کہ اُن مطالب پر دلائل اسی نے قائم کئے۔ اور اُن کی زیادہ وضاحت اسی نے کی۔ اس کے بعد دیگر فلسفیوں نے کم کم اس کی تبعیت کی۔ لہذا وہی اس کی ہیئت جدیدہ کا موسس قرار دیا گیا۔ اور اس کی رائے بڑے زور شور سے مشہور ہوئی۔ مگر اس سے اتنی غلطی ہو گئی ہے۔ کہ اس نے سیارات کے مدارات (وہ دوائر جن پر سیارے حرکت کرتے ہیں) کو پرکاری یعنی دوائر حقیقیہ تسلیم کیا ہے۔ اور اس امر میں اُس نے قدما کی تبعیت کی ہے۔

مگر کیپلر حکیم جرمن نے ۱۶۲۵ء میں جب سے یہ تحقیق کی۔ کہ یہ سیارات آپس میں ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ اور دوائر سیارات کے بیضوی یا اہلیلجی ہیں۔ تب سے تمام حساب اور رصدیں درست ہو گئیں۔ باایں ہمہ بھی اس ہیئت کو چنداں فروغ نہ ہوا تھا۔ لیکن جس وقت سے غالیلو حکیم ایطالین کا ظہور ہوا۔ اور اُس نے نئی نئی خوردبینیں اور دوربینیں بنائیں۔ اور اُن کے ذریعے سے اور آلات تیار کئے۔ تب سے اس فن کی بنیاد مستحکم ہو گئی۔ اور اسرار مخفیہ اس علم کے ظاہر ہوئے۔ لوگوں نے اپنے اصول جدیدہ کو محسوس طور پر دیکھ لیا۔ اور عام طور پر اس فن کو درجہ کمال پر پہنچانے کا شوق ہر ملک میں پیدا ہوا۔ یہاں تک کہ اب اس حد پر پہنچ گئے جسے دیکھ کر عقلیں حیران رہ جاتی ہیں۔

یہاں اس قدر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ مختصر طور پر ہیئت جدیدہ کے چند مسائل بیان کردوں جس سے ناظرین کو آئندہ آسانی ہو جائے۔ اور وہ ذیل میں مندرج ہیں:-

آفتاب ان لوگوں کی رائے کے بموجب ایک کرہ نورانی بذاتہ ہے۔ ناری بذاتہ ہے۔ تمام سیارات کے افلاک کے بیچوں بیچ میں اس طرح قائم ہے۔ جیسے انڈے کے اندر زردی۔ باقی سیارات بھی

کرّات ہیں۔ مگر وہ آفتاب کی روشنی سے روشن ہیں۔ آفتاب ان کو اپنی طرف جذب کئے ہوئے
ہے۔ اور یہ اُس کے گرد بھی حرکت کرتے ہیں۔ اور خود اپنے مرکز کے گرد بھی۔ جیسے ہماری یہ زمین
اور یہ سب ستارے فضا میں معلّق ہیں۔ ان تمام سیارات میں پہاڑ۔ دریا اور ہوا ہے۔ ان سیارات
میں بہ نسبت اوروں کے ستارہ (فلکان) قریب تر ہے۔ جس کا بعد آفتاب سے ۱۳ ملین میل ہے۔
اور اس کا دورہ محوری ۱۸ گھنٹہ میں پورا ہوتا ہے۔ اور آفتاب کے گرد اس کا دورہ بیس دن میں
کامل ہوتا ہے۔ (لیکن اب تک اس ستارے کے پورے حالات نامعلوم ہیں۔ کیونکہ رصد اس کی
دشوار ہے + فلکان کے بعد عطارد ہے۔ جس کا بعد آفتاب سے ۳۵ ملین میل ہے۔ دورِ محوری
اس کا ۲۴ گھنٹہ ۵ منٹ میں پورا ہوتا ہے۔ اور آفتاب کے گرد اس کی حرکت ۸۸ دن میں پوری
ہوتی ہے۔ حجم اس کا زمین سے ۱۶ حصہ چھوٹا ہے۔ اس کا فلک (وہ دائرہ جس پر اسے حرکت
ہے) دائرۃ البروج پر کسی قدر جھکا ہوا ہے۔ اس[۹] کے بعد زہرہ ہے۔ جس کا بُعد آفتاب سے
۶۷ ملین میل ہے۔ اور دورِ محوری (اپنے مرکز کے گرد حرکت کرنا) اس کا ۲۳ گھنٹہ ۲۲ منٹ میں۔
اور آفتاب کے گرد ۲۲۵ دن میں پورا ہوتا ہے۔ اس کا حجم زمین سے ایسا ہے۔ جیسے ۹۔ اور
۱۰ میں نسبت ہے۔ اس کے فلک کا میل۔ ۵ درجہ ہے + اس[۱۰] کے بعد زمین ہے۔ جس کا بعد
آفتاب سے ۹۳ ملین میل ہے۔ قطر اس کا ۸۰۰۰ میل کا ہے۔ دورِ محوری اس کا ۲۴ گھنٹہ
میں اور گرد آفتاب ۳۶۵ دن میں پورا ہوتا ہے۔ اس کے فلک کا میل ۲۳ درجہ ۳۰ دقیقہ
ہے + اس[۱۱] کے بعد مریخ ہے۔ جس کا بعد آفتاب سے ۱۴۰ ملین میل ہے۔ دورِ محوری اس کا
۲۴ گھنٹہ ۳۸ منٹ میں ہوتا ہے۔ اور آفتاب کے گرد ۶۸۷ دن میں۔ حجم اس کا زمین سے
چھ حصے چھوٹا ہے۔ اس سیارے کے دو چاند ہیں۔ اور میل اس کے فلک کا ۲۹ درجہ ہے +
پھر[۱۲] مشتری ہے جس کا بُعد آفتاب سے ۴۷۶ ملین میل ہے حجم اس کا زمین سے ۱۴۰۰ حصہ بڑا ہے۔ دورِ محوری
اس کا دس گھنٹہ میں اور آفتاب کے گرد ۱۲ برس میں پورا ہوتا ہے۔ اس سیارے کے آٹھ چاند ہیں۔ اس کے فلک کا
میل ۴ درجہ ہے + پھر[۱۳] زحل ہے جس کا بُعد آفتاب سے ۸۷۶ ملین میل ہے۔ اور اس کا حجم زمین سے ۷۶۰ گنا بڑا
ہے۔ اور اس کے فلک کا میل ۲۸ درجہ ہے۔ دورِ محوری اس کا ۱۰ گھنٹہ ۱۵ منٹ میں اور آفتاب کے گرد ۲۹ برس
میں دورہ کرتا ہے۔ اس سیارے کے نو چاند ہیں۔ اور ایک اور بڑا حلقہ ہے۔ جو تین حلقوں
سے مرکب ہے۔ اور اسے مثل کمربند کے چاروں طرف سے محیط ہے + اس[۱۴] کے بعد ستارہ ارانوس ہے۔
جو آفتاب سے ۱۷۵۳ ملین میل کے فاصلہ پہ ہے۔ حجم اس کا زمین سے ۷۲ حصہ بڑا ہے۔ اس کا

دورمحوری [illegible] قریباً دس گھنٹہ میں ہوتا ہے۔ اور آفتاب کے گرد ۸۴ برس ایک ہفتہ میں۔ اور اس کے چھ چاند ہیں۔ پہلے پہل اس ستارے کا حال حکیم ہرشل نے ۱۷۸۱ء میں دریافت کیا + اس کے بعد ستارہ نبتون ہے۔ جس کا فاصلہ آفتاب سے ۲۷۴۶۵ ملین میل ہے۔ اس کا جرم زمین سے ۸۴ حصہ بڑا ہے۔ دورمحوری اس کا اب تک معلوم نہیں ہوا۔ آفتاب کے گرد اس کی حرکت ۱۶۴ برس ۲۸۵ دن میں ہوتی ہے +

اس بیان میں جس قدر تعیین و تقدیر مقدرات کی گئی ہے۔ وہ تقریبی ہے۔ تحقیقی نہیں ہے۔ اس مجموعی نظام کا نام نظام شمسی ہے۔ جو تابع ہے قانون جذب اور قانون فطرت کے بمشیت باری تعالیٰ +

ان اجرام کی حرکت عموماً مغرب سے مشرق کی طرف مدارات بیضویہ پر ہوتی ہے۔ جو فضاء میں فرض کئے گئے ہیں۔ (دیکھو نقشہ نمبر ۲) +

درمیان مدار مریخ اور مدار مشتری کے چند چھوٹے ستارے بھی ہیں جن کا بیان آئندہ ہوگا۔ اور فلک نبتون کے بعد جو فضاء ہے۔ اس کی حقیقت ابھی تک معلوم نہیں ہوئی۔ اس فضاء میں ایک معین معین مقدار کے فاصلہ پر بہت سے آفتاب غیر متحرک ہیں۔ جن کا نظام مثل ہمارے اسی نظام شمسی کے ہے۔ فسبحان رب العالمین +

اب میں اس مختصر کو چند مسائل کے ذیل میں مفصل عرض کرتا ہوں +

پہلا مسئلہ

فلک کی حقیقت اور اُس کے معنی کے بیان میں

مسئلہ اولے

(صورت سوال) قدیم علم ہیئت کی بنا بڑے بڑے افلاک کے وجود پر ہے۔ جن کے اعداد و اوصاف کے بیان میں متقدمین نے بڑے زور لگائے ہیں۔ اور اُن کی حیرت خیز ترتیبیں بیان کر کے عقلوں کو متحیر کرتے رہے ہیں۔ مگر جس وقت سے کہ جدید علم ہیئت کا آفتاب مغربی بلاد کے مشرق سے طالع ہوا۔ اُس نے قدیم علم ہیئت کی روشنی بالکل خاموش کر دی۔ اُس کے احکام باطل ثابت کر دئے۔ اُس کی ترتیب لغو ظاہر کر کے دکھلا دی۔ اب نہ وہ آسمان

رہے ہے۔ نہ وہ ترتیب رہی۔ اور نہ وہ گردش۔ بلکہ یہ تمام باتیں مثل خواب اطفال کے بے معنی ولغوثابت ہورہی ہیں۔ (کیونکہ تجربات نظریہ اور آلات رصدیہ نے اچھی طرح بتادیا ہے۔ کہ قدیم حکما جس طرح کے گول اور موٹے موٹے آسمانوں کے وجود کے قائل تھے۔ وہ کوئی شے نہیں ہے محض خیالی پلاؤ ہے +

خیر یہاں تک تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔ کہ ایک فلسفی خیال کو دوسرے فلسفی خیال نے باطل ثابت کردیا۔ مگر یہ بتائیے۔ کہ اسلامی شریعت جو وجود افلاک کی قائل ہے۔ اُس کے کیا معنی ہیں۔ دلیلوں سے تو ثابت ہوگیا ہے۔ کہ آسمان کوئی شے نہیں ہے۔ پھر شریعت کا قول دربارہ وجود افلاک کس معنی پر محمول ہوگا۔ اور اُس سے کیا مطلب سمجھا جائے؟

الجواب

اگلے حکماء یونان وغیرہم کی یہ رائے تھی۔ کہ خود زمین کو اور نیز جو کچھ اُس کے گرد و پیش ہے از قسم عنصر و عنصریات۔ اُسے ایک بڑا عظیم الشان جسم کروی آسمانی جسے ہمیشہ حرکت ہے اور جس کے صفات شیخ رئیس ابوعلی بن سینا کے بیان کے مطابق حسب ذیل ہیں محیط ہے۔ شیخ نے شفا میں لکھا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے۔ کہ "فلک ایک جسم کروی بسیط اور شفاف ہے۔ جس میں صرف مبدء میل مستدیر ہے۔ (یعنی ہمیشہ دوری حرکت کرتا ہے۔ حرکت مستقیمہ نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اُس کی طبیعت کے خلاف ہے)۔ نہ تو وہ پھٹ سکتا ہے۔ اور نہ پھٹ کر جوڑا جا سکتا ہے۔ نہ اُس میں کون و فساد کے تغیرات ہو سکتے ہیں۔ اور نہ وہ اپنی حیز (مکان اصلی) سے کبھی ہٹ سکتا ہے۔ نہ اُس میں خود تضاد ہے۔ نہ اُس کا کوئی اور مضاد ہے۔ نہ اُس کے لئے سکون ہے۔ اور نہ اُس کے صفات میں کوئی تغیر۔ علےٰ ہذا القیاس وہ اجرام (اجسام) جو اُس میں جڑے ہوئے ہیں۔ اُن کی بھی یہی حالت ہے۔ جیسے آفتاب ماہتاب اور دیگر ستارے کہ یہ بھی کروی الجسم ہیں۔ ان کا جوہر ترکیبی بھی وہی ہے۔ جو خود فلک کا ہے۔ تغیرات کون و فساد سے بالکل مبرا ہیں" +

نیز قدماء حکماء نے افلاک کی حرکت کو حرکت نفسیہ لعشق و ارادہ بیان کیا ہے۔ اور یہ ثابت کیا ہے۔ کہ ان اجرام فلکیہ میں حیات روحی موجود ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ "فلک" ایک حیوان کامل ہے۔ مگر ایسا حیوان جس کی نہ دُم ہے نہ سر۔ نہ اُسے اشتہا ہے نہ غضب۔ علاوہ اس کے

اور بہت سے صفات مقدسہ اس کے لئے بیان کئے ہیں ۔

مگر نبی اسلام اور اُن کے اوصیائے علیہم السلام نے حکمائے سابقین کی رائے سے اس باب میں بالکل مخالفت کی ہے۔ اور کھلم کھلا اُن کی تکذیب فرمائی ہے۔ اُن کی غلطیاں دکھلا کر تبعیت سے اُن لوگوں کو منع فرمایا ہے۔ جیسا کہ "ابو بصیر" والی حدیث سے جو ارشاد شیخ مفید علیہ الرحمہ میں مذکور ہے ثابت ہوتا ہے۔ ابو بصیر نے چھٹے امام جناب جعفر بن محمد (صادق) علیہ السلام سے عرض کی۔ کہ "لوگ کہتے ہیں (یعنی حکمائے یونان)۔ کہ فلک میں جب (کسی قسم کا) تغیر ہوگا۔ تو وہ خراب و فاسد ہو جائیگا۔ (مطلب یہ ہے۔ کہ فلک میں تغیرات و کون و فساد نہیں)۔ آپ نے فرمایا "یہ تو زندیقوں (کافروں) کا قول ہے۔ مسلمان ایسی بات کے قائل نہیں ہو سکتے"۔ (اس ارشاد سے صاف ثابت ہے۔ کہ معصوم علیہ السلام کی رائے حکما کی رائے کے بالکل مخالف ہے)۔

لیکن شریعت نے حکما کی مخالفت نفس فلک اور اُس کے نام میں نہیں کی ہے۔ (بلکہ جس طرح فلک کو فلک وہ کہتے تھے۔ اسی طرح شریعت بھی فلک کہتی ہے۔ جس طرح وہ وجود فلک کے قائل تھے۔ شریعت بھی وجود کی قائل ہے)۔ البتہ مخالفت اس امر میں کی ہے۔ کہ آیا فلک اور اُس کے لوازمات ذاتیہ ویسے ہی ہیں۔ جیسے حکما نے بیان کئے ہیں۔ یا اُس کے غیر۔

آپ کو یہ خیال نہ ہو۔ کہ اسلامی شریعت ہی نے حکمائے سابقین کی مخالفت کی ہے۔ بلکہ آپس میں بھی ان لوگوں نے سخت اختلاف کیا ہے۔ اعدادِ افلاک۔ اوضاعِ افلاک۔ نظاماتِ افلاک وغیرہ سب ہی امور میں ان کے اختلاف موجود ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ لوگ علم ہیئت کے مسائل کو اچھی طرح صاف نہ کر سکے۔ اور نہ اُس کی مشکلات کو حل کر سکے۔ اور جب کبھی ان پر کوئی مشکل حرکات مرکبہ کی وجہ سے پیش آتی تھی۔ تو ایک دو فلک کے وجود کے قائل ہو جاتے تھے۔ تاکہ مخالف حرکات کی بنیاد کو محکم کر سکیں۔ آخر نتیجہ یہ ہوا۔ کہ بڑے بڑے افلاک کو چھوٹے چھوٹے افلاک سے ان لوگوں نے بھر دیا۔ اور ہر فلک کلی کے واسطے چند فلک جزئی کے قائل ہوئے۔ مثلاً ممثل۔ حامل۔ تدویر۔ مائل وغیرہ۔ (حکمائے سابقین کا یہ خیال ہے۔ کہ ہر بڑے فلک میں چھوٹے چھوٹے کئی آسمان اور بھی ہیں۔ مثلاً فلک شمس میں۔ ایک تو خود وہ فلک ہے۔ اور اُس کے اندر ایک ممثل بھی ہے۔ فلک زہرہ میں ایک ممثل۔ ایک تدویر۔ اور ایک حامل تدویر بھی ہے۔ فلک قمر میں ممثل۔ مائل۔ حامل۔ تدویر وغیرہ بھی ہیں)۔ یہاں تک کہ اوذکیوس حکیم چھبیس آسمانوں کا قائل تھا۔ کالیوس تینتیس آسمانوں کا۔ اور جمنطانوس تینتیس

فلک کا۔ ارسطو، ۸ فلک کا۔ فیثاغورث ۷ فلکوں کا قائل تھا۔ فاضل خفری نے
اپنی آسمانوں تک اضافہ کیا ہے۔ اور پھر ایک آسمان کی عجیب و غریب صورتیں بیان کی ہیں۔
جن کی وجہ سے اُن کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جن کے حل کرنے سے وہ خود بھی عاجز
ہیں۔ اور اپنے عجز کا اقرار کیا ہے۔ مگر باوجود اس اختلاف عظیم کے اعداد و صفات میں اصل
وجود فلک کے کسی نے اختلاف نہیں کیا +

البتہ مَیں نے "مشہد الکائنات" کے حاشیہ صفحہ پر یہ لکھا دیکھا ہے۔ کہ "ذیمقراطیس
نے جسم فلکی کے وجود سے انکار کیا ہے۔ اور وہ اس امر کا قائل ہے۔ کہ ستارے فضاء
میں خود حرکت کرتے ہیں" +

باقی رہی ہیئت جدیدہ اور اُس کے ماننے والے۔ وہ اس بات کے قائل ہیں۔ کہ
جسم فلکی کوئی شے نہیں ہے۔ نہ اُس کی کوئی حقیقت خاصہ ہے۔ چہ جائیکہ اُس میں وہ اوصاف
ہوں۔ جنہیں سابقین کہتے تھے۔ اور اس انکار کی وجہ سے کوئی خلاف اُن کے قواعد میں بھی
نہ پڑا۔ نہ رصد اُن کی ناقص رہی۔ بلکہ اسی انکار کی وجہ سے تمام قواعد درست ہو گئے۔ اور
نظام علم ہیئت مستحکم ہو گیا +

اب یہ لوگ فلک اُن مدارات فرضیہ (خیالی دائرے) کو کہتے ہیں۔ جن پر سیارات کی
گردش ہوتی ہے۔ کیونکہ جو جسم کسی فضا میں ہمیشہ ایک طرح پر حرکت کریگا۔ تولامحالہ خیال اُس
کی گردش کی ایک راہ فرض کریگا۔ (جیسے شعلہ جوالہ کی وجہ سے ایک دائرہ خیالیہ پیدا ہو جاتا
ہے۔ اگرچہ وہ حقیقت میں کچھ نہیں ہے۔ مگر چونکہ بار بار وہ شعلہ اُسی راہ سے آیا گیا ہے۔
اس وجہ سے ایک دائرہ کی صورت موہوم ہونے لگی ہے)۔ اُسی راہ اور اُسی دائرۂ فرضیہ کو یہ
لوگ فلک کہتے ہیں۔ یہ فلک کچھ آفتاب ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ ایسا فلک
تو زمین کے لئے بھی ہے۔ ابر کے لئے بھی ہے۔ شہاب۔ رجوم اور اُن پتھروں کے لئے بھی
ہے۔ جو فضا میں ہیں۔ (ابر کے لئے فلک کا ہونا تیرھویں دلیل میں ثابت کیا جائیگا) +

اس مقام پر ایک عالم نے یہ اعتراض کیا تھا۔ کہ اگر ہم مطابق ہیئت جدیدہ کے
اس بات کے قائل ہو جائیں۔ کہ آفتاب ہی کے گرد دیگر سیارات کی حرکت ہوتی ہے۔ نیز یہ کہ
باقی ثوابت بجائے خود آفتاب ہیں۔ اور اسکو بھی مانتے ہیں۔ کہ سیارات سبعہ کے لئے علیحدہ
علیحدہ ایک ایک آسمان ہے۔ تو کیا ضرر ہے۔ رہا یہ امر کہ حکماء فرنگ کے نزدیک اُن کا وجود

ثابت نہیں ہے۔ تو اس سے کیا ہو سکتا ہے۔ اُن کے نزدیک ثابت نہ ہونے سے اصل عدم لازم نہیں آتا ✤

مَیں نے اُنہیں یہ جواب دیا۔ کہ اول تو علم ہیئت جدیدہ کے اکثر قواعد و احکام وجود افلاک کے مخالف ہیں۔ (پھر ہیئت جدیدہ کو صحیح ماننا اور آسمانوں کے وجود کا بھی قائل ہونا کیسے جمع ہو سکتا ہے) ۔ دیکھئے کہ زمین بھی حکمائے فرنگ کے نزدیک ایک سیارہ ہے۔ مگر کسی جسم فلکی کے اندر جڑی ہوئی نہیں ہے۔ پھر اس کو مستثنےٰ کرنے کی کیا وجہ ہوگی۔ دوسرے یہ کہ مذنبات وہ دمدار ستارے ہیں۔ جن کا آگے ذکر کیا جائیگا)۔ باقی سیارات کے مداروں کو اپنی آمد و رفت میں شق کرتے رہتے ہیں۔ پس اگر ہم قائل ہو جائیں کہ سیارات سبعہ ایک ایک جسم فلکی ضخیم و غلیظ کے اندر جڑے ہوئے ہیں۔ جن کی دبانت کئی کئی ملین فرسخ کی ہے۔ تو تمام انتظام حرکات سیارات کا بھی مختلف ہو جائیگا۔ اور مذنبات کے حرکات کے اندازوں میں بھی خلل پڑیگا۔ علاوہ اس کے خرق والتیام کا مسئلہ لازم آئیگا۔ جو وجود افلاک کے بالکل خلاف ہے۔ اور دیگر مفاسد بھی لازم آئینگے۔ جن کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے ✤

بالجملہ جب آپ نے قدما و متاخرین کی رائیں معلوم کرلیں۔ تو اب اسلامی شریعت کی رائے بھی معلوم کیجئے۔ ظواہر شرع کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں اس نے "فلک" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اُس سے مدار ستارہ اور گذرگاہ سیارہ ہی مراد لی ہے۔ مگر یہ مطلب ایک اور امر کے بیان پر موقوف ہے۔ وہ یہ کہ لفظ فلک (یا جو اس سے مشتق ہے) لغت عرب میں ایک گول چیز کو کہتے ہیں۔ قاموس (لغت کی کتاب ہے) وغیرہ میں ہے تفلک ثدی المرأة اذا استدار والفلك كل شيء مستدير و منه فلكة المغزل (یعنی جب عورت کے پستان گول ہو جاتے ہیں۔ اُس وقت کہتے ہیں۔ تفلک ثدی المرأة نیز فلک ہر مدوّر شے کو کہتے ہیں۔ اسی سے فلکۂ مغزل یعنی تکلے کا گتہ مشتق ہے) جب یہ ثابت ہو چکا۔ کہ فلک ہر مدوّر چیز کو کہتے ہیں۔ تو اب دیکھئے۔ کہ جس جس نے لفظ فلک کا استعمال کیا ہے۔ اُس نے مدوّر ہونا ضرور ملحوظ رکھا ہے۔ (مگر مدوّر ہونے سے یہ لازم نہیں ہے کہ ایک موٹا دبیز ضخیم لاکھوں فرسخ کے قطر کا ہی جسم ہو۔ بلکہ ممکن ہے۔ کہ مراد اُن کی وہی دائرہ ہو۔ جس پر سیارات کو گردش ہوتی ہے) ✤

شریعت کے کلمات اور اسلامی محدثین و اہل لغت کے اقوال پر غور کی نظر کرنے سے

بھی ثابت ہوتا ہے۔کہ ان لوگوں نے جہاں جہاں لفظ فلک استعمال کیا ہے۔اُس سے
مراد اُن کی وہی معنی ہیں۔جو آج کل کی تحقیق سے ثابت ہوا ہے۔یعنی کہ "فلک" کسی سیارہ
کے گذرگاہ اور اُس کی حرکت کے مفروض مدار کو کہتے ہیں۔جو فضا میں واقع ہے۔نہ وہ معنی قرار
دیتے ہیں۔جس کے قائل قدماء حکماء تھے +

رہا اس کا ثبوت۔کہ محدثین و اہل لغت فلک سے مراد مدارِ کوکب لیتے تھے (نہ جسم مدور
عظیم و ضخیم)۔تو دیکھئے۔کہ ابن اثیر اپنی کتاب نہایۃ (لغت احادیث) میں لکھتے ہیں۔
(الفلک مدار النجوم من السماء) فلک ستاروں کے مدار کو کہتے ہیں۔جو جانب فوق
میں واقع ہیں۔صاحب قاموس لکھتے ہیں۔(الفلک محرکۃ مدار النجوم) لفظ فلک
بحرکت فَ و لَ ستاروں کے گذرگاہ و مدار کو کہتے ہیں۔ضحاک نے لکھا ہے۔(ان الفلک
لیس بجسم وانما هو مدار هذه النجوم) "فلک" کوئی جسم (کروی)
نہیں ہے۔بلکہ انہیں ستاروں کے مدار کو "فلک" کہتے ہیں۔(اس سے زیادہ صریح کلام کیا
ہوگا) +

راغب اصبہانی نے اپنی کتاب مفردات میں لکھا ہے۔(الفلک مجری الکوکب)
فلک مجری کوکب یعنی گذرگاہ ستارہ کو کہتے ہیں۔ابن قتیبہ نے کہا ہے۔(الفلک مدار
النجوم الذی یضمہا)۔فلک ستاروں کے مدار کو کہتے ہیں۔جو اُن سیارات پر مشتمل ہے۔
کلبی سے منقول ہے۔(ان الفلک ماء مکفوف تجری فیہ الکواکب) فلک
اُس بستہ پانی کو کہتے ہیں جس میں سیارہ کی رفتار ہے۔(ماء مکفوف یعنی بستہ پانی کی شرح آئندہ
معلوم ہوگی۔جہاں حقیقت سیارات کی بحث ہوگی) +

ان محدثین و اہل لغت کے اقوال مذکورہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔کہ فی الحقیقت
یہ حضرات بھی اسی امر کے قائل تھے۔جس کے قائل حکماء متاخرین ہیں۔اور یہ امر اس وجہ
سے نہ تھا۔کہ حضرات محدثین کو ہیئت جدیدہ کا علم تھا۔کیونکہ ہیئت جدیدہ کا ظہور تو
ایک ہزار سنہ ہجری کے قریب قریب ہوا ہے۔(اور یہ بزرگوار اس سے بہت پہلے گزر
چکے ہیں)۔اور نہ اس وجہ سے تھا کہ ان کو واقعات خفیہ و اسرار غیبیہ پر اطلاع تھی۔کیونکہ
یہ لوگ انبیاؑ و اوصیاؑ کے سلسلہ میں نہ تھے۔بلکہ یہ رائے ان کی محض اس وجہ سے تھی۔
کہ اسلامی پیغمبر علیہ السلام اور اُن کے اوصیاؑ کے کلمات سے ایسا ہی کچھ ان کی سمجھ میں آیا

تھا۔ اور آزادانہ خیال کے موافق جو کچھ احادیث سے مستفاد ہوتا تھا۔ اُس کے قائل ہو گئے تھے۔ بخلاف اور دیگر حضرات کے جنہوں نے شریعت کو پرانے خیالات کے ساتھ ممزوج کر کے مختل کر دیا۔ اور اوہام پرستی میں قدماء کے قدم بقدم رہے۔ (پس جب کہ یہ محدثین و اہل لغت نبی اسلام اور اُن کے اوصیاء کرام کے اقوال سے یہ سمجھے۔ کہ فلک مدار کوکب کو کہتے ہیں۔ نہ کہ جسم کروی عظیم وضخیم کو۔ تو کوئی وجہ نہیں۔ کہ ان کی تغلیط کی جائے۔ اور اوہام پرستوں کی رائے مقدم سمجھی جائے۔ کیونکہ یہ محدثین قدماء علماء میں سے تھے۔ جو بسبب اپنے قرب زمانہ کے رسول ؐ وائمہ علیہم السلام سے زیادہ تر اُن کے اقوال پر مطلع اور اُن کے کلمات وارشادات کے سمجھنے والے تھے۔ لہٰذا ان کا بیان ایک طرح کی دلیل ضرور ہو سکتا ہے۔ انصاف شرط ہے) +

اب یہ بات کہ ظاہرا اقوال شریعت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ کہ فلک مدار کوکب کو کہتے ہیں جس پر سیارات کی حرکت ہے۔ اس کا ثبوت بہت سی دلیلوں سے ہوتا ہے۔ مگر میں یہاں صرف چودہ دلیلیں (بعدد چہاردہ معصومین علیہم السلام) بیان کرتا ہوں۔ اور اُنہیں پر قناعت :۔

پہلی دلیل

(**پہلی دلیل**) سورۂ یٰسین سے جو قرآن مجید کا ایک سورہ ہے۔ رہن واشجار واحجار وآفتاب و ماہتاب و منازل سماویہ کے بیان کے بعد خدائے تعالےٰ ارشاد فرماتا ہے۔ (کل فی فلک یسبحون) ہر ایک ان آفتاب و ماہتاب میں سے ایک ایک فلک میں تیرتے ہیں +

میں نے اس آیت سے چند لطیف امور استنباط کئے ہیں۔ (۱) یہ کہ اجرام سماویہ (بلندی کے اجسام مثل آفتاب و ماہتاب و زہرہ و مریخ وغیرہ کے) تیرتے اور فلک میں چلتے یعنی حرکت کرتے ہیں۔ جیسا کہ متاخرین حکماء یورپ کی رائے ہے۔ اور متقدمین کے بالکل خلاف ہے جن کی یہ رائے تھی۔ کہ یہ تمام اجرام مثل میخوں کے آسمانوں کی دبازت کے اندر جڑے ہوتے ہیں۔ اپنے مقام سے ہل نہیں سکتے۔ بلکہ اپنے افلاک کی حرکت کے ساتھ بہ تبعیت حرکت کرتے ہیں +

حالانکہ آیت قرآنی اس کے خلاف ظاہر فرما رہی ہے۔ (اور خود سیارات کی حرکت کی قائل رہی ہے) +

اس مطلب کا دبی زبان سے محقق فخرالدین رازی نے بھی اقرار کیا ہے۔ اور لکھا ہے۔ کہ ظاہر قرآن سے یہ سمجھ میں آتا ہے۔ کہ افلاک اپنی جگہ پہ قائم ہیں۔ اور سیارات اُن میں حرکت کرتے ہیں جس طرح مچھلی پانی میں تیرتی ہے +

(۲) یہ کہ اجرام سائرہ (سیارات) جو اپنے افلاک میں حرکت کرتے ہیں۔ وہ اُن مچھلیوں سے (گویا) مشابہت رکھتے ہیں۔ جو پانی میں تیرتی ہیں۔ کیونکہ آیت نے سیارات کی رفتار کو سباحت (تیرنے) سے تعبیر کیا ہے۔ (ہم اس مطلب کو دوسری دلیل میں توضیح سے بیان کرینگے) +

(۳) یہ بھی اس آیت نے بتایا (کل فی فلک) - کہ ہر سیارے کے لئے ایک ہی فلک ہے۔ جیساکہ حکماے ہیئت جدیدہ کی رائے ہے۔ کیونکہ لفظ "فلک" کی تنکیر سے یہ امر معلوم ہوتا ہے۔ تو گویا خدائے تعالےٰ کا یہ مقصود ہے۔ کہ کل فی فلک واحد یسبحون لا فی افلاک متعددہ یعنی ہر سیارہ کا ایک ہی فلک ہے۔ نہ بہت سے۔ (حالانکہ قدماء حکماء یونان قائل تھے۔ کہ یہ بڑے بڑے ساتوں آسمان چھوٹے چھوٹے بہت سے آسمانوں سے مملو ہیں) +

(۴) یہ بھی اس آیت سے سمجھ میں آیا۔ کہ زمین بھی متحرک ہے۔ کیونکہ اس آیت سے قبل پروردگار عالم نے زمین اور نباتات وغیرہ کا ذکر فرمایا ہے۔ اُس کے بعد ارشاد کیا ہے۔ (کل فی فلک یسبحون)۔ اور لفظ "کل" کو نکرہ فرمایا ہے۔ اور اس کا کوئی خاص متعلق ذکر نہیں کیا۔ (جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ زمین و آفتاب و ماہتاب تینوں ہی اپنے اپنے فلک (اپنے دائرہ) پر حرکت کرتے ہیں) +

اور ظاہر ہے۔ کہ متعلق خاص کا ذکر نہ کرنا فائدہ عموم دیتا ہے۔ پس حاصل عبارت یہ ہوگا۔ کہ کل شیٔ من الاشیاء المذکورۃ فی فلک یسبحون "یعنی ہر ایک ان اشیاء مذکورہ میں سے ایک ایک آسمان میں تیرتے ہیں۔ یا یہ حاصل ہوگا۔ کہ کل شیٔ مطلقاً۔ بنا بر اول کے یہ معنی ہونگے۔ کہ زمین بھی مع جمادات و نباتات و حیوانات کے اپنے فلک میں حرکت کرتی ہے۔ اور بنا بر ثانی کے بھی یہی مطلب ہوگا بطور عموم۔ اور ھرشل اور اُس کے تابعین کی رائے کے موافق ہوگا۔ جس کا خیال یہ ہے۔ کہ جتنے اشیاء عالم کہ فضا میں موجود ہیں۔ اُن میں حقیقۃً کوئی بھی ساکن نہیں۔ بلکہ سب بحرکت دوریہ اپنے فلک مخصوص یعنی مدار پر حرکت کرتے ہیں۔ حتےٰ کہ آفتاب و بروج و زمینیں اور دیگر سیارات و ثوابت (جن کو ثوابت سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ ثابت نہیں ہیں) سب کے سب ایک ایک مدار پر متحرک ہیں۔ اور اپنے خالق کی تسبیح میں مصروف +

(دوسری دلیل) سورۂ النازعات میں (والسابحات سبحاً) قسم اُن سیاروں کی جو تیرنے (حرکت کرنے) ہیں جیساکہ چاہئے۔ اس آیت میں ظاہر یہ ہے۔ کہ سابحات سے مراد ستارے لئے جائیں جیساکہ قتادہ وغیرہ مفسرین کی رائے ہے۔ نہ استعمال لفظ سبح (جس کے

دوسری دلیل

معنی تیرنے کے ہیں) کا تیز روی کے معنی میں علاوہ تیرنے کے پانی میں کلام عرب میں شائع و مشہور ہے۔ متنبی شاعر کہتا ہے۔ (سبوحٌ لها منها علیها شواهدُ)[۱] +

یہ معلوم رہنا چاہئے۔ کہ وہ آیات و احادیث جن میں ظاہری طور پر سیر و حرکت کی نسبت خود سیارات کی طرف دی گئی ہے۔ وہ بالکل نظام قدیم کے مخالف اور رائے جدید کے موافق ہے۔ (کیونکہ قدماء فلاسفہ خود ان کواکب کی سیر و حرکت کے قائل نہ تھے۔ بلکہ اُن کی رائے یہ تھی۔ کہ کواکب کو جو حرکت ہوتی ہے۔ وہ بذریعہ اُس فلک کے ہوتی ہے۔ جس میں وہ جڑے ہوئے ہیں۔ شریعت اسلامی اور ہیئت جدیدہ دونوں اس رائے کے مخالف ہیں) +

(بقیہ نکتہ) سیاروں کی رفتار کو اکثر سباحت (تیرنے) سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے۔ آیات قرآن میں بھی ایسا ہی ہے۔ اور احادیث میں بھی؟ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ ہر سیارہ کے عقب میں ہمیشہ ایک ظل مخروطی مستطیل پیدا ہوتا ہے۔ جس کا سبب یہ ہے۔ کہ آفتاب اُس کے نصف حصہ کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔ (جس سے اُس کا سایہ پورے ستاروں پر نہیں پڑتا) لہٰذا ہر سیارہ کی حالت سیر اس فضاے وسیع میں مع اپنے ظل مخروطی کے ایسی محسوس ہوتی ہے جیسے مچھلی پانی میں تیر رہی ہے۔ اسی نکتہ کے لحاظ سے اکثر اسناد شریعت (ائمہ علیہم السلام) نے گزرگاہ و مجراے سیارات کو دریا سے تعبیر کیا ہے۔ اور خود سیارات کو مچھلیوں سے۔ اور ان کی رفتار کو سباحت سے +

وہ حدیثیں جن میں یہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ زمین مچھلی پر پیدا کی گئی ہے۔ اُس کا مطلب بھی بظاہر یہی ہے۔ کہ مچھلی کی صورت پر ہے۔ مضاف (صورت) کو حذف کر دیا گیا ہے۔ (اور مضاف الیہ کو اُس کے قائم مقام کیا گیا ہے)۔ دیکھو مسئلہ ہیئۃ ارض اور مقالہ نہم مسئلہ تعدد ارضین کا۔ نیز نقشہ نمبر ۲ +

(تیسری دلیل) سورہ مومنون میں قول خداے تعالےٰ (وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَائِقَ)[۲]۔ اس آیت میں سبعہ سیارات کے افلاک کو خداے تعالےٰ نے طرائق (رستوں) سے تعبیر فرمایا ہے۔ طرائق طریقہ کی جمع ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ سیارات کے افلاک صرف رستے اور مدار ہیں ان سیارات کے جن پر یہ کواکب حرکت کرتے ہیں جس طرح پرندے

---

[۱] وہ ایسی تیز رفتار گھوڑی ہے۔ کہ اس کی نجابت کی دلیل خود اس میں موجود ہے + ۱۲

[۲] بیشک ہم نے تمہارے اوپر کی جانب میں سات رستے پیدا کئے + ۱۲

ہوا میں یا مچھلیاں پانی میں۔ جیسا کہ یورپین حکماء کی رائے ہے۔ نہ یہ کہ افلاک سے مراد بڑے بڑے اجسام ہیں جن کے اندر کواکب وسیارات جڑے ہوئے ہیں +

چوتھی دلیل

(چوتھی دلیل) سورۂ یسین میں (والقمر قدرناہ منازل حتیٰ عاد کالعرجون القدیم) "چاند کے لئے ہم نے منزلیں قرار دیں۔ یہاں تک کہ وہ بارہ مثل شاخ کہنہ کے (جھک کر خم) ہوگیا" اس آیت میں بھی محتمل ہے۔ کہ مضاف محذوف ہو۔ یعنی بجائے قدرناہ کے قدرنا سیرہ مراد ہو۔ پس مطلب یہ ہوگا۔ کہ ہم نے چاند کی رفتار منزل بمنزل قرار دی۔ یہاں تک کہ دوبارہ پھر ہلال بن کر مثل شاخ کہنہ کے ہوگیا +

اس آیت میں خدائے تعالےٰ نے جرم قمر کو اُس مسافر سے تشبیہ دی ہے۔ جو طے مراحل و قطع منازل خود کر رہا ہو جیسا کہ متاخرین حکماء (حکمائے یورپ) کی رائے ہے۔ رہے قدماء حکماء اُن کی رائے کے مطابق آیت کے معنی بنانے میں مجاز ماننا پڑیگا۔ اور نیز خلاف ظاہر الفاظ کے تسلیم کرنے پر مجبور ہونا پڑیگا۔ کیونکہ ان کی بنا پر معنی یہ ہونگے۔ کہ چاند کے فلک کی رفتار ہم نے مقابل میں منازل کے قرار دی۔ (حالانکہ آیت کے لفظوں میں اتنی گنجائش نہیں نظر آتی)۔ علاوہ بریں بھی یہ معنی قابل تعریف نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ فلک کی رفتار کو یہ کہنا۔ کہ وہ منازل میں واقع ہے صحیح نہیں۔ اس وجہ سے جسم کروی کی حرکت وضعیہ کو نزول نہیں کہتے۔ بلکہ لفظ نزول سیر انتقالی کے ساتھ مختص ہے۔ اور از بسکہ قمر خود منتقل ہوتا رہتا ہے۔ اور منزل بمنزل چلتا ہے۔ جیسا کہ متاخرین کی رائے ہے تو اس کے مطابق آیت کے معنوں کا ہونا نہایت واضح ہے +

پانچویں دلیل

(پانچویں دلیل) جناب امیر المومنین علیہ السلام کا قول آپ کے اُس خطبہ میں جو نہج البلاغہ وغیرہ میں مذکور ہے۔ جہاں کہ آپ نظم سماوات کو بیان فرماتے ہیں۔ (وعلق فی جوّھا فلکھا) "فضائے آسمان میں خدائے تعالےٰ نے سیارات کے افلاک کو معلق فرمایا"

ظاہر ہے۔ کہ فلک سیارات کا فضا میں معلق کرنا (لٹکانا) انہیں لوگوں کے قول کے مناسب ہے۔ جو اس امر کے قائل ہیں۔ کہ "فلک" سیارات کے مدار کو کہتے ہیں۔ جو چیز فضا میں مثل حلقہ معلق کے ہے۔ اور اُن لوگوں کے قول کے بالکل مناسب نہیں۔ جو افلاک کو عین سماوات کہتے ہیں اور اس امر کے معتقد ہیں۔ کہ فلک تمام عالم کو محیط ہے +

چھٹی دلیل

(چھٹی دلیل) امام جعفر بن محمد (صادق علیہ السلام) کا ارشاد جو تفسیر قمی و بحار میں مذکور ہے۔ حضرتؑ آسمانوں اور ستاروں کی خلقت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔ (وا جراھا

فی الفلک) "چلایا ان ستاروں کو فلک میں"۔ ظاہر ہے۔ کہ فلک میں حرکت دینا اور ستاروں کا چلانا جدید ہیئت کے موافق ہے۔ کیونکہ لفظ جریان خود سیارات کے لئے جیسا کہ حدیث میں ہے جدید ہیئت ہی میں پایا جاتا ہے۔ نہ قدماء کی رائے کے موافق۔ کیونکہ اُن کے خیال کے بموجب لفظ جریان (چلنا) خود سیارات کے لئے استعمال نہیں ہو سکتا۔ بسبب اس کے کہ یہ سیارات اُن کے نزدیک جڑے ہوئے ہیں۔ (اور خود حرکت نہیں کرتے)۔ اور نہ خود فلک کیلئے استعمال ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس کی حرکت ان کے نزدیک محوری ہے۔ نہ انتقالی۔ پس جریان اُس کے لئے نہیں کہا جاسکتا +

ساتویں دلیل

(**ساتویں دلیل**) کتاب احتجاج اور بحار جلد ۱۴ میں جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ حضرتؑ نے منجملہ اُن ارشادات کے جو ایک زندیق سے فرمائے تھے۔ یہ بھی کہا تھا۔ (ومن تدبیرا لنجوم التی تسبح فی الفلک)۔ (اس کلام میں بھی ستاروں کے لئے سیاحت یعنی تیرنا فرمایا گیا ہے)۔ جو صاف طور پر متاخرین کی رائے سے موافق اور اُسے قوی کرنیوالا ہے۔ اور قدماء حکماء کی رائے سے مخالف اور اُسے ضعیف کرنیوالا۔ اس مطلب کا وضوح زیادہ جب ہوگا۔ کہ پہلی اور دوسری دلیل کے بیان کئے ہوئے مطالب پر آپ غور کرلیں +

آٹھویں دلیل

(**آٹھویں دلیل**) جو کتاب بحار میں ملتی ہے۔ نیز سید ابن طاؤس علیہ الرحمہ نے بھی اپنے رسالہ استخارات میں ذکر کیا ہے۔ منجملہ اور جملوں کے ایک یہ ہے۔ کہ معصوم فرماتے ہیں۔ (وانک قادر علی نقلہا فی مدارانہا فی مسیرہا) یعنی "اے پروردگار تو قادر ہے سیارات کو اُن کے مدارات پر حرکت دینے میں اُن کی رفتار و سیر میں۔ اس فقرہ میں خود ستاروں کی طرف معصومؑ کا نقل (یعنی ایک مقام سے دوسرے مقام پر حرکت کرکے جانا) اور مدار اور مسیر (چلنا) کی نسبت دینا صاف بتا رہا ہے۔ کہ حضرتؑ کا یہ کلام رائے قدماء سے مخالف اور متاخرین کے خیال سے موافق ہے +

نویں دلیل

(**نویں دلیل**) جو کتاب کافی۔ وافی۔ بحار۔ انوار نعمانیہ۔ تفسیر قمی اور من لا یحضرہ الفقیہ میں باسانید قویہ جناب امام علی بن الحسینؑ السجاد (زین العابدین) علیہ السلام سے خبر کسوف و خسوف میں مروی ہے۔ منجملہ اُس کے یہ ہے۔ (امر اللہ الملک الموکل بالفلک ان یزیل الفلک الذی علیہ مجاری الشمس والقمر والنجوم والکواکب) اُس فرشتہ کو جو فلک کا مؤکل ہے۔ خدائے تعالےٰ نے حکم دیا ہے کہ اُس فلک کو ہٹا دے جس پر آفتاب ماہتاب ستارے

اور دیگر کواکب کی رفتاریں ہیں ۔

اِس حدیث سے ظاہر ہے۔ کہ ملک یعنی جوہر مجرد قدسی (جسے فرشتہ کہتے ہیں) اُس دائرہ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بدل لیتا ہے۔ جس پر ان سیارات عالیہ کی سیر و حرکت ہے۔ (اور اگر فلک کو اُس معنی میں لیں۔ جسے قدماء یونانین کہتے تھے۔ تو بدلنے کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اوّل تو فلک حسب تفسیر قدماء قابل نقل و تبدیل نہیں۔ دوسرے یہ کہ اُن کی رائے کے موافق جو ستارہ جس آسمان پر ہے۔ اُسی پر رہتا ہے۔ اُس سے علیحدہ ہو کر دوسرے آسمان پر نہیں آتا۔ حالانکہ اس حدیث میں ستاروں کا ایک فلک سے دوسرے فلک پر منتقل ہونا مذکور ہے۔ پس لامحالہ یہ ماننا پڑیگا۔ کہ معصومؑ نے فلک سے مراد وہی مدار لی ہے۔ جس پر کواکب کو حرکت ہوتی ہے۔ اور یہی ہمارا مقصود ہے۔ کہ شریعت میں جہاں کہیں فلک مستعمل ہوا ہے۔ اُس سے مراد جسم کروی عظیم و کبیر نہیں ہے۔ بلکہ صرف مدار مراد ہے)۔ رہا لفظ "فلک" (کلام امامؑ) میں مفرد ہے۔ (یعنی افلاک نہیں فرمایا)۔ اِس سے بظاہر مقصود آپ کا جنس کلی فلک ہے۔ (جو ہر فرد فلک یعنی مدار پر صادق آسکتی ہے)۔ اور ممکن ہے۔ کہ فرد واحد ہی مراد ہو۔ پھر بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ کیونکہ تمام اجرام کے لئے ایک ہی مدار کا تصور ممکن ہے۔ اس لئے کہ اگر آپ منطقۃ البروج سے ایک دائرہ فرضیہ نکالیں۔ تو وہی دائرہ باختلاف حالات و اطوار و ادوار ہر سیارہ کا مدار بن سکتا ہے۔ مثلاً زمین کا مدار اُسی دائرہ کو مانئے۔ کہ سال بھر میں ایک مرتبہ ۲۳ درجہ کے میل سے اس دائرہ پر اپنا دورہ پورا کر لیتی ہے۔ چاند بھی تھوڑے میل سے اسی پر حرکت کرتا ہے۔ اور اسی میل کی وجہ سے اُس میں گہن بھی لگتا ہے جسکو معصومؑ نے تبدیل سے تعبیر فرمایا ہے۔ نیز دیگر ستارے بھی اسی دائرہ پر تقریباً اٹھارہ درجہ کے ہیر پھیر سے حرکت کرتے رہتے ہیں۔ (خلاصہ) یہ ہے۔ کہ یہ حدیث بھی اپنے ظاہر الفاظ کی راہ سے رائے جدیدہ ہی کے موافق ہے۔ کیونکہ اوّل جریان (حرکت) کی نسبت خود نجوم کی طرف فرمائی ہے۔ دوسرے نجوم کی رفتار کو فلک پر ظاہر کیا ہے۔ جیسے کوئی چوپایہ راہ پر چلتا ہے۔ (جو قدماء کے خیال کے بالکل مخالف ہے) اور ستاروں کو شخین (دبانت) فلک میں جڑا ہوا نہیں بتایا۔ تیسرے فلک کے واسطے ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہونا اور ہٹنا فرمانا جو قدماء کے نزدیک محال ہے۔ (پس لامحالہ حضرت کا مطلب وہی ہے۔ جسے تیرہ سو برس بعد حکمائے یورپ نے سمجھا ہے نہ وہ جو یونانین کہا کرتے تھے) ۔

دسویں دلیل

(دسویں دلیل) جو کتاب مجمع البحرین طریحی میں ہے۔ فرماتے ہیں معنی الحدیث (ان الفلک دوران السماء) یعنی حدیث میں ہے۔ کہ "فلک نام ہے دوران سماء (حرکت و گردش بلندی) کا"۔

اِس سے بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے۔ کہ "فلک" کی ماہیت و حقیقت شریعت کے نزدیک صرف یہی گردش سیارات ہے۔ جو زمین کو مع خود زمین کے محیط ہے۔ اور فضا میں واقع ہے۔ لہذا یہ حدیث باوجود اس کے کہ نظام کوبرنیکی کے موافق ہے۔ اس بات کو بھی قوت دیتی ہے۔ کہ سماء (فضاء آتمسفر) کا کرہ ہے۔ جو ہماری زمین کو جو کہ فضائ میں گردش کے طور پر متحرک ہے۔ محیط ہے۔

گیارھویں دلیل

(گیارھویں دلیل) کتاب شیخ زاہد ابی اللیث سمرقندی میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ (ان النجوم معلقة فی السماء) ستارے سماء (بلندی میں) معلّق ہیں۔ اسی کی مؤیدہ روایت بھی ہے۔ جو عبداللہ بن سلام سے مروی ہے۔ کہ نبی صلے اللہ علیہ و آلہ نے فرمایا ہے "کواکب و نجوم ہواء (فضاء) میں معلّق ہیں"۔

اِس قسم کی جتنی روایتیں ہیں۔ وہ سب اسی ہیئت جدیدہ کے موافق ہیں۔ جس میں ثابت کیا گیا ہے۔ کہ تمام ستارے اور اجرام سماویہ فضاء میں بقوت جاذبیہ و قدرت خدا تعالےٰ معلّق ہیں۔ اور ایک ایک مدار خاص پر حرکت کرتے ہیں۔ نہ یہ کہ کسی جسم فلکی میں مرکوز (جڑے ہوئے) ہیں۔

(بارھویں دلیل) بحار میں تفسیر فرات سے امیر المومنین علیہ السلام سے شمس و قمر کے بارے میں مروی ہے۔ (ان اللہ سبحانہ جعلہما یجریان فی الفلک والفلک بحر بین السماء والارض مستطیل فی السماء الخ) "خدائے تعالےٰ نے آفتاب و ماہتاب کو ایسا بنایا ہے۔ کہ فلک پر حرکت کریں۔ اور فلک اُس طولانی بحر (دریا) کو کہتے ہیں۔ جو درمیان سماء و ارض کے جانب فوق میں واقع ہے"۔

یہ حدیث تصریح کر رہی ہے۔ اِس بات کی کہ اجرام سماویہ خود فلک پر گردش کرتے ہیں۔ جیسا کہ رائے متاخرین ہے۔ (اور مخالف رائے قدماء ہے) پھر ہمارے لئے اس امر کی شرح بھی کر رہی ہے۔ کہ فلک ایک بحر ہے۔ کہ فضا میں ہماری جانب فوق واقع ہے۔ نیز حضرتؑ کا یہ فقرہ (مستطیل فی السماء) بھی متاخرین کی رائے مختار کو تقویت دیتا ہے۔

(یعنی کہ فلک ایک طولانی دائرہ ہے جانب فوق میں۔ نہ یہ کہ جسم کروی ہے)۔ کیونکہ متاخرین کے نزدیک فلک اُسی خط مستطیل کو کہتے ہیں۔ جو فضائے بلندی میں بشکل دائرہ بیضویہ یا اہلیلجیہ ہے۔ جس پر سیارے کو گردش ہوتی ہے +

باقی رہا حضرت کا یہ فرمانا۔ کہ فلک ایک بحر (دریا) ہے پھیلا ہوا۔ تو اُس کی تفصیل ہم مسئلہ تعدد ارض کے نویں مقالہ میں کرینگے +

اگر آپ اس مقام پر یہ سوال کریں۔ کہ حدیث مذکور سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آفتاب و ماہتاب دونوں ہی اپنے اپنے مدار پر گردش کرتے ہیں۔ حالانکہ جدید علم ہیئت نے یہ ثابت کیا ہے۔ کہ آفتاب خود اپنے مقام پر قائم ہے۔ اور باقی سیارات اُس کے گرد گردش کرتے ہیں۔ تو ہم (یہ جواب) دینگے۔ کہ مسئلہ حرکت شمس کے بیان میں آئیگا۔ کہ آفتاب بھی متاخرین کے نزدیک دو حرکتوں سے متحرک ہے۔ ایک حرکت محوری جو اُسی کے مرکز کے گرد ہوتی ہے۔ دوسری حرکت انتقالی۔ جو فضائے وسیع میں اس طور پر ہوتی ہے۔ کہ آفتاب مع اپنے تمام توابع و لواحق وسیارات حتے چاند کے (کہ یہ بھی آفتاب کی اس حرکت کے ساتھ ساتھ اسی دائرہ پر بحرکت واحدہ متحرک ہے) دوری حرکت کرتا ہے۔ اس سے بہت مناسب و موافق ہے حضرت کا یہ ارشاد کہ (جعل الشمس والقمر معا یجریان فی الفلک)۔ نیز ممکن ہے۔ کہ حضرت کا یہ ارشاد (والفلک موج مستطیل فی السماء)۔ استاد (کمبل) امریکی کے مذہب کو صحیح ثابت کرتا ہو۔ جس کی رائے یہ ہے۔ کہ آفتاب ہمیشہ جنوب سے شمال کی طرف ایک خط مستطیل پر حرکت کرتا ہے۔ اور ساتھ اُس کے اُس کا نظام اور اُس کے توابع بھی متحرک ہوتے ہیں۔ (دیکھو نقشہ نمبر ۶) + اس مطلب کی زیادہ تفصیل مسئلہ تحرک شمس میں آئیگی۔ والعلم عند اللہ و اولیائہ +

(**تیرھویں دلیل**) بحار و خصال صدوق علیہ الرحمہ وغیرہ میں نظر آئی۔ جس کی سند امام پنجم محمد باقر علیہ السلام تک پہنچتی ہے۔ حضرت نے فرمایا۔ (ان اللہ خلق السحاب ففخرت و ذخرت و قالت ای شئ یغلبنی فخلق اللہ الفلک فادارھا بھا و ذللھا) "خدا تعالے نے ابر کو پیدا کیا۔ تو اُس نے فخر کیا۔ اور پھولا۔ اور کہا۔ کہ مجھ پر بھلا کیا چیز غالب آسکتی ہے۔ تو خدا تعالے نے فلک کو پیدا کیا۔ جس نے اُسے گردش دی۔ اور سرنگوں کر دیا" +

یہ حدیث کسی قدر تفصیل چاہتی ہے۔ جس سے اس کے حسن و نکات ظاہر ہوں۔ مگر میں بقدر ضروریات عرض کرتا ہوں۔ کہ حضرت نے اس کلام شریف میں "فلک" کا لفظ ابر کے مدار و گزرگاہ

(جس دائرہ پرابر کو حرکت ہوتی ہے۔ ازبسکہ یہ تمام عالم کروی ہے۔ تو جو شے فضا میں اس عالم کے گرد حرکت کریگی۔ اُس کی حرکت بھی مستدیر اور کروی ہی ہوگی۔ لہذا اُس کے لئے اُس کی حرکت کی وجہ سے مدار کا پیدا ہو جانا لازم ہے) پر اطلاق فرمایا ہے۔ جو فضا میں واقع ہے۔ اور ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ کہ ابر کی حرکت و رفتار فضا ہی میں ایک دائرہ وہمیہ پر ہوتی ہے۔ اُس کے لئے علاوہ اس کے کوئی آسمان خاص کروی قدما کی رائے بموجب نہیں۔ البتہ متاخرین کے خیال کے مطابق اُس کے لئے فلک (دائرہ مداریہ) ضرور ہے۔ پس حضرتؑ کا مدار سحاب کو فلک سے تعبیر کرنا اس مطلب کو بہت قوت دیتا ہے۔ کہ عموماً یہ لفظ تمام سیارات کے مدار پر عرف شریعت میں بولا جاتا ہے۔ رہا یہ خیال کہ شاید حضرت نے مجازاً اس دائرہ کو فلک فرمایا ہے۔ تو محض لغو ہے۔ کیونکہ مشترک معنوی زبان عرب میں مجاز اور اشتراک لفظی دونو پر مقدم سمجھا جاتا ہے (پس اس لفظ کو مشترک معنوی نہ ماننا اور مجاز کہنا خلاف انصاف ہے) +

اس حدیث سے ہمارے مطلب اور نیز ہرشل وغیرہ کی اس رائے کی تائید بھی نکلتی ہے۔ کہ تمام اجسام کو کبیہ اس فضائے وسیع میں مختلف افلاک و مجاری پر بحرکت دوریہ حرکت کرتے ہیں +

(**چودھویں دلیل**) جناب امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا قول ہے۔ آپ کے اُس خطبہ میں جو نہج البلاغہ و بحار میں مکرر اور نیز دیگر کتب میں مروی ہے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔ (والجو المکفوف الذی جعلتہ مغیضا للیل والنہار ومجری للشمس والقمر ومختلفا للنجوم السیارۃ) "وہ فضائے بستہ جس کو تو نے (اے پروردگار) رات اور دن کے غائب ہونے کی جگہ اور شمس و قمر کے چلنے کی جگہ اور سیارات کے آمد و رفت کا مقام قرار دیا ہے" اس کلام میں حضرتؑ نے خود شمس و قمر کی حرکت اور نجوم کی رفتار ذاتی کو فضا میں فرمایا ہے۔ نہ کسی جسم کروی فلکی کے اندر ہو کر۔ پس لامحالہ یہ کلام جدید ہیئت کے مطابق ہوگا: نہ قدیم کے +

(**نکتہ**) مغیض اُس مقام کو کہتے ہیں۔ جو پانی کو جذب کرتا اور اپنے اندر کھینچ لیتا ہے۔ اس مقام پر نور و ظلمت کو حضرتؑ نے لیل و نہار سے تعبیر فرمایا ہے۔ نہار یعنی دن کی روشنی کے شب میں معدوم ہو جانے اور اس طرح تاریکی لیل کے دن میں زائل ہونے کو پانی کے جذب ہونے سے زمین میں تشبیہ دی ہے۔ (یعنی جس طرح زمین پانی کو چوس لیتی ہے۔ اُسی طرح یہ فضا تاریکی و روشنی کو جذب کر لیتی ہے)۔ اس سے وہ مسئلہ بھی حل ہوتا ہے۔ جسے متاخرین نے الٹراسپکٹر سکوپ) وغیرہ کے ذریعے سے معلوم کیا ہے۔ کہ ہوا و فضا روشنی کے بڑے حصہ کو بحسب اپنی طبیعت

کے مقتضا کے جذب کر لیتی ہے۔ اور جو باقی رہ جاتی ہے۔ وہ روشنی ہم تک پہنچتی ہے۔ جس سے متاخرین نے بڑے بڑے کام لئے ہیں۔ اور ہزاروں ابواب علم ان پر منکشف ہو گئے ہیں۔ لیکن باب مدینہ علم یعنی علی ابن ابی طالب علیہ السلام کو تو رسول اللہ نے ہزار باب علم کے تعلیم فرمائے تھے۔ جن کے ہر باب سے ہزار ہزار باب علم اور بھی آپ پر منکشف ہو گئے۔ جن میں سے ایک یہ بھی مسئلہ ہے۔ جسے آپ نے سُنا جس سے حکیم ہزار باتیں پیدا کرتا ہے +

قسم بخدا کہ امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کا کلام وہ کلام ہے۔ کہ اگر کوئی اُسے غور کرے۔ اور کسی قدر فنون فلسفیہ پر مطلع بھی ہو۔ (جس سے حضرت کے کلام سمجھنے کی قوت پیدا کر سکتا ہو)۔ تو سینکڑوں حکمت کی مخفی باتیں اُسے معلوم ہو سکینگی۔ اور چشمہائے حکمت اُس کی آنکھوں کے آگے جھلکتے نظر آئینگے۔ اُس وقت اُسے تصدیق ہوگی۔ کہ ہاں بیشک علیؑ کا کلام دون کلام الخالق اور فوق کلام المخلوق ہے +

جو مکفوف سے مراد یہ ہے۔ کہ وہ فضا جو بہ نہ جائے۔ یعنی باوجود مادۂ اثیریہ کے بھرے ہونے کے پھر ایک حالت پر قائم ہے۔ جیسے کوئی جمی ہوئی شے۔ اگر خدائے تعالےٰ نے توفیق دی۔ تو آئندہ کسی رسالہ میں جو مکفوف۔ بحر مسجور۔ بیت معمور وغیرہ مشکل الفاظ مصطلحہ احادیث کی بھی شرح کی جائیگی۔ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْهِ الْمَصِيْر +

دوسرا مسئلہ

زمین کی شکل کیسی ہے اور کس چیز پر قائم ہے

(صورت سوال) کیوں جناب ہم تو ہمیشہ سے سُنا کرتے تھے۔ کہ شریعت اسلامیہ بہت مکمل شریعت ہے۔ عقائد باطلہ اس میں بالکل نہیں۔ اسی وجہ سے لوگ اسے نہایت شوق سے قبول کر لیتے تھے۔ اب یہ کیا سننے میں آتا ہے۔ کہ شریعت کے نزدیک زمین مسطح (مثل فرش کے) ہے۔ حالانکہ تمام دنیا کے حکما پکار پکار کر کہہ رہے ہیں۔ کہ زمین کروی ہے۔ آپ براہ عنایت اس شبہ کو دفع فرمائیے +

(صورت جواب) اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ جو کوئی بغیر تحقیق و تدقیق کے محض ظاہر

حالت زمین پر نظر کرے۔ تو اُسے یہی معلوم ہوگا۔ کہ زمین ہر طرف سے مسطح و برابر ہے۔ اور وہ آلات جو اس کی حقیقت کے معلوم کرنے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ اگلے زمانے میں موجود نہ تھے۔ اسی وجہ سے حکماء کی رائیں اس کی بابت ہمیشہ مختلف رہی ہیں۔ اس وقت تک جو ہمیں معلوم ہوسکی ہیں۔ تیرہ رائیں ہیں۔ (۱) انکیماس کی رائے۔ جو قائل تھا۔ کہ زمین مسطح مثل ورق رصاص کے ہوا میں معلق ہے۔ جب تک برابر مسطح رہتی ہے۔ تب تک تو پانی پر تیرتی رہتی ہے۔ اور جب سمٹ جاتی ہے۔ تو ڈوب جاتی ہے + (۲) پادریوں کی رائے۔ ان کا خیال تھا کہ زمین نیچے تک ممتد ہے۔ مگر ستون اور عمودوں پر قائم ہے۔ (جیسے چھت) بلکہ اس سے زیادہ مہمل خیالات بھی ان کے منقول ہیں + (۳) بعض قدماء کی رائے۔ کہ زمین مخروطی شکل (گاجر کی شکل) کی ہے۔ جیسے کوئی پہاڑ ہو۔ کہ چوٹی تو اُس کی اوپر ہے۔ اور قاعدہ اُس کا نیچے کی طرف ہے۔ اور نیچے کی جانب اس کی کوئی حد نہیں + (۴) انکیمندر کی رائے۔ کہ زمین مثل گول ستون کے ہے + (۵) یہ کہ مکعب ہے۔ یعنی اس کی سطحیں شش پہلو ہیں + (۶) یہ کہ زمین مثل دف کے ہے + (۷) یہ کہ مثل طبل کے ہے + (۸) مثل نصف طبل کے ہے۔ یعنی آدھا کٹا ہوا طبل + (۹) ہرکلیطس کی رائے۔ کہ زمین مثل خالی کشتی کے ہے + (۱۰) یہ کہ ڈھال کی صورت ہے + (۱۱) قدماء یونان کی رائے۔ کہ زمین مثل ایک دائرہ مسطح کے ہے۔ مرکز اس کا ملک یونان ہے۔ اور محیط اُس کا بحر محیط کے سواحل ہیں + (۱۲) جمہور فرس و یونان و عرب کی رائے۔ کہ زمین پورا کرہ ہے۔ محیط استوائی اس کا اور محیط قطبی دونو یکساں ہیں۔ پہاڑ وغیرہ کا اس پر واقع ہونا اس کی کرویت میں کچھ خلل نہیں ڈالتا۔ کیونکہ بڑے سے بڑا پہاڑ بھی اگر زمین پر ہے۔ تو اُس کی نسبت زمین سے ایسی ہے۔ جیسے ایک بال کو ہوتی ہے ایسے کرہ پر جس کا قطر ایک ہاتھ کا ہو۔ یہ رائے اہل فرنگ میں اُس وقت تک رائج نہ تھی۔ جب تک کہ امریکہ کی تحقیق نہ ہوئی + (۱۳) نیوٹن متوفی ۱۷۲۷ء اور متاخرین کی رائے۔ کہ زمین کرہ تامہ تو نہیں ہے۔ مگر مثل و مشابہ کرہ کے ہے۔ کیونکہ دونوں قطبوں کی طرف گولائی باقی نہیں رہی ہے۔ بلکہ مسطح ہے۔ یعنی اس کا محیط قطبی اس کے محیط استوائی سے تیرہ فرسخ کم ہے۔ اور دونو قطروں میں سے ایک دوسرے سے دو میل کم ہے۔ اسی رائے کو آج کل زیادہ شہرت ہے۔ فلاسفران حال اسی کو تسلیم کرتے اور اسی کے موافق اپنی دلیلوں اور شواہد کو پاتے ہیں۔ (باقی رہی شریعت اسلامیہ) سو اس میں اشارات و دلائل زمین کی کرویت کے موجود ہیں۔ اور قطبین کے مسطح ہونے پر بھی جیسا کہ متاخرین کی رائے ہے۔ اشارات کا حال تو اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ائمہ طاہرین علیہم السلام نے زمین کو ہمیشہ گول چیزوں سے

تشبیہ دی ہے۔ مثلاً کبھی ربوۃ سے کبھی دُرہ (موتی) سے۔ کبھی دہانۃ سے۔ کبھی کہف کے پہاڑ سے۔
کبھی اخروٹ کے ٹکڑے سے۔ کبھی قبہ سے۔ کبھی خشفہ سے وغیر ذلک +

اور اگر دلائل کو دیکھئے۔ تو منجملہ اُن کے ایک یہ ہے۔ کہ خدائے تعالیٰ سورۂ معارج میں ارشاد فرماتا ہے۔ (رب المشارق والمغارب) جب تک کہ زمین گول نہ ہوگی۔ تب تک یہ جملہ صحیح نہیں ہوسکیگا۔ کرویت زمین ہی وہ شے ہے۔ جس پر ایک ہی نقطہ کسی قوم کے لئے مشرق اور کسی کے لئے مغرب ہوسکتا ہے۔ اُس وقت مشارق اور مغارب کا کہنا درست ہوسکیگا۔ بغیر اس کے کہ ہم تفسیر میں کسی تکلف سے کام لیں۔ (مطلب یہ ہے۔ کہ جب زمین گول ہوگی۔ تو ہر شہر اور ملک کا مشرق و مغرب علیحدہ علیحدہ ہوگا۔ اس بنا پر بہت سے مشرق اور بہت سے مغرب پیدا پیدا ہوجائینگے۔ لہٰذا "رب المشارق والمغارب" کہنا صحیح ہوگا۔ اور اگر زمین مسطح ہوگی۔ تو ایک ہی مشرق ہوگا اور ایک ہی مغرب۔ پھر مشارق و مغارب کہنا کیونکر درست ہوگا۔ پس معلوم ہوا۔ کہ پروردگار عالم زمین کو کروی فرما رہا ہے۔ اس سے بڑھ کے کیا دلیل ہوسکتی ہے) +

(دوسری) کتاب تہذیب الاحکام حافظ فاضل محمد الطوسی متوفی ۴۶۰ھ میں اور کتاب وافی میں۔ نیز وسائل میں جو خود اُس کے مؤلف حافظ عاملی محمد الحرّ متوفی ۱۱۰۹ھ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی موجود ہے۔ امام ششم جعفر بن محمد الصادق علیہ السلام تک روایت کا سلسلہ پہنچتا ہے۔ حضرت اپنے کسی صحابی سے فرماتے ہیں۔ (مسّوا بالمغرب قلیلا فان الشمس تغیب من عندکم قبل ان تغیب من عندنا) "مغرب کی نماز ذرا اور تاخیر کرکے پڑھا کرو۔ کیونکہ آفتاب تمہارے ہاں ہمارے ہاں کی نسبت کچھ پہلے غروب کرتا ہے"۔ دوسری حدیث میں فرمایا۔ (فانّما علیک مشرقک و مغربک) "تمہیں اپنے مشرق و مغرب پر عمل کرنا چاہئے" ان دونوں روایتوں سے نکلتا ہے۔ کہ مشرق و مغرب بحسب اختلاف اقطاع زمین کے مختلف ہوتے رہتے ہیں۔ اور آفتاب کا غروب کبھی کہیں پہلے ہوتا ہے کہیں پیچھے۔ اور یہ اُس وقت تک نہیں ہوسکتا۔ جب تک زمین کو کروی نہ مانا جائے۔ اور یہ کہ اُس کا خط استواہی ایسا مستدیر ہو۔ کہ جو نقطہ اُس پر فرض کیا جائے۔ وہ مشرق ہو۔ اُن لوگوں کا جو اُن سے مغرب میں واقع ہے۔ اور مغرب ہو۔ اُن لوگوں کا جو اُن سے مشرق میں رہتے ہیں +

(تیسری) بحار۔ وسائل۔ اور مجالس صدوق میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ کہ حضرت نے فرمایا "میرے ساتھ (ایک مرتبہ) ایک شخص چلا۔ جو مغرب کی نماز تاریکی پھیلنے

پر پڑھتا تھا۔ اور فجر کی نماز ظلمت شب میں۔ اور مَیں مغرب کی نماز اُس وقت پڑھتا جب کہ آفتاب غروب ہو جاتا۔ اور فجر کی نماز تب پڑھتا۔ کہ فجر ظاہر ہوتی۔ تو مجھے اُس شخص نے کہا۔ کہ آپ ایسا کیوں نہیں کرتے جیسا مَیں کرتا ہوں۔ کیونکہ آفتاب کا طلوع کسی قوم پر ہم سے قبل ہوتا ہے۔ اور ہمارے سامنے سے غروب کر جاتا ہے۔ مگر دوسروں کے ہاں طالع رہتا ہے۔ (مطلب یہ ہے۔ کہ صبح کی نماز بہت سویرے مَیں اس وجہ سے پڑھتا ہوں۔ کہ اگرچہ ہمارے ہاں فجر نہیں ہوئی ہے۔ مگر ہم سے مشرق میں جو لوگ ہیں۔ اُن کے ہاں فجر ہو گئی ہوتی ہے۔ تو پہلے ہی سے نماز پڑھنے میں یہ فائدہ ہے۔ کہ وہاں فجر ہو چکی ہے۔ گو ہم پر ظاہر نہیں ہوئی۔ اور مغرب کی نماز دیر کر کے اس وجہ سے پڑھتا ہوں۔ کہ اگرچہ یہاں غروب آفتاب ہو گیا ہے۔ مگر دیگر مقامات پر ابھی غروب نہیں ہوا ہے۔ لہٰذا چاہتا ہوں۔ کہ جب ہر جگہ سے غروب ہو جائے۔ تب مغرب پڑھوں) (امامؑ نے فرمایا) مَیں نے کہا۔ "ہمارا فرض یہ ہے۔ کہ جب آفتاب ہمارے سامنے سے غروب کر جائے۔ اور جب فجر ہمارے ہاں طلوع کرے۔ اُس وقت نماز پڑھیں (دوسروں کی متابعت ہم پر لازم نہیں ہے)۔ اور اُن لوگوں کا فرض یہ ہے۔ کہ جب اُن کے ہاں طلوع و غروب ہو۔ تو وہ نماز پڑھیں۔ (انہیں ہماری تبعیت لازم نہیں ہے)"

اپنے مطلب پر اُس شخص کے استدلال کرنے اور معصوم علیہ السّلام کی تقریر اور اُس کے کلام کو دربارہ تعدد مشرق و مغرب رد نہ کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرتؑ کے نزدیک بھی زمین گول ہے۔ اور یہ امر ایسا ہے۔ کہ اُس وقت کے عام مسلمان بھی اس کو سمجھتے تھے۔ اِس قسم کے اور مطالب ائمہ علیہم السّلام کے فتاوے سے باب صلوٰۃ و میراث وغیرہ میں بھی ظاہر ہوتے ہیں۔

(چوتھی) کتاب کافی کے باب الحج میں نیز وافی و بحار میں بسند قوی امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے حضرتؑ نے فرمایا۔ (ان اللہ دحی الارض من تحت الکعبۃ الی منیٰ ثم دحاھا من منیٰ الی عرفات ثم دحاھا من عرفات الی منیٰ الخ) مجلسی علیہ الرحمہ نے بھی اس حدیث سے یہی مطلب سمجھا ہے۔ کہ زمین گول ہے۔ بایں خیال کہ دحو کے معنی بسط (پھیلانے اور بچھانے) کے ہیں۔ یعنی خدائے تعالیٰ نے مقام کعبہ سے منیٰ تک اور منیٰ سے عرفات تک زمین کو پھیلایا (مقام عرفات منیٰ سے بہ نسبت خانہ کعبہ کے پیچھے واقع ہے۔ (دیکھو

نقشہ نمبر ۳) پھر زمین کو پھیلایا۔ اور دراز کیا مرکز سے لیکر یہاں تک کہ اُسے وہیں پہنچا دیا جہاں سے شروع کیا تھا یعنی منیٰ سے ہوتے ہوئے کعبہ تک +

یہ تو اُس وقت معنی ہونگے ۔جبکہ دحو بمعنی لبسط ہو۔ لیکن اگر دحو کے معنی دفع (دھکیلنے) اور حرکت دینے کے ہوں ۔جیسا کہ آئندہ مذکور ہوگا۔ تو اس حدیث کی دلالت کرویت زمین پر عقلی ہوگی۔ (کیونکہ جب ثابت ہو جائیگا۔ کہ زمین باستدارۃ حرکت کرتی ہے۔ تو لامحالہ خود بھی مستدیر ہوگی) ۔ جیسا کہ وہ دلیلیں جو حرکت زمین پر دلالت کرتی ہیں۔ اُن سے بھی کرویت زمین ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ کرویت اور حرکت وضعیہ میں تلازم ہے۔ جہاں ایک پائی جائیگی۔ دوسری کا پایا جانا لازم ہوگا +

(پانچویں) کافی۔ بحار۔ انوار نعمانیہ۔ مجمع البحرین شیخ طریحی فخر الدین متوفی ۱۰۸۵ھ وغیرہ میں امام پنجم جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے۔ کہ آپ نے ابتدائے خلقت کو اوّلاً بیان فرمایا۔ اُس کے بعد ارشاد فرمایا۔ (فخلق من ذٰلک الزبد ارضاً بیضاء نقیۃ ثم طواھا فوضعھا فوق الارض) "پھر اُس کف سے ایک شفاف وصاف زمین پیدا کی۔ پھر اُسے گول کیا۔ اور زمین کے اوپر رکھ دیا" +

لفظ "طوی" جس کے معنی ہیں "لپیٹا" بظاہر ادارہ کو بتا رہا ہے۔ جیسے کسی کاغذ یا گیلی لکڑی کو اگر کوئی لپیٹے ۔تو حلقہ دار ہو جائیگی۔ اس میں اس امر کی طرف بھی اشارہ نکلتا ہے۔ کہ قطبین کی طرف کی زمین مسطح ہے۔ جیسے لپٹے ہوئے دفتر کا غذ کی صورت ہوتی ہے ۔پس گویا حضرت کا یہ ارشاد ایک قسم کا لطیف ایماء و اشارہ اس دقیق مطلب کی طرف ہے !! اس کے علاوہ بھی اگر آپ شریعت طاہرہ اسلامیہ کے اخبار و احادیث کو دیکھینگے ۔تو کہیں آپ کو یہ نظر نہ آئیگا۔ کہ زمین محض گول مثل پورے گولے کے ہے ۔البتہ استدارۃ طرف خط استواء کی ضرور سمجھ میں آتی ہے۔ یا بحسب مقام تسطیح قطبین کی طرف اشارہ ضرور نکلتا ہے +

(چھٹی) بحار۔ بصائر الدرجات اور کتاب اختصاص شیخ مفید علیہ الرحمہ میں جناب صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ (انّ منّا اھل البیت من الدنیا عندہ بمثل ھٰذہ و عقد بیدہ عشرۃ) "ہم اہل بیت میں بعض ایسے بھی ہیں ۔جن کے نزدیک دنیا اس طرح ہے۔ ○ ۔ اور آپ نے اپنے ہاتھ سے عقد عشرہ فرمایا"۔ مجلسی علیہ الرحمہ نے فرمایا ہے۔ کہ "عقد عشرہ" کے معنی یہ ہوتے ہیں ۔کہ کوئی شخص انگشت شہادت کے سرے کو ہاتھ کے

انگوٹھے کی گرہ پر رکھے۔ جس سے وہ دونوں انگلیاں مل کر ایک حلقہ کی صورت ہو جائے +

اگلے لوگ اس حدیث کا یہ مطلب خیال فرماتے تھے۔ کہ معصوم کی غرض یہ ہے۔ کہ امام کے نزدیک دنیا ایسی ہے۔ جیسے ایک حلقہ مدورہ۔ یعنی اُسے تمام دنیا کا حال معلوم ہے۔ اور تمام دنیا اُس کے پیش نظر اُسی طرح ہے۔ جیسے ایک حلقہ۔ مگر میرا خیال یہ ہے۔ کہ معصومؑ نے اس کلام سے دنیا کی شکل کی تمثیل دی ہے۔ یعنی دنیا ایسی ہے۔ جیسے ایک کرہ غیر تامہ۔ جس طرح کوئی مٹھی بند کرے۔ (دیکھو نقشہ نمبر ۴) حاصل یہ ہوا۔ کہ دنیا کی شکل مثل اس حلقہ کے ہے۔ یعنی جس طرح یہ دونو طرف سے ناقص ہے۔ اُسی طرح صورت زمین بھی دونوں کناروں کی طرف کروی نہیں ہے۔ بلکہ مسطح ہے +

اس حدیث میں ہم "اہلبیت" کی جو تخصیص فرمائی ہے۔ وہ ظاہر ہے۔ کیونکہ اُس زمانہ میں سوائے امام علیہ السلام کے کون جانتا تھا کہ زمین اس صورت کی ہے۔ نہ عوام ہی کو خبر تھی۔ اور نہ خواص ہی کو۔ بلکہ یہ مسئلہ تو متاخرین حکماء نے ایک ہزار ہجری کے بعد حل کیا ہے۔ پس اُس زمانے میں اس راز سے باخبر سوائے آپ کے اور کوئی نہ تھا +

خلاصہ یہ کہ ظاہر شریعت کے اقوال جہاں تک ملینگے۔ اُن کی موافقت رائے جدید سے ہوگی۔ اور بظاہر شریعت میں کوئی ایسا کلام نہ ملیگا جو اس مسلک کے مخالف ہو۔ اب رہا خدائے تعالےٰ کا یہ ارشاد کہ (والارض ذات السطح) تو اس سے صرف سطح محدب اور سطح مقعر اور سطح مستوی مراد ہے۔ نہ یہ کہ زمین کا پھیلا ہوا ہونا مثل سطح یعنی فرش کے مراد ہے۔ جو اُس کی کرویت کے مخالف ہے۔ (اس مقام پر مصنف سلمہ اللہ سے مسامحہ ہو گیا ہے۔ قرآن میں کہیں یہ عبارت نہیں ہے۔ یعنی والارض ذات السطح نہیں ہے۔ بلکہ والارض ذات الصدع البتہ ہے۔ مگر اس کے معنی ہو جانے کے ہیں۔ نہ مسطح ہونے کے۔ فافہم ولاتغفل۔ مترجم)۔ (جعل لکم الارض فراشا)۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ زمین کو مثل فرش و قالین کے بنایا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے۔ کہ زمین ایسی بنائی گئی ہے۔ جس پر حیوانات ذی روح سکونت کر سکتے ہیں۔ اور یہ گویا اُن کے سونے بیٹھنے کا بچھونا ہے۔ یا یہ کہ با آسانی لوگ اس پر چل پھر سکتے ہیں۔ جیسا کہ اس جملہ سے ظاہر ہے۔ (لتسلکوا منہا سبلا فجاجا)۔ تاکہ تم اس زمین پر وسعت کے ساتھ چل سکو۔ جس طرح کسی مسطح چیز پر چل سکتے ہو۔ نہ یہ کہ فی الواقع وہ مسطح ہے +

(**تتمۂ ضروریہ**) اس امر کے بیان میں کہ زمین کس چیز پر قائم ہے؟

شریعت اسلامی میں جہاں جہاں اس کا ذکر آیا ہے۔ خواہ دعائیں ہوں۔ یا حدیثیں۔ یا خطبے۔ سب میں یہی مذکور ہے۔ کہ زمین بنفسہ فضا میں قائم ہے۔ نہ کسی چیز کے سہارے پر کھڑی ہے۔ اور نہ کوئی شے اُسے اُٹھائے ہوتے ہے۔ جیسا کہ محققین حکماء کی رائے ہے۔ دیکھئے ایک خطبہ میں جو نہج البلاغہ۔ احتجاج اور بحارالانوار وغیرہ میں مروی ہے خلقت زمین کے بیان کے موقع پر حضرت فرماتے ہیں۔ (وارساھا علی غیر قرار واقامھا بغیر قوآئم ورفعھا بغیر دعائم) خدائے تعالےٰ نے زمین کو ٹھیرایا ہے۔ مگر کسی مقر و قرارگاہ پر نہیں۔ اور اُسے بغیر ستونوں کے قائم کیا ہے۔ اور بغیر دعاموں کے بلند کیا ہے +

دوسرے خطبے میں جو بحار وغیرہ میں مروی ہے۔ فرماتے ہیں۔ (خلق السماوات والارضین بغیر عمد قائمات بلا سند) خدائے تعالےٰ نے سماوات وارض کو بغیر عمودوں کے پیدا فرمایا۔ جو بغیر ٹھونی کے قائم ہیں۔ (مطلب یہ ہے۔ کہ زمین کے نیچے کوئی ایسی شے نہیں ہے جس پر زمین ٹکی ہو) جناب رسالت مآب صلے اللہ علیہ وآلہ ایک دعا میں فرماتے ہیں جسے سید ابن طاؤس علیہ الرحمہ نے مہج الدعوات میں اور علامہ مجلسی رح نے بحار میں روایت کیا ہے۔ (نور السموات والارضین وفاطرھما ومبتدعھما بغیر عمد خلقھما فاستقرت الارضون باوتادھا فوق الماء) یعنی "خدائے تعالےٰ سماوات وارضین کا روشن کرنیوالا اُن کا پیدا کرنیوالا اُن کو از سرنو ایجاد کرنے والا ہے۔ بغیر ستون کے ان کو خلق فرمایا۔ تو زمینیں مع اپنے اوتاد کے پانی پر ٹھیر گئیں"۔ دعائے وداع شہر رمضان میں ہے "بسط الارض علی الماء بلا ارکان"۔ یعنی زمین کو پانی پر بغیر ارکان (ستونوں اور دیواروں) کے پھیلایا"۔ یہ دعا بحار وغیرہ دیگر کتابوں میں مَیں نے دیکھی ہے +

اس کی مؤیدہ شرعی دلیلیں بھی ہیں۔ جو زمین کی حرکت پر دلالت کرتی ہیں۔ (خواہ حرکت روزانہ ہو۔ یا سالانہ) جن کا ذکر آئندہ ہوگا۔ نیز اس کی مؤیدہ حدیثیں بھی ہیں۔ جو زمین کے گول ہونے اور آفتاب کے طلوع وغروب کے تفرقہ پر دلالت کرتی ہیں۔ کیونکہ اگر زمین کسی چیز پر قائم ہوتی۔ تو نہ متحرک ہوتی۔ نہ گردش کرتی۔ اور جب کہ ثابت ہے۔ کہ گردش کرتی ہے۔ تو لامحالہ ماننا پڑیگا۔ کہ کسی شئے پر قائم نہیں ہے۔ بلکہ مثل دیگر کرات کے فضا میں قوت جاذبہ باہمی کے ذریعہ سے قائم ہے +

ہاں یہاں پر ایک شبہ ہو سکتا ہے۔ کہ بعض اخبار و احادیث میں یہ بھی وارد ہے۔ کہ

زمین مچھلی پر خلق کی گئی ہے۔ یا یہ کہ بیل کے سینگ پر وغیرہ وغیرہ۔ تفسیر در منثور کی ایک حدیث میں یہ بھی ہے۔ کہ "زمین بیل کے دو سینگوں کے درمیان میں ہے"۔ باوجودیکہ دلیلوں سے ثابت ہو گیا ہے۔ کہ زمین فضا میں معلق ہے۔ چاروں طرف اُس کے کرۂ ہوا محیط ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اکثر فضلا نے اِس قسم کی حدیثوں کو ان کے ظاہری معنوں پر نہیں مانا ہے۔ بلکہ اکثروں نے معانی باطنیہ کی طرف ان کی تاویل کی ہے۔

مگر خدائے تعالےٰ نے اپنے فضل و احسان سے مجھ پر ان حدیثوں کا سربستہ راز اس طرح منکشف فرمایا ہے۔ کہ دراصل اس عبارت میں مضاف محذوف ہے (مضاف کا حذف ہونا کلام عرب میں شایع و مشہور ہے۔ کوئی نئی بات نہیں ہے)۔ اس بنا پر معنی یہ ہونگے کہ "الارض خلقت علی شکل قرن الثور" زمین پیدا کی گئی ہے بیل کے سینگ کی صورت پر (نہ کہ خود سینگ پر)۔ جیسا کہ جدید فلاسفروں کا خیال ہے۔ اِس لحاظ سے زمین کی شکل اور بیل کے سینگ میں چند طرح کی مناسبتیں پیدا ہوتی ہیں:- (۱) یہ کہ سینگ اپنے دائیں اور بائیں سے مدور ہوتے ہیں۔ اسی طرح زمین بھی جانب مشرق و مغرب میں مستدیر ہے۔ شاید یہی مطلب اُن اخبار کا ہو۔ جن میں یہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ اُس ثور (بیل) کا ایک سینگ مشرق میں ہے۔ اور دوسرا مغرب میں۔ (اس سے سچ مچ کا بیل مراد نہیں ہے۔ بلکہ زمین کی شکل بیان کرنی مقصود ہے)۔ نیز ایک عجیب بات یہ بھی ہے۔ کہ یہ تشبیہ جو یہاں دی گئی ہے۔ سبب اُس کا بظاہر یہ ہے۔ کہ اس خاص کیفیت کا امتداد جو شاخ گاؤ میں پایا جاتا ہے۔ تقریباً اور کسی جانور کی شاخ میں نہیں پایا جاتا۔

(۲) یہ کہ شاخ گاؤ جانب اعلےٰ و اسفل میں مسطح ہے۔ اور جانب راست و چپ میں محدب مستدیر ہے۔ اور تمہیں معلوم ہو چکا ہے۔ کہ نیوٹن وغیرہ متاخرین کی یہی رائے ہے۔ کہ زمین جانبین سے تو مستدیر (گول) ہے۔ مگر قطبین کی طرف سے مسطح ہے۔ اور یہ بھی ہم نے بیان کر دیا ہے۔ کہ اس باریک مضمون کو جسے اب حکمائے یورپ نے بمشکل آلات دقیقہ کے ذریعہ سے دریافت کیا وہ ہمارے ہاں کی حدیثوں میں بکثرت موجود ہے۔

(۳) یہ کہ کرۂ زمین ہمیشہ ایک مدار بیضوی کی طرف و کنارے پر واقع ہے۔ جس طرح بیل کے سینگ اُس کے سر کے ایک کنارے پر واقع ہیں۔ کہ اگر وہاں سے ایک خط فرضی اُس کی ذقن (ٹھوڑی) تک کھینچا جائے۔ تو بیضوی ہی صورت اُس دائرہ کی پیدا ہو جائیگی۔ اور اگر سارا تمام جسم گاؤ کو فرض کریں۔ تب بھی اُس کی دو شاخیں اُس کے جسم کے ایسے مقام پر نظر آئینگی۔ کہ اگر وہاں سے دم تک

ایک وہمی دائرہ محیط تمام جسم پر کھینچا جائے۔ تو بیضوی شکل کا پیدا ہوگا۔

اُس زمانے کی حالت اور عربوں کی جہالت پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہمارے ائمہؑ علیہم السلام نے جب اور کوئی ذریعہ ان مطالب عالیہ کے بتوضیح بیان کرنے کا نہ پایا۔ (کیونکہ اگر صاف صاف کہ دیتے۔ تو وہ جہال جن کی دماغی قوت اُس کے سمجھنے کی مساعد نہ تھی۔ ہرگز نہ مانتے۔ بلکہ تکذیب کرنے لگتے) تو ایسے ایسے رمز و اشارات و کنایات کی صورت میں بیان فرمایا۔ اور اُن اشارات میں ایسی مثالیں دکھلادیں۔ کہ اگر آئندہ کسی وقت کوئی عاقل غور کرے۔ تو ان مطالب تک پے لیجا سکے۔

اسی طرح کی تاویل اُس حدیث کی بھی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ زمین مچھلی پر پیدا کی گئی ہے چنانچہ ہم اسے آئندہ مسئلہ تعدد زمین کے نویں مقالہ میں تفصیل سے لکھینگے۔ اور وہاں یہ مسئلہ حل ہو جائیگا۔ کہ ساتوں زمینیں خدائے تعالٰے نے مچھلی کی صورت پر پیدا فرمائی ہیں۔

ایک احتمال اس قسم کے کنایات و اشارات میں یہ بھی ہے۔ کہ جو لوگ ائمہ علیہم السلام کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اُن سے سوالات کرتے تھے۔ کئی قسم کے آدمی تھے۔ کچھ تو وہ آتے تھے۔ جن کو صحف انبیاء اور کتب قدیمہ یاد تھیں۔ جن میں اس قسم کا بیان تھا۔ کہ زمین بیل کے سینگ پر پیدا کی گئی ہے یا مچھلی کی پشت پر۔ اور بطریق امتحان ہمارے حضراتؑ سے سوال کرتے تھے۔ تو معصومؑ موافق اُن کے خیال و اعتقاد کے جواب دیتے تھے۔ تاکہ مطابق اُن کے مقصود کے ہو۔ دوسری قسم کے وہ لوگ ہوتے تھے۔ جو محض جاہل و بے حس تھے۔ اگر اُن سے آپ فرماتے۔ کہ زمین مثلاً باوجود اس ضخامت و بزرگی کے ہوا میں معلق ہے۔ اور گردش محوری کرتی ہے۔ تو ہرگز اُنہیں اعتبار نہ ہوتا۔ بلکہ جھٹلانے لگتے۔ کہ یہ کیسی بے قرینہ بات فرمائی۔ لہٰذا ہمارے حضراتؑ کا فرض تھا۔ کہ ایسا جواب دیتے۔ جس سے جاہل و عالم دونوں کو فائدہ ہو۔ اسی وجہ سے فرمایا۔ کہ زمین مثلاً شاخ گاؤ پر ہے۔ یعنی شاخ گاؤ کی شکل پر ہے۔ جب پوچھا کہ وہ گاؤ (بیل) کس چیز پر ہے۔ فرمایا مچھلی پر ہے۔ یعنی مچھلی کی صورت پر ہے۔ پھر جب پوچھا۔ کہ مچھلی کس شے پر ہے۔ تو فرمایا۔ پانی پر ہے۔ پھر جب پوچھا۔ کہ پانی کس چیز پر ہے۔ تو فرمایا۔ ظلمت پر ہے یعنی ظل ارض پر یا قدرت خدا پر۔ اسی مقام پر کبھی یہ بھی فرما دیا کرتے تھے۔ هیهات هیهات ضلّ هٰهنا علم العلماء "یہی وہ مقام ہے۔ جہاں علماء کا علم گم ہے" یہ تمام جواب حق و صدق ہیں مگر سمجھنے والا درکار ہے (کیونکہ مطلب ظاہری یہی ہے۔ کہ خواہ گاؤ کہئے یا مچھلی وہ تو صورت زمین کی

ہے۔ اور زمین کے گرداگرد پانی محیط ہے۔ جس سے یہ کہنا بالکل درست ہے۔ کہ زمین پانی پر ہے۔ اور پانی کے گرداگرد ہوا محیط ہے۔ اور نیچے کی جانب ظل مخروطی زمین کا ہے جس کی وجہ سے یہ کہنا بہت صحیح ہے۔ کہ پانی ظلمت پر ہے۔ یعنی اُس ظل مخروطی پر جو زمین سے پیدا ہوتا ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال +

تیسرا مسئلہ

کرۂ زمین کی حرکت کے بیان میں

کیوں جناب! آج کل یہ کیا مشہور ہو رہا ہے۔ "کہ زمین مع تمام اُن چیزوں کے جو اُس پر ہیں حرکت کرتی ہے۔ اور آفتاب وغیرہ کواکب زمین کے گرد بحرکت یومیہ گردش نہیں کرتے۔ بلکہ زمین ہی خود ہر چوبیس گھنٹہ میں ان کواکب کے گرد حرکت کرتی ہے۔ اسی کی گردش کی وجہ سے طلوع و غروب ہوتا ہے" اگر یہ خیال صحیح ہے۔ تو بتائیے۔ کہ شریعت نے اس کے بیان سے کیوں سکوت کیا؟

الجواب

بظاہر نظر تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ زمین ساکن ہے۔ اور اجرام سماویہ (آفتاب و ماہتاب و سیارات) اُس کے گرد روزانہ و سالانہ حرکت کرتے ہیں۔ یہی اعتقاد ایک مدت دراز سے لوگوں کے دلوں میں جما ہوا بھی ہے۔ یہاں تک کہ لوگ اس مسئلہ کو اوضح واضحات وابدہِ بدیہیات سے سمجھنے لگے ہیں۔ اسی وجہ سے گردش زمین کا مسئلہ ایسا کمزور سمجھا جاتا تھا۔ کہ حکماء بھی اس کی تجویز میں لسپا نظر آتے تھے +

مگر اول اول اس خیال کی مخالفت اور اس رائے جدید کا استکشاف حکیم (فیثاغورس) نے کیا اور اُس کی موافقت (فلوطرخوس) اور (ارخمیدس) نے کی۔ پھر دو سو برس بعد حکیم (استرخوس) ساموسی نے اُس کی رائے کی تقویت کی۔ اُسی نے یہ بھی طے کیا۔ کہ زمین کی گردش سالانہ آفتاب کے گرد بھی ہے۔ یہاں تک کہ لوگوں نے اس رائے کی وجہ سے اُس پر کفر کا فتوےٰ دیا۔ پھر نصف صدی

بعد (کلیانتوس) اسوسی نے زمین کے لئے دو حرکتیں محسوس کیں۔ اُس پر بھی حکم کفر لگایا گیا۔ اُس کے بعد حکیم (بطلیموس) کا ظہور ہوا جس نے سکون زمین کی رائے اختیار کی۔ جو عام خیالات کے موافق تھی۔ پھر اجرام سماویہ و حرکات فلکیہ کی ترتیب وغیرہ حسب بیان کتاب مجسطی اُس نے قائم کی جیسا کہ ہم نے مختصر پچھلے مقدمے میں لکھا ہے ✤

اِس بطلیموسی نظام کو پھر تو شہرت ہوئی۔ یہاں تک کہ اسلامی فلسفیوں نے بھی اسی کی ہیئۃ کی تنقیح کرنی شروع کی۔ اور جو اعتراض اُس پر پڑا۔ اُس کے دفع کی کوشش کرنے لگے۔ البتہ ہمارے مذہب کے دو عالم ایک علامہ طوسی خواجہ نصیر الدینؒ اور فاضل عاملی بہاء الدین علیہ الرحمہ فرماتے تھے۔ کہ اگر زمین کو متحرک تسلیم کیا جائے۔ تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ (بظاہر صاف نہ کہنے کا یہ سبب تھا۔ کہ عوام الناس سے ڈرتے تھے۔ ورنہ دلیل سے وہ سمجھ گئے تھے۔ کہ زمین متحرک ہے)۔ اُس وقت تک اہل فرنگ بالکل تاریکی جہالت میں پڑے ہوئے تھے۔ اور مسلمانوں ہی کے علم کے محتاج تھے حسب مقولہ پروردگار عالم فرماتا ہے۔ (تلک الایام نداولھا بین الناس) اُس وقت مسلمانوں کا عروج تھا۔ اور یورپین پوپ عموماً علوم عقلیہ کے پڑھنے اور اُس میں مشتغل ہونے کو حرام بتاتے اور مُنہ بند کرتے تھے۔ اور جو بات اُن کے گرجا کے بظاہر خلاف ہوتی۔ اُس کے ظاہر کرنے سے لوگوں کو منع کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ہزاروں علماء فرنگ کو جنہوں نے مسلمانوں سے اکتساب علوم کیا تھا آگ میں جلا دیا۔ کتنوں ہی کو جلاوطن کر دیا۔ چنانچہ حکیم (براقو) جب کہ حرکت زمین کا قائل ہوا (قبل سنہ ہجری کے)۔ اُس کو اوّلاً جلاوطن کیا۔ پھر چھ برس تک قید رکھا۔ آخر میں اُس کو مع اُس کے کتب خانے کے آگ میں جلوا دیا۔ اور حکیم (غالیلو) نے بعد ایک ہزار ہجری کے زمین کی دو حرکتوں کا قول اختیار کیا۔ اُس کو ذلیل کرایا گیا۔ اور شدید ظلم اُس پر ہوئے۔ یہاں تک کہ قریب بہلاکت ہو گیا۔ پھر اُس کو ایک مدت دراز تک قید رکھا۔ اور اُس کے حقوق علمیہ کا کچھ خیال نہ کیا ✤

اِس سبب سے حکمائے فرنگ اپنی رائے کو چھپانے لگے۔ اور پادریوں کے خوف سے اپنی کشفیات و تحقیقات کو مخفی کرنے لگے۔ یہاں تک کہ پارلیمنٹری ملک ہوا۔ خیالات کو آزادی ملی۔ سد حشتیں مرفوع ہوئیں۔ اور قلم و زبان کو اپنے مطالب کے اظہار میں جرأت ہوئی۔ پھر تو عام طور پر علماء و حکماء فرنگ نے میدان علم میں ذہن کے گھوڑے دوڑانے شروع کئے۔ اور عجائب و غرائب تحقیقات کو ظاہر کرنے لگے۔ جسے آج ہر بزرگ و خورد۔ ذکی و غبی جانتا اور بسبب آزادی عام

کے ظاہر کر سکتا ہے +

اس حیرت کے دور میں سب سے پہلے حرکت زمین کا مسئلہ (کردینال دی کورا) نے اختیار کیا۔ اُس کے بعد (کردینال النیاکوس) نے۔ پھر (جون مولر) نے۔ لیکن ان لوگوں نے کھلم کھلا اس مسئلہ کو بیان نہیں کیا۔ اور نہ کوئی دلیل کافی ہی اس مطلب پر قائم کر سکے۔ آخر (کوبرنیک) نے حدود سنہ ایک ہزار ہجری میں اولاً قویۃً اس دعوے کے ثبوت میں قائم کر کے رسالے اور کتابیں لکھیں۔ بایں سبب اس کو ہیئۃ جدیدہ کا بانی اور زندہ کرنے والا لوگ سمجھتے ہیں۔ اور دیگر حکمائے نے بھی اسی کی رائے اختیار کی۔ بالفعل یہی نظام عام طور پر مشہور ہے۔ اور حرکت زمین کا مسئلہ مسلمات سے ہو گیا ہے۔ کیونکہ اب بہت سے شواہد علمیہ اُس پر قائم ہو گئے ہیں۔ اور (فوکلٹ) کے تجربات جو بذریعہ قطب نما ہوئے۔ وہ بھی اس کے مؤید ہیں۔ نیز بلندی سے گرنے والی وزنی چیز کا میلان مشرقی جانب میں۔ اور آلہ (جیروسکوپ) اور انحراف نور اور اعتدال ربیعی اور اعتدال خریفی کا ایک دوسرے سے گھٹنا بڑھنا اور بارش کے قطروں کا مشرقی جانب میں بہ نسبت مغربی جانب کے دو میل کے فاصلہ سے ایک ہی ساعت میں زمین پر گرنا وغیرہ وغیرہ بھی اسی رائے کو تقویت دیتے ہیں +

خلاصہ یہ کہ حرکت زمین کا مسئلہ زمان گذشتہ میں از بسکہ ایک عجیب بات سمجھا جاتا تھا اور عوام اُس کے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اگر انبیاء سابقین علیہم السلام نے بایں خیال کہ اُن کے فرائض کے پورا ہونے میں خلل نہ ہو بیان نہ فرمایا۔ تو کچھ مضائقہ نہیں۔ کیونکہ اگر وہ بیان فرماتے۔ اور لوگ اُسے قبول نہ کرتے۔ بلکہ اُلٹے تکذیب کرنے لگتے۔ تو اصل مطلب ہی اُنکا فوت ہو جاتا (یعنی ہدایت و تعلیم عبادات)۔ نیز اس کے نہ بیان کرنے میں کسی کے امور معاش و معاد میں خلل بھی نہ پڑتا تھا۔ تو بمصلحت ملکی و بخیال حفظ ناموس سیاست اگر حضرات متعرض نہ ہوئے۔ تو کوئی استبعاد نہیں ہے۔ باقی رہا اسلام۔ تو اُس کا ظہور اُس زمانہ میں ہوا۔ جب کہ جہالت کے پھریرے لہرا رہے تھے۔ اور ہر طرف اوہام پرستی ہی کی دھوم تھی۔ لہذا اس نے اپنے زمانے کے لوگوں کے ساتھ عاقلانہ رفتار کی۔ ابتداءً تو بطریق اختصار و اجمال اس مطلب کو ظاہر کیا۔ بعد ازاں جس قدر عوام کے دماغ علمی روشنی سے منور ہوتے گئے۔ اُسی کے مطابق تفصیل بھی دیتا رہا۔ چنانچہ ذیل کی دلیلوں سے جو ظاہر قرآن و حدیث سے ماخوذ ہیں یہ مطلب واضح ہوتا ہے +

(قرآن مجید) میں چند آیتیں حرکت زمین کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ (۱) سورۂ نازعات

میں (والارض بعد ذٰلک دحٰھا اخرج منھا مائھا ومرعاھا والجبال ارساھا) "خدائے تعالےٰ نے بعد اس کے زمین کو متحرک کیا۔ اُس سے پانی اور سبزہ وغیرہ نکالا۔ اور پہاڑوں کو میخ کی طرح اُس پر گاڑا" +

اِس آیت سے اور نیز اس کے بعد دوسری دو نو آیتوں سے جناب علامۂ کامل سید محمد حسین شہرستانی کربلائی متوفی ۱۳۱۵ھ ہجری نے حرکت زمین کا مسئلہ مستنبط فرمایا تھا۔ اور ایک رسالہ میں جو ۱۳۱۳ھ میں شائع ہوا تھا تحریر فرمایا تھا۔ مَیں اُن کی تحریر کو کسی قدر مشرح طور پر بیان کرتا ہوں :۔

"دحوالارض" ایک ایسا لفظ ہے۔ جو اسلامی شریعت کے اقوال میں عام طور پر متواتر و مشہور ہے۔ مگر اس زمانہ تک اہل اسلام اس سے یہی سمجھتے رہے تھے۔ کہ مراد اس سے زمین کا پھیلانا اور بچھانا ہے۔ جہاں کہیں حدیث میں یہ لفظ ملتا۔ اُس کی تفسیر بچھانے سے کرتے۔ حالانکہ کتب لغت اور مقامات استعمال عرب کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ "دحو" کے معنی بچھانے کے نہیں ہیں۔ بلکہ کچھ اور ہی مراد ہے۔ (یعنی دفع و تحریک) بہت سے اہل لغت نے تو "دحو" کے معنی بچھانے کے لکھے ہی نہیں۔ اور جن لوگوں نے لکھا ہے۔ اُنہوں نے جہاں اور بہت سے اس کے معنی بتائے ہیں۔ بچھانے کے معنی بھی لکھے ہیں۔ (پس بالخصوص یہی معنی "دحو" کے لینا اور دیگر معانی سے قطع نظر کرنا بالکل بلاوجہ معلوم ہوتا ہے)۔ ان کتابوں کے دیکھنے سے ظن قوی اسی امر کا پیدا ہوتا ہے۔ کہ جو معنی لفظ "دحو" کے عام عربوں کے کلام میں ہیں۔ اور جو اہل لغت نے سمجھے ہیں۔ وہی معنی قرآن و حدیث میں بھی مراد ہونگے۔ (کیونکہ قرآن و حدیث کے محاورات خلاف لسان عرب نہیں ہو سکتے)۔ مگر ازبسکہ مسلمان علماء کے ذہنوں میں نظام بطلیموسی جگہ کئے ہوئے تھا۔ اور حرکت زمین کا خیال بھی اُن کو نہ آتا تھا۔ بلکہ اسے محال سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے ان لوگوں نے اپنی تفسیروں میں حرکت کے معنی کو ترک کر کے بسط (بچھانے) کے معنی لکھ دئے۔ مفسرین کی اسی خودرائے کا نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ آپس میں ان میں سخت اختلاف پیدا ہوئے۔ اور مسلمانوں میں تفرقے پڑ گئے۔ اور آئندہ بھی اس تفسیر بالرائے سے یہی خرابیاں ہونگی +

اب مَیں اُن شواہد کو پیش کرتا ہوں۔ جس سے "دحو" کے معنی حرکت کے ثابت ہوتے ہیں۔ اور یہ کہ "دحو" دفع (دھکیلنے) اور دحرجۃ (لُڑھکانے) کو کہتے ہیں جس سے ثابت

ہوگا کہ زمین کی حرکت دو حرکتوں وضعیہ اور انتقالیہ سے مرکب ہے۔ ایک حرکت وضعیہ یومیہ
ہے۔ دوسری حرکت انتقالیہ سنویہ ہے۔ **قاموس** میں ہے۔ (دحیت الابل ای سقتہا)
"دحیت الابل" کے معنی یہ ہیں۔ کہ "میں نے اونٹ کو ہنکایا"۔ (والمدحاۃ خشبۃ یدحی بہا الصبی
فتمر علی الارض لا تاتی علی شیٔ الا اجتحفتہ معہا) اور مدحاۃ اُس لکڑی کو کہتے
ہیں۔ جسے لڑکے لڑھکاتے ہیں۔ وہ لکڑی جس چیز پر ہو کے گزرتی ہے۔ اُسے بھی اپنے ساتھ لڑھکاتے
ہوئے لے جاتی ہے۔ یہ حرکت جو اس لکڑی میں پائی جاتی ہے۔ وہ بھی دو قسم کی حرکتوں سے
مرکب ہے۔ ایک تو اس میں دوری حرکت پائی جاتی ہے۔ جسے آپ حرکت وضعیہ کہئے۔ اور
دوسری حرکت انتقالیہ ہے۔ یعنی ایک مقام سے دوسرے مقام پر بھی منتقل ہوتی ہے۔ اس
لحاظ سے زمین کی حرکت کو "دحو" سے تعبیر کرنا نہایت ہی مناسب ہے۔ کیونکہ متاخرین کے
نزدیک یہ امر ثابت ہے۔ کہ زمین اپنی حرکت انتقالیہ میں اگر کسی چھوٹے کرہ سے ملاقی ہوتی
ہے۔ تو اُسے بھی اپنے ساتھ کھینچتی ہوئی لے جاتی ہے۔ (جس طرح چوب مدحاۃ) +
(لہذا معلوم ہوا۔ کہ "دحو الارض" کے معنی تحریک زمین کے ہیں نہ بسط کے) +
(نیز) راغب اصفہانی نے اپنی کتاب مفردات میں لکھا ہے۔ (والارض بعد ذلک
دحاہا ای ازالہا عن مقرّہا وھو من قولہم دحا المطر الحصا عن وجہ
الارض فیدحو ترابہا ومنہ ادحی النعام) یعنی والارض بعد ذلک دحاہا کے معنی یہ ہیں
کہ خدائے تعالیٰ نے زمین کو اُس کے مقام اصلی سے ہٹایا۔ اور حرکت دی۔ یہ لفظ عرب
کے اس محاورہ مذکورہ سے مشتق ہے۔ (دحا المطر الحصا) یعنی بارش کے پانی نے کنکریوں
کو زمین سے ہٹا دیا۔ اور مٹی کو اُس کی دفع کر دیا۔ اسی معنی میں ادحی النعام بھی ہے۔ یعنی
شترمرغ کو ہنکایا"۔ (نیز) جناب امام المتقین امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کے
اوصاف میں یہ لفظ مشہور ہے۔ کہ آپ "داحی باب خیبر" ہیں۔ یعنی دروازہ خیبر کو اُکھاڑ کر
پھینکنے والے +

جب کسی کو پھینکا جاتا ہے۔ تو اُس میں غالباً دو حرکتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک حرکت
انتقالیہ۔ دوسری حرکت وضعیہ۔ یہی حالت حرکت زمین کی بھی ہے۔ (نیز) صحاح جوہری
میں ہے۔ (الادحوۃ مبیض النعام فی الرمل لانہا تدحوہ برجلہا ثم تبیض
فیہ) ادحوہ اُس مقام کو کہتے ہیں۔ جہاں ریت میں شترمرغ انڈے دیتا ہے۔ کیونکہ پہلے

وہ بیت کو ہٹاتا ہے۔ پھر اُس میں انڈے دیتا ہے +

(نیز) کتاب اقرب الموارد میں ہے۔ (دحی المطر الحصی عن وجہ الارض دفعھا و یقال للاعب بالجوز ابعد المدی وادحہ ای ارمہ ومرّ الفرس یدحو دحوًا دحی بیدیہ دمیًا الخ) بارش کے پانی نے سنگریزوں کو زمین سے ہٹا دیا۔ اخروٹ سے جو لڑکے کھیلتے ہیں۔ اُن سے کہتے ہیں "ابعد المدی وادحہ" اسے دور پھینکو۔ جب گھوڑا اپنے دو اگلے پاؤں سے خاک کو اُڑاتا ہُوا چلتا ہے۔ تو کہتے ہیں "مرّ الفرس یدحو"۔ پس صورت "دحو" کے معنی حرکت دینے۔ پھینکنے۔ لڑھکانے وغیرہ کے نکلتے ہیں۔ اور یہی معنی "دحوالارض" کے بھی ہیں یعنی زمین کو لڑھکانا۔ حرکت دینا۔ پھرانا۔ گردش دینا وغیرہ وغیرہ +

(نیز) کافی وغیرہ کتب احادیث میں تمیم بن حاتم سے مروی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم امیرالمومنین علیہ السلام کے ہمراہ تھے۔ (فاضطربت الارض فدحاھا بیدہ ثم قال لھا اسکنی) دیکھا کہ زمین کو زلزلہ ہُوا۔ تو آپ نے اپنے دست مبارک سے زمین کو ٹھوکر دی۔ پھر فرمایا۔ کہ ٹھیرجا۔ یہاں بھی "دحا" کے معنی ضرب و دفع کے بمناسبت مقام پیدا ہوتے ہیں۔ (نیز) بحار وغیرہ میں امیرالمومنین علیہ السلام سے ایک طولانی حدیث میں مروی ہے۔ (فلما خلق اللہ الارض دحاھا من تحت الکعبۃ ثم بسطھا علی الماء فاحاطت بکل شیء) "جب خدائے تعالےٰ نے زمین کو پیدا کیا۔ تو پہلے اُسے حرکت دی کعبہ کے نیچے سے۔ پھر اُسے پانی پر پھیلایا۔ تو اُس نے ہر شئے کو گھیر لیا"۔ یعنی کروی صورت کی ہو گئی)۔ اس حدیث میں اگر "دحی" کے معنی بچھانے کے ہوتے۔ جیسا کہ لوگ سمجھتے ہیں۔ تو دوبارہ "ثم بسطھا" فرمانے کی ضرورت حضرت کو نہ ہوتی۔ "دحاھا" پر عطف کرنا "بسطھا" کو صاف بتا رہا ہے۔ کہ ان دونوں کے معنی الگ الگ ہیں۔ خصوصاً جبکہ حرف "ثم" سے عطف کیا گیا ہے +

اس حدیث سے کرویت زمین بھی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ آپ نے فرمایا ہے۔ (فاحاطت بکل شیء)۔ "احاطہ" سے مراد اُس کی استدارہ (گولائی) ہے۔ اور "شیء" سے شئے ارضی ہے یعنی ہر ارضی شئے کو اُس نے گھیر لیا +

اور نیز یہ ترتیب کہ پہلے زمین کو پیدا کیا۔ پھر اُسے متحرک کیا۔ پھر اُس کو کروی صورت میں کر دیا۔ بالکل حکمائے متاخرین کی رائے سے موافق ہے۔ کیونکہ کرویت کسی شئے میں اُسی وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب کہ اُس کو دوری صورت میں گھُمایا جائے +

(نیز) کتاب نہایہ حافظ (مبارک) معروف بابن اثیر متوفی سنہ ۶۰۶ھ میں ہے۔ (وفی حدیث ابن عمر: فدحی السیل فیہ بالبطحاء ای رمی والقی منہ حدیث ابی رافع قد کنت الاعب الحسن والحسین علیہم السلام (ای فی حالۃ الطفولیۃ) بالمداحی وھی احجار امثال القرصۃ ای مستدیرۃ کانوا یحفرون حفیرۃ ویدحون فیہا تلک الاحجار فان وقع الحجر فیہا فقد غلب صاحبہا والدحو رمی اللاعب بالحجر والجوز وغیرہ۔ وسئل ابن المسیب عن الدحو بالحجارۃ فقال لا باس بہ ای المراماۃ بہا)۔ ابن عمر کی حدیث میں ہے۔ کہ "دحی السیل بالبطحاء" یعنی پانی کی سیل نے سنگریزوں کو دور پھینک دیا۔ انہیں معنوں میں لفظ "مداحی" ابو رافع کی حدیث میں ہے۔ کیونکہ "مداحی" اُس گول پتھر یا گولی کو کہتے ہیں جس سے لڑکے کھیلتے ہیں۔ پہلے ایک گڑھا کھودتے ہیں۔ اور اُس کی طرف اُس گولی کو لڑھکاتے ہیں۔ اگر گولی اُس میں جاتی رہے۔ تو کھیلنے والا جیت گیا۔ ورنہ ہار گیا۔ "دحو" کے معنی ہیں کھیلنے والے کا پتھر۔ اور اخروٹ کو پھینکنا (لڑھکا کر)۔ ابن مسیب سے دریافت کیا گیا تھا کہ دحو بالحجارۃ (گولی کھیلنا) کیسا ہے۔ تو اُس نے کہا۔ کہ کچھ مضائقہ نہیں۔

حاصل یہ کہ "دحو" کے معنی میں حرکت و گردش ضرور پائی جاتی ہے۔ خواہ کسی لفظ کے ساتھ مستعمل ہو۔ "دحو سیل للرمل" ہو۔ یا "دحو لاعب للجوز" ہو۔ اس سے یہ امر ثابت ہوتا ہے۔ کہ حقیقی معنی اس کے یہی ہیں۔ جو عام طور پر لوگوں میں مستعمل ہیں۔ لہٰذا اسی معنی میں "دحو" کو لینا زیادہ مناسب ہے بہ نسبت دیگر معانی کے۔ جس سے ہمارا مطلب اچھی طرح ثابت ہو جائیگا کہ "دحو الارض" کے معنی تحریک زمین کے ہیں نہ بسط زمین کے۔ اور حرکت وضعیہ و انتقالیہ زمین اس سے بخوبی ثابت ہو گی۔ نیز اس مطلب کی مؤید یہ بھی ہے۔ کہ پروردگار عالم نے

سلہ ابو رافع کی روایت میں ہے۔ کہ میں حسنین علیہم السلام کے ساتھ گولی کھیلتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ روایت محض وضعی اور مصنوعی ہے۔ اپنے لئے جواز پیدا کرنے کے واسطے یہ بہانہ نکالا ہے۔ کہ ان حضرات کا بھی نام لے دیا۔ تاکہ لوگ سمجھیں کہ جب فرزند رسول گولی کھیلتے تھے۔ تو دوسروں کے لئے کیا مضائقہ ہے۔ مگر روایت کی لغویت ایسے ہی صاف ظاہر ہے کہ اول تو گولی کھیلنے کا رواج شرفا کے بچوں میں نہیں ہے۔ عموماً ارذال و ادانی لوگ اس کا شغل رکھتے ہیں پھر کیونکر ہو سکتا ہے۔ کہ رسول زادے اس کے مرتکب ہوتے۔ علاوہ بریں کہ گولی کھیلنا ایک قسم کا قمار ہے جس میں ہار جیت ہوتی ہے۔ اور شان فرزند رسول اس سے بہت ابرفع ہے۔ کہ معاذ اللہ وہ قمار بازی کریں۔ خاک بدہان راوی۔ مترجم۔

بعد ذٰلک دحاھا کے فرمایا ہے۔ اخرج منہا ماءھا ومرعاھا (چشمہ اور سبزہ اُس سے نکالا) پانی کا چشمہ نکلنا اور سبزہ زار و نباتات و اشجار کا پیدا ہونا اور ان کے تغیرات سب کے سب زمین کی حرکت یومیہ و سنویہ پر متفرع ہیں[1]۔ کیونکہ اسی صورت میں اختلاف فصول و تغیرات ہوا ہوتا ہے۔ تو بعد بیان حرکت زمین کے اس تفریع کا ذکر کرنا نہایت مناسب تھا۔ جیسے خدا تعالےٰ نے اپنے کلام میں ظاہر فرمایا۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال +

(**دوسری آیت**) سورۂ زخرف میں ہے۔ (الذی جعل لکم الارض مھدا) "جس خدا نے تمہارے لئے زمین کو گہوارہ بنایا" "مھد" عرف و لغت میں اُسے کہتے ہیں۔ جو بچوں کے لٹانے کے واسطے لکڑی یا اور کسی چیز سے بنایا جاتا ہے۔ بچوں کو اُس میں لٹاکر آہستہ آہستہ حرکت دیتے ہیں۔ اور وہ بآرام سوتا ہے۔ اِس لحاظ سے زمین کی تشبیہ مھد سے بہت مناسب ہے۔ کہ زمین بھی گویا بندگان خدا کے واسطے ایک گہوارہ ہے۔ جس میں اُن کو نشو و نما بھی ہوتا ہے۔ اور سوتے بھی ہیں۔ نیز جس طرح "مھد" باوجود سرعت حرکت کے نرم حرکت رکھتا ہے۔ میلان و اضطراب اُس میں نہیں ہوتا۔ اُسی طرح زمین بھی اس فضاء وسیع میں بآہستگی حرکت کرتی ہے۔ نہ اِدھر اُدھر جھکولے کھاتی ہے۔ اور نہ مضطربانہ حرکت ہوتی ہے۔ جس سے اس کے رہنے والوں کے آرام میں کوئی خلل پڑے۔ نیز جس طرح "مھد" اس لئے بنایا جاتا ہے۔ کہ بچوں کی تربیت اُس میں کی جائے۔ انہیں نشو و نما ہو۔ اُسی طرح زمین کی حرکت یومیہ و سالانہ اس لئے قائم کی گئی ہے۔ کہ مو الید ثلثہ (حیوانات و نباتات اور جمادات) کا نشو و نما اس پر ہو۔ اور اچھی تربیت پائیں۔ اس مقام پر شارع اسلام (خدائے تعالےٰ) نے حرکت زمین کے مسئلہ پر اس تشبیہ کے ذریعے سے (زمین کو گہوارہ سے تشبیہ دیکر) لوگوں کو ایک ہزار برس پہلے ہی متنبہ فرما دیا تھا۔ لیکن لوگ بسبب اپنی جہالت اور خودرائی کے اس مطلب کو نہ سمجھ سکے

اذا لم تکن للمرء عین صحیحۃ[2] + فلا غرو ان یرتاب والصبح مسفر

(**تیسری آیت**) سورۂ ملک میں (وھو الذی جعل لکم الارض ذلولا فامشوا فی مناکبھا) "خدائے تعالےٰ نے زمین کو تمہارے واسطے ایک مطیع و فرمانبردار

---

[1] یہ کلام بحث سے خالی نہیں ہے کیونکہ نظام بطلیموسی کی بنا پر بھی آفتاب کی حرکت یومیہ و سنویہ سے ان تغیرات کا پیدا ہونا مسلم اور یقینی ہے۔ ہاں مگر جو اسی امر کے تسلیم کرنے پر موقوف نہیں ہے کہ زمین کو متحرک مانا جائے۔ مترجم +

[2] اگر دو کی آنکھ درست نہ ہو۔ تو اگر وہ روشنی صبح میں شبہ کرے۔ تو کچھ تعجب نہیں + مصحح

ناقہ کی صورت میں بنایا ہے۔ پس تم اُس کے شانوں پر سوار ہو کر چلو"۔
"ذلول" لغت عرب میں خاص قسم کے اُس اونٹ کو کہتے ہیں جو آہستہ روی و سرعت رفتارہ باآسانی سواری دینے میں ممتاز ہو۔ ازبسکہ یہ تینوں صفتیں زمین میں کامل طور پر پائی جاتی تھیں۔ اس وجہ سے ممکن ہے۔ کہ پروردگار عالم نے زمین کو "ذلول" سے تعبیر فرمایا ہو۔ یعنی جس طرح کہ شتر ذلول، نرم رفتار و سریع السیر ہے۔ وہی حالت زمین کی بھی ہے۔ اس مقام پر اگر کوئی دلیل خارجی حرکت زمین کی مانع نہ ہو۔ تو ہم اس لفظ "ذلول" کی تشبیہ سے حرکت ارض کے مسئلہ کو بہت اچھی طرح حل کر سکتے ہیں۔ اگرچہ ظاہر طور پر اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ زمین تمہارے لئے مطیع بنائی گئی ہے۔ جس طرح چاہو۔ اُسے کھودو۔ اُس پر زراعت کرو۔ اُس پر چلو۔ لیکن باوجود اس معنی کے جدید رائے کے منافی بھی نہیں ہے۔ اور بصورت تشبیہ و مجاز اس مطلب کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی دعوے سے کہے۔ کہ واقعی پروردگار عالم نے اس آیت سے حرکت زمین بھی بیان فرمایا ہے۔ تو کسی کو منع کرنیکا حق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ الفاظ آیت کے اس مطلب کے مؤید ہیں۔ باقی حقیقت کا علم خدا کو ہے۔

(چوتھی آیت) سورۂ نمل میں (وترى الجبال جامدة وهى تمر مر السحاب صنع الله الذى اتقن كل شئ) "تم پہاڑوں کو دیکھتے ہو۔ کہ وہ ایک مقام پر جمے ہوئے ہیں (قائم ہیں) حالانکہ مثل ابر کے چل رہے ہیں۔ یہ خدائے تعالےٰ کی صنعت ہے۔ جس نے ہر چیز کو محکم طور پر بنایا ہے"۔ میرے نزدیک اس آیت سے استدلال حرکت زمین پر (فاضل اعتضاد السلطنہ) ابن خاقان فتح علی شاہ شاہ ایران سے پہلے کسی نے نہیں کیا۔ فاضل مذکور نے آج سے پچاس برس پہلے اپنے خیال کو اس آیت کے متعلق ظاہر کر دیا تھا۔ (کہ ظاہر آیت حرکت زمین کو ثابت کرتا ہے) چونکہ یہ آیت کسی قدر شرح چاہتی ہے۔ لہذا گذارش ہے۔ کہ اس آیت سے پہلے کی آیتوں میں (جو اسی سورہ میں مذکور ہیں) قیامت و ہول قیامت کا ذکر ہے۔ اس وجہ سے قدماء مفسرین اس آیت کو بھی اہوال قیامت ہی کے بیان میں سمجھتے تھے۔ لیکن چونکہ بدلائل عقلیہ معلوم ہو گیا ہے۔ کہ زمین حرکت کرتی ہے۔ تو ہمیں حق حاصل ہے۔ کہ اس آیت کو مطلب مذکور کی دلیل سمجھیں اور کہیں کہ اگرچہ اس آیت سے ماقبل خدائے تعالےٰ نے ہول قیامت کا حال بیان کیا ہے۔

لیکن وہ مطلب اس سے پہلے ختم ہوگیا۔ اور یہاں سے زمین کی حرکت کو ظاہر فرمایا ہے۔ تعجب انگیز امر ہے کہ (تفسیر جواہر) میں اس تفسیر کو (یعنی آیت کا مطلب بیان حرکت زمین ہے) قدماء کی تفسیر پر ترجیح دی ہے۔ اور کہا ہے۔ کہ اگر پروردگار عالم کی اس آیت میں بھی قیامت ہی کا ذکر ہوتا۔ جس میں فنا و ہلاک تمام چیزوں کا ہوگا۔ اور اُسے ظاہر فرمانا مطلوب ہوتا۔ تو چاہئے تھا۔ کہ بقاعدۂ بلاغت یوں فرماتا۔ (قہر اللہ الذی یفنی کل شیٔ)۔ "غالب ہے وہ اللہ جو ہر چیز کو فنا کر دیگا (بروز قیامت)"۔ نہ یہ کہ "صنع اللہ الذی اتقن کل شیٔ" فرماتا۔ کیونکہ صنعت اور اتقان کا لفظ فنا و ہلاک کے موقع پر استعمال نہیں ہو سکتا۔ بلکہ خلقت و تکوین کے محل پر اطلاق ہوتا ہے۔ (پس بظاہر الفاظ مطلب پروردگار عالم کا بیان حال خلقت زمین ہے۔ نہ بیان ہلاکت و فنائے زمین۔ جو قیامت میں ہوگا)۔ علاوہ اس کے جو جملے اس آیت کے اندر واقع ہیں۔ وہ بھی حکم فعلی کو بتا رہے ہیں۔ جیسے "تمر مر السحاب" اور "اتقن کل شیٔ"۔ نہ مستقبلی حکم کو جس سے قیامت کا بیان سمجھا جا سکے +

بالجملہ میں نے بھی اس آیت سے چند مطلب کا استفادہ کیا ہے۔ (۱) یہ کہ خدا تعالےٰ نے پہاڑوں کو حرکت زمین کے محسوس کرنے کا آلہ قرار دیا نہ خود زمین کو۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ جو کرہ کہ خود متحرک بحرکت محوری ہو۔ اُس کی حرکت خود اُسی کرہ سے محسوس نہ ہوگی۔ بلکہ اُن چیزوں کے ذریعے سے معلوم ہوگی۔ جو اُس پر قائم کی گئی ہوں۔ یا کسی قسم کے نقوش اُس پر بنے ہوں۔ یا مختلف رنگ ڈالے گئے ہوں۔ یا تضاریس (نشیب و فراز) وغیرہ ہوں۔ کہ جب اُن میں سے کوئی رنگ یا نقش یا نشیب و فراز اپنے مقام سے دوسرے مقام پر ہٹا ہوا نظر آئیگا۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ یہ کرہ حرکت کر رہا ہے۔ یہاں پروردگار عالم نے زمین کی حرکت کے ظہور کی علامت پہاڑوں کو بنایا جو اپنے تحرک سے حرکت زمین کو بتا سکیں +

(۲) یہ کہ پہاڑوں کی نسبت لفظ جمود فرمایا۔ سکون یا رکود نہ فرمایا۔ اِس وجہ سے کہ جو شے منجمد و بستہ ہوتی ہے۔ وہ عام خیالوں میں حرکت سے بہت بعید ہوتی ہے۔ پس اس آیت میں پروردگار عالم نے اس بات کو دکھلایا ہے۔ کہ اگرچہ عام لوگ یہی سمجھ رہے ہیں۔ کہ پہاڑ جمے ہوئے (ایک مقام پر کھڑے ہیں)۔ حالانکہ یہ مثل ابر کے حرکت میں ہیں +

(۳) یہ کہ اس حرکت و رفتار کو "مرور" سے تعبیر فرمایا۔ جس میں آہستہ آہستہ اور نرمی سے چلنا ماخوذ ہے۔ (اور بتا رہا ہے۔ کہ زمین کی حرکت نہایت نرمی سے ہوتی ہے۔ جو اُس کے ساکنین کے واسطے کسی طرح مضر نہیں) +

(۴) پہاڑوں کو ابر سے تشبیہ دی۔ اس وجہ سے کہ جس طرح ابر کی حرکت نرمی سے ہوتی ہے۔ جس طرح باوجود نرم رفتاری کے اُس میں سرعت سیر ہے۔ جس طرح شرقاً غرباً۔ جنوباً اور شمالاً اُس میں حرکت پائی جاتی ہے۔ اُسی طرح زمین کی دسوں حرکتوں میں بھی یہی امور موجود ہیں۔ نیز جس طرح ابر کی حرکت میں استواء و تشابہ ہے۔ وہ ہی حالت حرکت زمین کی بھی ہے۔

(پانچویں آیت) سورۂ سجدہ میں ہے۔ (استوی الی السّماء وھی دخان فقال لھا وللارض ائتیا طوعًا اوکرھًا قالتا اتینا طائعین) "خدائے تعالےٰ سما پر غالب ہؤا۔ درانحالیکہ وہ (محض) دھوآں تھا۔ تو اُس سے اور زمین سے کہا۔ کہ تم دونوں طوعًا یا کرہًا آؤ۔ اُن دونوں نے کہا۔ کہ ہم باطاعت حاضر ہوئے"۔

اِس آیت سے اوّلاً میرے ہی ذہن نے مسئلہ حرکت زمین کو اخذ کیا ہے۔ مختصراً اس کا بیان یوں ہے۔ کہ لفظ "اتیان" (آنا) لغت وعرف میں حرکت حسیہ انتقالیہ میں مستعمل ہوتا ہے۔ (کیونکہ جب کوئی کسی مقام سے آتا ہے۔ تو لامحالہ اُس کو حرکت ہوتی ہے۔ اور انتقال مکانی بھی اُس کے لئے لازم ہے)۔ اور قدماء علماء کے نزدیک ازبسکہ حرکت زمین محال تھی۔ اس وجہ سے ظاہر لفظ کو دوسرے دوسرے معنوں کی طرف تاویل کرتے تھے۔ اور اگر مسئلہ حرکت زمین صحیح ثابت ہو جائے۔ تو ہمیں کیا ضرورت ہے۔ کہ تاویلات سے کام لیں۔ کیوں نہ ظاہر لفظ کی موافقت کریں۔ جو اولےٰ و بہتر ہے۔ خصوصاً جبکہ اسے بھی ملالیں۔ کہ سماء دنیا فقط مادہ اثیر مسفر سے بھرا ہؤا ہے۔ جو زمین کو محیط ہے۔ جسے پروردگار عالم کا کلام "وھی دخان" ثابت کر رہا ہے (یعنی آسمان دھوآں تھا۔ یا دھواں ہے یعنی اثیر مسفر ہے)۔ جسے ہم بھی آئندہ بیان حقیقت سماوات میں اور مسئلہ رجوم میں ثابت کرینگے۔ اور یہ دونوں ہی ایک ساتھ اس فضائے وسیع میں تحرکات مختلفہ وضعیہ وانتقالیہ آفتاب وستارہ ہائے حکیم ہرکول کے گرد کرۂ متنحرجہ کی طرح متحرک ہیں۔ اس بناء پر معنی ظاہر آیت کے یہ ہونگے۔ کہ پروردگار عالم نے سما کی طرف نظر عنایت فرمائی۔ درحالیکہ وہ دُخان تھا۔ یعنی پانی کا بخارہ۔ تو اُس سے اور نیز زمین سے بامر تکوین فرمایا۔ کہ (ائتیا) یعنی اپنے حیز سے منتقل و متحرک ہو۔ خواہ نظام شمسی کا اتباع کرو یا اُس سے کراہت۔ اور دوسرے نظام کی اطاعت کرو۔ (قالتا) تو بزبان حال دونوں نے کہا۔ (اتینا طائعین) ہم باطاعت وخضوع ناموس جاذبیت کی تبعیت کرنے پر تیار ہیں۔ جیسے ہمارے پروردگار عالم نے فرمایا۔ یہ وہ احتمالات ہیں۔ جو ہمارے اذہان میں آسکتے ہیں۔ رہا واقعیت کا معاملہ اُس کا

علم خدائے تعالےٰ کو ہے ۔

خلاصہ یہ کہ جہاں تک ظاہر الفاظ آیات قرآن مجید کو دیکھا جاتا ہے ۔ اُس سے موافقت جدید علم ہیئت ہی کی سمجھ میں آتی ہے ۔ خصوصاً مسئلہ حرکت زمین میں ۔ اور کوئی ایسی آیت نہیں ملتی جو زمین کے کسی حیز مخصوص میں ساکن رہنے کو ثابت کرتی ہو ۔ رہا پروردگار کا یہ ارشاد (جعل الارض قرارا) وغیرہ الفاظ ۔ تو ان سے مراد یہ ہے ۔ کہ خدائے تعالےٰ نے زمین کو اپنی مخلوقات کے لئے جائے سکون و قرار بنایا ہے ۔ نہ یہ کہ زمین بھی فی نفسہ ساکن ہے ۔ اور اگر کوئی کہے ۔ کہ خدا تعالےٰ فرماتا ہے "ہم نے پہاڑوں کو زمین کے لئے میخ بنایا ہے"۔ تو ہم کہینگے کہ اس سے بھی سکون زمین پر دلالت نہیں ہوتی ۔ کیونکہ "میخ" کی دو قسمیں ہیں ۔ ایک خارجی اور دوسری داخلی ۔ (خارجی) میخ تو اس لئے ہوتی ہے ۔ کہ جس چیز کے لئے وہ گاڑی گئی ہے ۔ وہ اپنے مقام سے حرکت نہ کر سکے ۔ جیسے چوپاؤں کے باندھنے کے لئے میخ گاڑی جاتی ہے ۔ اس قسم کی میخ کا مرکز اور جائے نصب عموماً دوسری شے میں ہوا کرتا ہے ۔ نہ خود اُس میں جس کا باندھنا مقصود ہے ۔ مثلاً جانوروں کے باندھنے کے لئے جو میخ نصب کی جاتی ہے ۔ تو یا زمین میں یا کسی دیوار میں ۔ نہ خود اُس جانور کے جسم میں ۔ اور اگر ایسا ہو ۔ تو غالباً وہ جانور ایک منٹ بھی اپنی جگہ پر کھڑا نہ رہے ۔ (داخلی) میخ کی غرض یہ ہوا کرتی ہے ۔ کہ جس میں اُسے گاڑا ہے ۔ اُس کے اجزا باہم مربوط رہیں ۔ اور متفرق نہ ہو جائیں ۔ جیسے تخت یا کواڑ یا کشتی میں جو کیلیں گاڑی جاتی ہیں ۔ اُن کی غرض بقائے اتصال اجزائے تخت وغیرہ ہے ۔ اس قسم کی میخ خود اُسی شے میں نصب کی جاتی ہے جس کے اجزا کا اتصال باہمی قائم رکھنا مقصود ہے ۔ جب یہ معلوم ہو چکا ۔ تو دیکھئے ۔ کہ پہاڑوں کی میخ جو زمین پر گاڑی گئی ہے ۔ وہ قسم اول کی میخ ہے یا قسم دوم کی ۔ ہر عاقل ان پہاڑوں کو دیکھ کر یہی سمجھتا ہے ۔ کہ یہ میخ دوسری قسم کی ہے ۔ یعنی کہ زمین پر اس لئے گاڑی گئی ہے ۔ کہ اجزائے زمین میں تفرق نہ ہونے پائے ۔ اور صورت کرویہ زمین محفوظ رہے ۔ نہ اس لئے گاڑی گئی ہے ۔ کہ زمین کو حرکت سے باز رکھے ۔ کیونکہ اگر یہ مقصود ہوتا ۔ تو یہ میخیں زمین کے علاوہ کسی اور شے میں گاڑی گئی ہوتیں اور زمین اُس میں باندھی جاتی ۔ تاکہ حرکت نہ کر سکے ۔ پس ہماری شریعت میں جو اکثر مقام پر یہ مذکور ہے ۔ کہ خدائے تعالےٰ نے پہاڑوں کو اوتاد یعنی میخیں زمین کی بنایا ہے ۔ اُس سے مطلب سکونِ زمین نہیں ہے ۔ بلکہ بخلاف اس کے اس امر کا اشعار نکلتا ہے ۔ کہ زمین متحرک ہے ۔ علاوہ اس کی میخیں کسی اور جسم میں نصب کی گئی ہوتیں ۔ لیکن چونکہ قدما کے نزدیک زمین ہی تمام کرات

کا مرکز ہے۔ تو بخیال اُن کے لازم ہے۔ کہ زمین ساکن ہی رہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اگر واقعی زمین ساکن ہوتی۔ تو بتائیے۔ کہ اُسے ایسی میخوں کی کیا ضرورت تھی۔ خواہ زمین کو مانع ماننے۔ یا جامد۔ کیونکہ یہ میخیں اُسے حرکت سے ہرگز روک نہیں سکتیں۔ لہٰذا اس غرض سے میخوں کا گاڑنا زمین میں لغو اور بیفائدہ ہوتا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ قدماء علماء اس مقام پر نہایت اضطراب میں پڑ گئے ہیں جیسے علامہ رازی اور علامہ مجلسی علیہ الرحمہ۔ ہاں اگر حرکت زمین کا مسئلہ تسلیم کر لیا جائے۔ تو یہ خرابی ہرگز نہیں ہوتی۔ اور نہ کوئی وجہ اضطراب کی پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ زمین ازبسکہ خاک اور گیلی مٹی کا مجموعہ ہے۔ اور مادہ سخت و صلب سے اس کی ترکیب نہیں ہوتی ہے۔ پس اگر اس قسم کی میخیں پہاڑوں کی اُس پر نہ گاڑی جاتیں تو اجزا اس کے متفرق و منفسخ ہو جاتے۔ اور اس حرکت سریعہ میں کہ ہر منٹ میں اپنی حرکت یومیہ سے چار فرسخ سے زیادہ مسافت طے کر لیتی ہے۔ اور حرکت سالانہ اس سے بھی زیادہ سریع ہے۔ اس کے تمام اجزاء الگ الگ ہو کر متفرق ہو جاتے اور زمین بحیثیت زمین نہ رہ جاتی۔ لہٰذا ایسے پہاڑوں کی اُسے ضرورت تھی کہ تخت وکشتی وغیرہ کی کیلوں کی طرح اس کے اجزاء کو باہم ملائے رہیں۔ اور میلان و میدان اس میں پیدا نہ ہو جس کی طرف اکثر مقام پر قرآن مجید میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ اور احادیث میں بھی مثلاً قرآن مجید میں خدائے تعالیٰ فرماتا ہے "والقی فی الارض رواسی ان تمید بکم" خدا تعالیٰ نے زمین میں گڑے ہوئے پہاڑ اس لئے قائم کئے۔ کہ کہیں زمین تم لوگوں کو جھکولے نہ دے۔ اور اجزا اُس کے متفرق نہ ہو جائیں۔ جس سے تمہیں ضرر پہنچے۔ اور جناب امیر المومنین علیہ السلام کے کلام میں ہے۔ جو نہج البلاغہ میں منقول ہے۔ (ووتد بالصخور میدان ارضہ) پتھروں (پہاڑوں) کے ذریعے سے خدائے تعالیٰ نے اپنی زمین کے جھکولے کو روکا۔ (وعدل حرکاتہا بالراسیات من جلامیدھا) یعنی "زمین کی حرکتوں کو گڑے ہوئے سخت پتھروں کے ذریعے سے معتدل فرمایا"۔

درمنثور میں جناب رسالت مآب صلعم سے مروی ہے۔ کہ آپ نے فرمایا "مدحی اللہ الارض من موضع البیت فمادت ثم مادت فاوتدھا اللہ بالجبال" زمین کو پروردگار عالم نے خانہ کعبہ کے پاس سے متحرک فرمایا۔ تو جھکولے کھانے لگی پھر جھکولے کھانے لگی۔ تب پہاڑوں کی میخ اُس پر گاڑی"۔

اگر قدماء کے اضطراب کو جو ان آیات و اخبار کی وجہ سے اُن کو پیدا ہوتا ہے دیکھیں۔

تو آپ کو یقین ہو جائے۔ کہ فی الواقع یہی رائے صحیح ہے۔ جو متاخرین نے قائم کی ہے۔ (کیونکہ قدماء نے جب ان آیات و احادیث کو دیکھا۔ کہ حرکت زمین کو ثابت کرتی ہیں۔ حالانکہ بطلیموسی فلسفہ اُن کو اس کے ماننے سے روک رہا ہے۔ تو کیا کیا تاویلیں ان کی کی ہیں۔ ان تاویلات کے دیکھنے سے معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ ان کے دل بھی حرکت زمین کے قائل ہیں۔ مگر بسبب اعتقاد فلسفہ بطلیموسی کے زبان سے کہہ نہیں سکتے) +

یہاں تک آیات قرآنیہ کا ذکر تھا۔ اب اخبار رسول اللہؐ و ائمہ معصومین علیہم السلام کو دیکھئے۔ اگرچہ ایسے اخبار و احادیث کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جو ہمارے دعوے کو ثابت کرتی ہیں۔ مگر ہم صرف پانچ روایتوں پر اکتفا کرتے ہیں +

(**پہلی حدیث**) کتاب احتجاج میں جناب صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ اور کتاب بحارالانوار میں احتجاج سے ہشام ابن الحکم سے روایت کی ہے کہ جناب صادق علیہ السلام نے ایک زندیق کے جوابات میں فرمایا تھا۔ (ان الاشیاء تدل علی حدوثھا من دوران الفلک بما فیہ وھی سبعۃ افلاک و تحرک الارض و من علیھا وانقلاب الازمنۃ واختلاف الوقت)" ساتوں فلک کا گردش کرنا مع اُن چیزوں کے جو اُس میں ہیں۔ اور زمین کا مع اُن چیزوں کے جو اُس پر ہیں۔ حرکت کرنا نیز زمانہ و وقت کا انقلاب و اختلاف۔ یہ سب چیزیں اپنے حدوث پر دلالت کرتی ہیں" اس حدیث میں حضرتؑ کا یہ ارشاد "و تحرک الارض و من علیھا" یعنی زمین کا حرکت کرنا مع تمام اُن موجودات کے جو اُس پر موجود ہیں" صاف حرکت مستمرہ زمین کو ثابت کر رہا ہے۔ جس طرح کہ حرکت و دوران فلک بحالت مستمرہ ہے۔ اس کے سوا اور کوئی معنی اس کلام کے نہیں ہو سکتے۔ یہی حرکت زمین۔ اس سے ممکن ہے۔ کہ حضرت کی مراد حرکت یومیہ ہو یا حرکت سالانہ۔ مگر حرکت روزانہ پر محمول کرنا بہتر ہے۔ کیونکہ حرکت سالانہ زمین کا مسئلہ تو آپ کے اس جملہ "من دوران الفلک بما فیہ" سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس لئے کہ جب آپ نے یہ فرمایا۔ کہ فلک کا گردش کرنا مع اُن چیزوں کے جو اُس کے اندر واقع ہیں۔ تو از بسکہ زمین بھی فلک کے اندر ہی ہے۔ اس کی گردش بھی اس کلام سے ثابت ہو گئی تفصیل اس کی یہ ہے۔ کہ "فلک" متاخرین حکماء کے نزدیک بھی وہی ہے۔ جو ہماری ظاہر شریعت میں ہے۔ جیسا کہ سابق میں بیان کیا گیا۔ یعنی "مدار فرضی کسی جرم علوی کا" پس الیسی فرضی

کا وجود اور اُس کا دوران نہیں ہو سکتا۔ مگر اُس جرم کے ذریعے سے جو اُس میں گردش کرتا ہے۔ (مثلاً زہرہ یا مشتری)۔ تو آپ کا یہ فرمانا کہ (دوران الفلک بما فیہ) اُن اجرام علویہ کی وجہ سے ہے۔ جو اُس کے اندر دورہ کرتے ہیں۔ جیسے محاورہ میں کہتے ہیں۔ (جری النھر) نہر جاری ہوئی" حالانکہ نہر نہیں جاری ہوتی۔ بلکہ پانی جو اُس نہر کے اندر ہے۔ وہ جاری ہوتا ہے۔ مگر مجازاً جاری ہونے کی نسبت نہر کی طرف دیتے ہیں۔ علے ہذا القیاس اور بھی مثالیں ہو سکتی ہیں۔ اور چونکہ سیارات مع زمین کے سات ہیں۔ جیسا کہ زبان شریعت بیان کرتی ہے۔ (ہم آئندہ اسے ثابت کرینگے)۔ اس وجہ سے آپ نے فرمایا۔ (وھی سبعۃ افلاک) یعنی" افلاک بمعنی مدار فرضی ساتوں متحرک زمینوں کے لئے جن میں سے ایک یہ زمین بھی ہے سات ہیں"۔ اس حدیث پر غور کرنے سے ہر عاقل سمجھ سکتا ہے۔ کہ قدیم علم ہیئت سے اس کو کس قدر مخالفت ہے۔ آپ تو فرماتے ہیں۔ کہ افلاک سات ہیں۔ اور حکماے یونان کہتے ہیں۔ کہ افلاک عظام نو ہیں۔ اور اگر چھوٹے چھوٹے افلاک کو بھی ملا لیجئے۔ تو بیسیوں ہو جائیں۔ تو کیونکر ان دونوں میں موافقت ہو سکتی ہے۔ پس لامحالہ یہ ماننا پڑیگا (بنا بر بیان معصوم کے)۔ کہ زمین متحرک ہے۔ اور یہ بھی کہ منجملہ اُن سیارات کے ہے جو بیانات شریعت میں موجود ہیں۔ اور نیز یہ کہ افلاک سے مراد ان سیارات کے مدارات ہیں۔ جن کو باعتبار ان سیارات کے گردش ہوتی ہے۔ (**نکتہ**) حضرتؑ نے جو یہ فرمایا ہے۔ کہ (تحرک الارض ومن علیہا والقلاب الازمنۃ واختلاف الوقت)۔ پہلے حرکت زمین کو آپ نے ارشاد فرمایا۔ اُس کے بعد فصلوں کی تبدیلیاں اور وقت کا اختلاف بیان فرمایا۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ صبح۔ دوپہر۔ شام۔ گرمی۔ سردی۔ ربیع و خریف کا تغیر و تبدل زمین ہی کی حرکت پر متفرع ہے۔ جیسا کہ حکماے متاخرین کی رائے ہے۔ نہ حرکت نجوم و افلاک عظام پر۔ جیسا کہ قدماء یونانین وغیرہم کہا کرتے تھے۔

(**دوسری حدیث**) کتاب کافی کے باب الحج میں ہے۔ نیز کتاب وافی میں اور بحار الانوار جلد ۴ اور ۲۱ میں جناب صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے۔ (ان اللہ عزوجل دحی الارض من تحت الکعبۃ الی منی ثم دحاھا من منی الی عرفات ثم دحاھا من عرفات الی منی)۔ "خدا ے عزوجل نے زمین کو زیر کعبہ سے پہلے منے کی طرف حرکت دی۔ پھر منے سے عرفات کی طرف۔ پھر عرفات سے منے کی طرف"۔ اس

حدیث سے میں ایسا سمجھتا ہوں۔ کہ معصومؑ نے حرکت زمین کا سبب بیان فرمایا ہے (جیسا کہ میں آئندہ کسی دوسری کتاب میں بیان کرونگا)۔ اور یہ کہ پروردگار عالم نے پہلے سبب حرکتِ زمین کو مقام کعبہ میں پیدا کر کے وہاں سے اسے مشرق کی طرف حرکت دینی شروع کی یعنی منےٰ کی طرف۔ پھر وہاں سے منےٰ کی مشرقی جانب کی طرف جو عرفات ہے۔ پھر عرفات کی طرف سے پھرا تا ہوا اس کو مقام کعبہ تک پہنچا دیا یعنی اس کا ایک دورہ یومیہ تمام فرمادیا۔ (کعبہ کے ذکر کی وجہ یہ ہے۔ کہ یہ مکان وسط زمین میں واقع ہے۔ جو مرکز سے جانب فوق کے نقطہ رقمی پر واقع ہے۔ پس لامحالہ جب دوری حرکت ہوگی۔ تو پہلے یہ نقطہ اپنے مقام سے متحرک ہوتا ہوا نظر آئیگا۔ اور خاتمہ دورہ بھی اسی مقام پر ہوگا)۔ نیز ہم پہلی آیت میں اسی مسئلہ کو بیان کر آئے ہیں۔ کہ "دحو" کے معنی حرکت دینے کے ہیں۔ اور یہی یہاں پر "دحی الارض" سے مراد ہے۔ ورنہ اگر "دحو" کے معنی بسط کے لیں۔ تو کوئی وجہ اس تخصیص کی نہیں معلوم ہوتی۔ کہ اوّلاً کعبہ سے منےٰ کی طرف زمین بچھائی گئی۔ پھر منےٰ سے عرفات کی طرف۔ کیونکہ زمین جب کروی ہے۔ تو اُس کا بسط کسی ایک جانب سے خصوصیت نہ رکھیگا۔ بلکہ جب کروی چیز پھیلنی اور بڑھنی شروع ہوتی ہے۔ تو اُس کا پھیلنا ہر طرف سے برابر ہوتا ہے۔ نہ کہ خاص کسی ایک طرف سے۔ ہاں اگر حرکت کے معنی لئے جائینگے۔ تو البتہ اس کی وجہ صحیح یہ نکل سکتی ہے۔ کہ زمین کی گردش یومیہ چونکہ مغرب سے مشرق کی طرف ہے۔ لہذا آپ نے فرمایا۔ کہ اوّلاً اس کی حرکت کعبہ سے منےٰ کی طرف شروع ہوئی۔ جو جانب شرقی میں واقع ہے۔ پھر منےٰ سے عرفات تک۔ پھر گردش کرتی ہوئی وہیں تک پہنچ گئی۔ جہاں سے اس کی حرکت شروع ہوئی تھی +

یہاں اگر کوئی شخص یہ شبہ کرے۔ کہ اگر معصوم علیہ السّلام کو زمین کی گردش بیان کرنی ہوتی۔ تو یہ فرماتے کہ "ثم دحاھا من عرفات الی الکعبہ"۔ تاکہ پورا دورہ ظاہر ہوتا۔ حالانکہ آپ نے فرمایا ہے "من عرفات الی منیٰ"۔ جو اُس کے دورہ سے کہیں زیادہ ہے (تو میں یہ جواب) دونگا۔ کہ منےٰ کی طرف حرکت دینے سے جو تعبیر فرمائی ہے۔ وہ اس بات کی منافی نہیں ہے۔ کہ کعبہ پر اُس کا انطباق ہو۔ کیونکہ طرف کہنے سے یہ سمجھ میں آیا۔ کہ جس طرف سے حرکت شروع ہوئی تھی۔ اُسی طرف ختم ہوئی۔ اگرچہ کعبہ پر ہی آکر ختم ہوگئی ہو۔ علاوہ اس کے اگر یہی مراد ہو کہ منےٰ تک حرکت کا خاتمہ ہوا۔ تو عجب نہیں۔ کہ اس نکتہ کی طرف اشارہ ہو۔ کہ حرکت روزانہ زمین کی اُس کی حرکت محوریہ سے زیادہ ہے۔ کیونکہ تجربات سے ثابت ہو گیا ہے۔ کہ زمین کا

دورۂ روزانہ ۲۴ گھنٹہ میں پورا ہوتا ہے۔ اور اُس کی حرکت محوریہ (اپنے مرکز کے گرد) ۲۳ گھنٹہ ۵۶ منٹ میں پوری ہوتی ہے۔ (پس لامحالہ حرکت روزانہ کے تمام ہونے کے واسطے منیٰ تک پہنچ جانا ضرور ہے۔ اگرچہ حرکت محوریہ کعبہ پر ہی ختم ہو جائیگی)۔ اس کلام میں گویا امام علیہ السلام نے حرکت روزانہ کو اس حسن سے بیان فرمادیا ہے جس سے اُس کی حرکت محوریہ بھی سمجھ میں آجاتی ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے۔ کہ زمین کی حرکت یومیہ دو حرکتوں سے مرکب ہے۔ ایک حرکت محوریہ سے۔ دوسری حرکت سالانہ کے تھوڑے جزو سے۔ اور چونکہ زمین ہر سکنڈ میں بحرکت محوریہ (۴۶۵ میٹر اور بحرکت سالانہ (۳۰۰۰۰) میٹر حرکت کرتی ہے۔ اس بنا پر ضرور ہے۔ کہ اُس کی حرکت محوریہ پر کسی قدر مسافت زمین کا اضافہ کیا جائے۔ تاکہ وہ زیادتی جو حرکت یومیہ کی ہے۔ اُس کے موافق ہو سکے۔ اس کے لئے وہ مسافت جو درمیان کعبہ اور منےٰ کے ہے۔ تقریباً کافی ہو سکتی ہے۔ باقی امر تحقیقی کے اثبات کے لئے دوسرا مقام ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

(تیسری حدیث) عیون الاخبار۔ علل الشرائع۔ بحار الانوار۔ ارشاد القلوب کتاب واحدہ۔ کتاب مختصر۔ مناقب برسی۔ نور الثقلین۔ تفسیر برہان وغیرہ میں جناب امیرالمومنین علیہ السلام سے مروی ہے۔ کہ ایک شامی نے آپ سے سوال کیا۔ کہ مکہ کو مکہ کیوں کہتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا "لان اللہ مک الارض من تحتھا ای دحاھا۔ اس وجہ سے کہ خدا تعالےٰ نے زمین کو اس شہر سے مک فرمایا ہے یعنی متحرک کیا ہے"۔

اس حدیث کا سیاق بھی مثل اُن احادیث کے ہے۔ جن میں "دحو" کا لفظ مستعمل ہے۔ اور "مک" لغت میں چند معنوں کے لئے آیا ہے۔ جن میں سے ایک معنی حرکت دینے کے ہیں بطریق لڑھکانے کے۔ قاموس میں ہے۔ مکّ بسلحہ ای رمی۔ فلاں شخص نے اپنا فضلہ پیٹ سے نکالا۔ (یعنی زمین پر اُسے گرایا) (والمکمکۃ التدحرج فی المشی) مکمکہ کے معنی ہیں چلنے میں لڑھکنا۔ زمین کا فضائے وسیع میں دورہ کرنا اور لڑھکنا اسی معنی کے مناسب ہے۔ ورنہ "مک" کے کوئی ایسے دوسرے معنی نہیں ہیں۔ جو احادیث "دحو الارض" کے سیاق کے مطابق ہو سکیں۔ نیز اس حدیث سے بھی یہی مطلب حاصل ہوتا ہے۔ کہ "دحو" بمعنی تحریک علےٰ طریق الدحرجہ ہے۔ کیونکہ "مک" کے معنی لغت میں بسط کے نہیں آئے ہیں۔ پس معصوم علیہ السلام کا تفسیر کرنا لفظ "مک" کو "دحو" سے صاف بتارہا ہے۔ کہ دونو

ایک ہی معنی میں ہیں یعنی حرکت دینا۔ نہ بچھانے کے معنی میں ہیں۔ علاوہ اس کے بھی جہاں کہیں زبان شریعت سے آپ سنینگے "دحو" کے معنی تحریک ہی کے بظاہر نظر آینگے مثلاً خداتعالے کا یہ کلام (اِنّ اوّل بیت وضع للنّاس للّذی ببکّۃ) "پہلا گھر جو آدمیوں کے واسطے بکہ میں بنایا گیا" "بک" اور "مک" "دحو" اور "دح" وغیرہ الفاظ سب کے سب تحریک خاص کے معنوں میں مستعمل ہیں۔ اسی مناسبت سے مقام خانہ کعبہ کو "بکّہ" سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ کیونکہ تحریک مادّہ زمین اوّلاً اسی مقام سے شروع ہوا ہے۔ قاموس اللغۃ میں ہے۔ (الابك من یسعی فی اموراھلہ والبکیاك القصیر جدًّا اذا مشی ستدحرج) "ابکّ اُس شخص کو کہتے ہیں۔ جو اپنے اہل وعیال کے کام میں سعی کرے۔ اور بکیاک اُس پست قد کو کہتے ہیں۔ جو چلنے میں لڑھکتا ہوا چلے" ان تمام استعمالات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ زمین کی حرکت مقام خانہ کعبہ سے اس طرح شروع ہوئی ہے۔ جیسے کوئی شخص نرنج کو لڑھکائے نیز نہایۃ اللغۃ میں حافظ ابن اثیر کے عطاء سے مروی ہے۔ جو تابعین رسول سے تھا۔ وہ کہتے ہیں۔ (بلغنی ان الارض دحّت من تحت الکعبۃ دحًّا)۔ ابن اثیر اس کی شرح میں لکھتے ہیں (وھو ای دُحّت مثل دحیت) یعنی دُحّت کے معنی مثل دُحّیت کے ہیں۔ والدّح المدفع۔ اور "دح" کے معنی دھکیلنے کے ہیں۔ قاموس میں ہے۔ (اَلدّحُ الدّعَ فی القفا والدح الدفع العنیف والدحدحۃ القصیر المتمشی والدحیدح من یخطی فی لعب المداحی فیقوم علی رجل فیحجل سبع مرات)۔ حاصل یہ ہے۔ کہ "دح" گردن پکڑ کے دھکا دینے کو کہتے ہیں۔ یا زور سے دھکیلنے کو "دحدحۃ" اُسے کہتے ہیں جو بتکلف چلتا ہو "دحیدح" اُس نچے کو کہتے ہیں۔ جو گولی کھیلنے میں خطا کرے۔ اب ایک عاقل آدمی ان کلمات سے بخوبی نتیجہ نکال سکتا ہے "دح" "دحو" "مک" اور "بک" وغیرہ الفاظ سوائے حرکت دینے کے اور کسی معنی میں اس مقام پر مستعمل نہیں ہیں۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ معصومؑ نے اپنے کلام میں جہاں "دحو" کو ارشاد فرمایا ہے۔ اُس سے حرکت زمین کے مسئلہ کو بیان فرمایا ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال +

(**چوتھی حدیث**) قول جناب امیرالمومنین علیہ السلام ہے۔ جو نہج البلاغۃ وغیرہ میں مروی ہے۔ حضرت زمین کی خلقت اور پہاڑوں کے اُس پر قائم کئے جانے کو بیان فرمانے کے بعد ارشاد کرتے ہیں۔ (فسکنت علی حرکتھا من ان تمید باھلھا

اد بشبیخ بجلمها او نزول عن مواضعها) - اس حدیث قدسی کی طرف ہمارے سید علامہ محمد حسین شہرستانی نے اشارہ فرمایا ہے - جسے ہم کسی قدر تفصیل سے بیان کرتے ہیں - کہ "سکنت" میں جو ضمیر ہے - وہ "ارض" کی طرف راجع ہے - اور "علی" اس مقام پر بمعنی مع ہے - اور "من" متعلق ہے "سکنت" سے - اب عبارت کا حاصل یہ ہوا - کہ فسکنت الارض من المید ان مع حرکتہا - یعنی کہ "پہاڑوں کے قائم کرنے سے زمین پر یہ فائدہ ہوا - کہ زمین باوجود اپنے متحرک رہنے کے جھکولے کھانے سے محفوظ ہو گئی" - اس کلام میں امام علیہ السلام نے اس امر کو ثابت کیا ہے - کہ پہاڑوں نے زمین کو اضطراب اور ادھر اُدھر ڈھلکنے سے روک دیا ہے - جیسا کہ دوسرے خطبے میں تصریح سے فرماتے ہیں - (فسکنت من المیدان لرسوب الجبال فے قطع ادیمہا) یعنی "پہاڑوں کے زمین پر گاڑے جانے سے اُس کا اضطراب و میدان (جھکولے کھانا) جاتا رہا" - اس مطلب کو ہم پہلے بھی لکھ آئے ہیں - جس کے دیکھنے سے معلوم ہوگا - کہ حضرتؑ کے اس ارشاد سے سکون زمین مراد نہیں ہے - اسی وجہ سے آپ نے تحرک کی قید اپنے کلام میں بڑھائی - اور فرمایا - کہ فسکنت علی حرکتہا" یعنی "باوجودیکہ زمین متحرک ہے - پھر بھی ساکن ہو گئی" - (یہاں سکون سے مطلب یہی ہے - کہ ادھر اُدھر لڑھکنا - اور ایک حال پر حرکت نہ کرنا جاتا رہا - پہاڑوں کے سبب سے اُس کی حرکت مستقیم و معتدل ہو گئی) - جیسا کہ دوسرے خطبے میں ارشاد فرمایا ہے - (دسکنت الارض مدحوۃ فے لجۃ تیادہ) - یعنی "باوجودیکہ کرۂ آب سے اوپر دحوی حرکت اُس میں موجود ہے - پھر بھی اُسے سکون حاصل ہے" - (سکون اضطرابی نہ بالکل سکون - ورنہ حضرتؑ کے اس کلام کا کوئی صحیح مطلب نہ نکل سکیگا) - اس طرح مختلف صورتوں میں ایک ہی مطلب کو ادا کرنا بلغاء کا طریقہ ہے - (ان تعبیرات رنگا رنگ سے حضرتؑ نے اپنے کلام بلیغ کو مزین فرما کر داد بلاغت دی ہے) +

امیر المومنین علیہ السلام کے ان ارشادات پر اگر آپ پورا غور صرف کرینگے - تو یقین آپکا اس مطلب کی بابت اور زیادہ ہو جائیگا - ملاحظہ کیجئے - کہ آپ پہلے خلقت زمین کو بیان فرماتے ہیں - پھر پہاڑوں کے نصب کو ارشاد فرماتے ہیں جس سے اُس کی حرکت کا اعوجاج زائل ہو - اجزائے زمین متفرق ہونے سے محفوظ رہیں - اور جو چیزیں نباتات و جمادات وغیرہ کی قسم سے اس پر ہیں اس کے اندر دھس نہ جائیں - کیونکہ پہاڑوں نے اپنی سختی کی وجہ سے اس کے اجزا کو باہم خوب متصل کر دیا ہے - تاکہ خلا نہ پیدا ہو سکے - جو اُس کے ساکنان کے لئے مضر ہو -

جیسے حضرت کا یہ کلام ظاہر فرما رہا ہے۔(وتسیخ بحلھا) جس کا حاصل یہ ہے۔کہ پہاڑوں کو خدائے تعالےٰ نے زمین پر اس وجہ سے قائم کیا ہے۔کہ اس کے سکان اس کے اندر غرق نہ ہو جائیں۔نیز یہ فائدہ ہے۔کہ بسبب ہلکے رہنے کے ایسا نہ ہو۔کہ ایک مدار مستدیر پر اس کی حرکت نہ رہ سکے۔جیسے آپ کا یہ کلام ظاہر کر رہا ہے۔(او تزول عن مواضعھا)+

اِس مقام پر بعض لوگوں کا یہ خیال ہے۔کہ لفظ مبدان ارض یعنی اضطراب زمین جو شریعت کی زبان پر جابجا جاری ہوا ہے۔اُس کا مطلب یہ ہے۔کہ اول خلقت میں جب کہ زمین محض مادہ سائلہ متحرکہ تھی مضطرب متحرک تھی۔لہذا پہاڑوں کو اُس پر نصب کر کے حرکت کو اُس کی زائل کیا گیا ہے۔مگر میرا خیال یہ ہے۔کہ اس اضطراب سے مراد اضطراب دائمی ہے۔یعنی کہ اگر اس پر پہاڑ نہ ہوتے۔تو ہمیشہ اس کی حرکت بے ڈول رہتی۔کیونکہ حضرت فرماتے ہیں۔(من ان تمید باھلھا)۔اگر پہاڑ نہ ہوتے۔تو زمین اپنے ساکنین کو لئے جھکولے کھایا کرتی۔اس سے ظاہر ہے۔کہ ابتدائے خلقت زمین ہی سے اس کلام کو تعلق نہیں ہے۔ورنہ کہنے والا کہ سکیگا۔کہ اُس وقت ساکنین واہل کہاں تھے۔جن کو لے کر جھکولے کھاتی۔اسی مطلب کو قرآن مجید کا یہ جملہ ظاہر فرما رہا ہے(والقیٰ فی الارض رواسی ان تمید بکم" خدا نے اس لئے زمین میں پہاڑوں کو نصب کیا۔کہ تم لوگوں کو جھکولے نہ دے"۔اب لفظ کم یعنی تم لوگوں کو" دیکھئے کہ کیا بتا رہا ہے۔صاف مطلب اس کا یہی نظر آرہا ہے۔کہ ایہا الناس اگر جبال عظیمہ زمین پر نہ قائم کئے گئے ہوتے۔تو تم اُس کے اضطراب کی وجہ سے ہمیشہ بیچین رہتے۔یہاں ابتدائے خلقت کی حرکت کا ذکر کہاں ہے۔اس میں عہد رسول خدا صلعم اور سابعد و ماقبل کے لوگوں کو مخاطب کیا گیا ہے۔جن کی پیدائش یقیناً زمانہ خلقت زمین سے بہت بعد ہوئی ہے۔

(نکتہ) حضرت ؑ کے اس جملے سے کہ (او تزول عن مواضعھا) میرے دعوے کی ایک تصدیق اور نکلتی ہے۔یعنی زمین کا مدار مخصوص پر ہی حرکت کرنا۔کیونکہ متاخرین حکماء کے نزدیک زمین کے مواضع[1] بیشمار ہیں۔مگر سب کے سب ایک مدار معین پر بروج دوازدہ گانہ کے مقابل میں حرکت کرتے ہیں۔اس لحاظ سے حضرت ؑ کے اس قول "علی حرکتہا" کی تفسیر اگر

---

[1] یعنی چونکہ زمین اپنی حرکت میں جگہ بدلتی رہتی ہے۔اِس لحاظ سے کہ سکتے ہیں۔کہ اُس کے مواضع یعنی اُس کی جگہیں متعدد ہیں+ مترجم

حرکت سالانہ سے کی جائے۔ اور کہا جائے۔ کہ جہاں اُس کی بے تقربہو بے انداز حرکت کو روکنے والے ہیں۔ نہ اصل حرکت کو۔ تو کچھ مستبعد نہیں ہے۔ البتہ جو لوگ سکون زمین کے قائل ہیں۔ اُن کے نزدیک اس کلام کا مطلب واضح نہ ہوگا۔ کیونکہ اوّل تو جسم ساکن ذو مواضع نہیں ہوتا۔ بلکہ جس جگہ اُس کا قیام ہے۔ وہی ایک اُس کا موضع ہے۔ ہاں حرکت انتقالیہ کے ماننے کی بنا پر اُس میں مواضع مختلفہ نکل سکتے ہیں۔ دوسرے (علے حرکتھا) کہنا درست نہ ہوگا۔ کیونکہ جب ساکن مان لیا ہے۔ تو اُس میں حرکت کہاں۔ (حاصل یہ کہ ظاہر کلام معصوم مسئلہ تحرک ارض کو بتا رہا ہے۔ اور ہم اُس امر کے قبول کرنے کے مکلف ہیں۔ جو فحوائے عبارت سے مفہوم ہو۔ رہا واقعیت کا علم۔ وہ خدا کو ہے ✦

(**پانچویں حدیث**) امیر المومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ جو نہج البلاغہ وغیرہ میں مروی ہے۔ حضرتؑ پہلے زمین کی حالت بیان فرماتے ہیں۔ اُس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں۔ (وعدّل حرکاتھا بالراسیات من جلامیدھا)۔ یعنی خدائے تعالےٰ نے اس (زمین) کی حرکتوں کو پہاڑوں کے ذریعے سے معتدل و مستوی کر دیا۔ اس کلام میں معصوم علیہ السلام نے (حرکاتھا) فرمایا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ زمین کی حرکتیں کئی قسم کی ہیں۔ اُن تمام حرکتوں کو پہاڑوں کے نصب ہونے سے معتدل کر دیا ہے۔ آج کل کی تحقیقات نے بھی یہی ثابت کیا ہے۔ کہ مختلف قسم کے جذب و دفع کی وجہ سے زمین کی کئی حرکتیں پیدا ہوتی ہیں۔ حکمائے یورپ کے نزدیک معروف و مشہور تو پانچ حرکتیں ہیں۔ مگر (فیلکس) نے گیارہ حرکتوں کا قول بھی نقل کیا ہے۔ میں نے جہاں تک انتخاب کیا ہے۔ اُن کی کتابوں سے آٹھ حرکتیں معلوم ہوتی ہیں ✦

(اوّل) حرکت محوری منطقہ استواء پر۔ یہ حرکت زمین کی اپنے جزو اور اپنے اصلی مقام پر ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کو حرکت وضعیہ اور حرکت استوائیہ بھی کہتے ہیں۔ دورہ اس کا ۲۳ گھنٹہ ۵۶ منٹ ۴ سکنڈ میں پورا ہوتا ہے۔ اسی حرکت کی وجہ سے رات اور دن کا ظہور و وجود ہوتا ہے۔ جب اس حرکت کے ساتھ کسی قدر جزو حرکت سالانہ کا ملایا جاتا ہے۔ تو حرکت یومیہ پوری ہوتی ہے۔ اُس وقت پورا دورہ چوبیس گھنٹہ کا ہوتا ہے ✦

(دوم) مرکز آفتاب کے گرد منطقۃ البروج پر دائرہ بیضویہ کی صورت میں اس کی حرکت سالانہ کا دورہ ۳۶۵ دن ۶ گھنٹہ ۹ منٹ ۱۰ سکنڈ میں پورا ہوتا ہے۔ اسی حرکت کے

چوتھا مسئلہ

تعدد زمین کے متعلق

صورت سوال - متاخرین حکمائے یورپ جن کا ظہور ایک ہزار ہجری کے بعد ہوا اس امر کے قائل ہیں - کہ زمین صرف یہی ایک نہیں ہے جس پر ہماری سکونت ہے - بلکہ خدائے تعالیٰ نے اور بہت سی زمینیں پیدا کی ہیں - جو اس فضا میں مثل ہماری اس زمین کے متحرک ہیں معلوم نہیں - شریعت اسلامیہ بھی اسی رائے کی قائل ہے - یا مثل قدماء کے نفی تعدد ارض کرتی ہے - یا دونوں ہی سے ساکت ہے - بینوا توجروا *

الجواب

جہاں تک ہمیں معلوم ہو سکا ہے - وہ یہ ہے - کہ قدماء حکماء نے تعدد زمین کے مسئلہ کو ذکر ہی نہیں کیا - یہاں تک کہ جن لوگوں نے حرکت زمین کی رائے اختیار کی ہے - وہ بھی تعدد زمین کے مسئلہ سے ساکت ہیں - بلکہ اکثر قدیم فلاسفروں نے تعدد زمین کے محال ہونے پر ادلہ قائم کئے ہیں - اور عمدہ اسباب انکار یہ ہے - کہ حواس سلیمہ علاوہ اس زمین کے جس پر ہماری سکونت ہے - دوسری زمین کو محسوس نہیں کرتے - لہٰذا اُس کا وجود بھی نہیں ہے - قدماء کا یہ بھی خیال تھا - کہ سیارات و ثوابت کی ساخت جوہر فلک سے ہے - اُس میں کسی دوسری شے کی سکونت نہیں ہے - نہ ان سیارات و ثوابت پر آبادی ہے - نہ عناصر وغیرہ کا وجود وہاں ہے - البتہ شیخ رئیس ابن سینا نے کتاب شفا میں کثرت زمین کا قول قدماء حکمائے فُرس سے نقل کیا ہے - نیز شاعر کامل ابو محمد معروف بہ نظامی متوفی ۵۷۶ھ نے قدماء فُرس سے ایسے اقوال نقل کئے ہیں - جو جدید تحقیق سے بہت مطابق ہیں چنانچہ فارسی میں کہتے ہیں - ؎

شنیدستم کہ ہر کوکب جہانے است
جداگانہ زمین و آسمانے است

(یہی مطلب ہماری شریعت بھی بیان فرماتی ہے جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا) *

مغربی حکماء (یورپین حکماء) نے سنہ ۱ ہجری کے قریب قدماء کی رائے کو ترک کرکے یہ رائے اختیار کی کہ زمین کی تعداد بہت زیادہ ہے سا ایسا نہیں ہے۔ کہ صرف ایک ہی زمین ہو۔ اور اس کا ذریعہ وہ دوربینیں اور خوردبینیں ہوئیں جنہیں ان لوگوں نے حکیم غالیلہ متوفی سنہ ۱۶۴۲ء کے پرواز پر بنایا۔ نیز دیگر آلات و اسباب بھی امراء و اغنیاء کی مدد سے تیار کئے۔ اور امراء بھی تن اسی امر پر منہمک ہوگئے۔ کہ جہاں تک ہوسکے۔ ان اہل علم کی مدد کرنی چاہئے۔ اور علماء و اذکیاء اس امر پر آمادہ ہوئے۔ کہ تحقیق امر حق کرنی چاہئے۔ خواہ اپنے اوپر کچھ بھی گذرے۔ چنانچہ ان دونوں کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ آج اہل یورپ اوج کمال ترقی پر پہنچ گئے۔ اور عجیب عجیب تحقیقات عامہ ناس کے سامنے پیش کیں۔ خصوصاً علم ہیئت میں ایسی ترقی کی۔ کہ قدماء کو کبھی نصیب بھی نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ اُن کے پاس یہ آلات نہ تھے۔ جو فی الحال ایجاد ہوئے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جس طرح قدماء نہ محسوس ہونے کے سبب سے ایک ہی زمین کے قائل تھے۔ اُسی طرح متاخرین دوربینوں اور خوردبینوں کے ذریعے سے محسوس کرنے کے سبب تعدد زمین کے قائل ہوئے۔ یعنی کہ جتنے سیارات ستارے ہیں۔ وہ سب بجائے خود مستقل زمینیں ہیں۔ اُن میں آبادی ہے۔ پہاڑ ہیں۔ نشیب فراز ہے۔ دریا ہیں۔ ہوائیں چلتی ہیں۔ پانی بہتے ہیں وغیرہ وغیرہ +

(میں کہتا ہوں) اگر فی الواقع یہ بات صحیح ہو جیسے متاخرین کہتے ہیں۔ تو کل سیارات کو "ارض" کہنا بالکل درست ہوگا۔ کیونکہ اہل لغت لکھتے ہیں۔ (کلما توضعہ الاقدام ارض) جس چیز کو قدم کچل سکیں۔ وہ ارض ہے۔ علاوہ اس کے تمام وہ باتیں جو زمین میں پائی جاتی ہیں۔ ان سیارات میں بھی موجود ہیں۔ مثلاً پہاڑ۔ صحرا۔ پانی۔ سمندر۔ ہوا۔ بخارات۔ ابر۔ بارش۔ فصول۔ چاند۔ سیل۔ مدار۔ دن۔ رات اور حیوانات وغیرہ۔ پھر کیا وجہ کہ اُن کو ارض نہ کہا جائے۔ کیا اگر ان صفات کی جامع کوئی کُرہ شئے ہماری اس زمین سے قریب ہو جس پر آبادی وغیرہ سب ہو۔ تو آپ اُسے ارض نہ کہینگے؟ یقیناً ایسا نہیں ہے۔ بلکہ ہر جاہل سے جاہل شخص بھی ایسے کُرہ جسم کو دیکھ کر کہیگا۔ کہ یہ ارض (زمین) ہے۔ باقی رہیں قدماء کی دلیلیں عدم تعدد ارض پر۔ وہ ایسی ہیں۔ کہ ایک عاقل آدمی بعد غور کے اُن کی نسبت یہی رائے دیگا کہ محض اقناعی اور دل خوش کن دلیلیں ہیں حقیقت سے اُن کو مس بھی نہیں ہے +

اب آئیے شریعت اسلامیہ کو ملاحظہ فرمائیے۔ اس نے مسئلہ تعدد زمین کو تصریح سے بیان فرمادیا ہے حتےٰ کہ اُن زمینوں میں جو کچھ ہے۔ اُسے بھی مختصراً بتا دیا ہے۔ حالانکہ نہ اُس وقت

یہ دوربینیں تھیں۔ نہ خوردبینیں۔ نہ اس قسم کے رصدخانے تھے۔ اور نہ یہ سامان۔ بلکہ محض اپنے علم ربانی و الہامات الٰہیہ کے ذریعے سے جن باتوں کو جانتے تھے۔ اُسے ظاہر فرمایا۔ جو اُسکی سچائی کی پوری دلیل ہے۔

مگر از بسکہ صاحبان شریعت (رسول ؐ و ائمۂ طاہرینؑ) نے اپنے ارشادات میں دلیلوں کو نہیں بیان فرمایا تھا۔ بلکہ محض بیان امر واقعی پر اکتفا کی تھی۔ (کیونکہ اس کی ضرورت انھیں نہ تھی) اس وجہ سے اسلامی فلاسفروں نے یہ خیال کیا۔ کہ اس قسم کے اقوال و احادیث تاویل طلب ہیں چنانچہ اُن ارشادات حقہ کو ہیر پھیر کر کے اپنے خیالات کُہنہ کی طرف لے گئے۔ اور تاویلات سے اُن کا مطلب کچھ اور ہی کر دیا۔ اب میں ناظرین کے سامنے چند اقوال اپنی شریعت طاہرہ کے پیش کرتا ہوں۔ جو سر دست مجھ کو مل سکے ہیں۔ اور جنہیں بقدر فہم سمجھ سکا ہوں:۔

(**پہلا قول**) قرآن مجید کے سورہ طلاق میں ہے۔ (اللّٰہ الذی خلق سبع سمٰوٰت و من الارض مثلھن) "اللہ وہ ہے جس نے سات سماوات پیدا کئے۔ اور زمینیں بھی اُتنی ہی خلق فرمائیں" اس مقام پر عموماً مفسرین اسلام یہی لکھتے ہیں۔ کہ زمینیں بھی مثل سماوات کے سات ہیں۔ اور وہ حدیثیں جو تعدد زمین کے متعلق وارد ہیں۔ اُنھیں پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ تفسیر ابی السعود بن محمد میں ہے۔ جو نویں صدی کے فضلا میں سے تھے۔ (ان الجمھور علی انھا سبع ارضین بعضھا فوق بعض بین کل ارض و ارض مسافة کما بین السماء و الارض) "یعنی عام علماء کی یہی رائے ہے۔ کہ زمینیں سات ہیں۔ ایک دوسرے کے اوپر واقع ہے ہر زمین کا فاصلہ دوسری زمین سے ویسا ہی ہے۔ جیسا زمین کو آسمان سے ہے"۔ دیکھئے یہ تفسیر کس قدر منطبق ہے سیارات سبعہ کی زمینوں پر۔ جو آلات سے محسوس ہوتے ہیں۔ اور جن کا فاصلہ بھی بہت زیادہ ہے۔ نیز ہم بھی آئندہ اس قسم کی احادیث متواترۃ السند جن سے یہ ترتیب سمجھ میں آتی ہے نقل کرینگے۔ اُن سے معلوم ہوگا کہ ایک زمین سے دوسری زمین کا فاصلہ پانچ سو برس کی راہ کا جو لوگوں نے بیان کیا ہے درست ہے۔ چنانچہ اگر آپ کوئی ایسا تیز رفتار گھوڑا فرض کریں۔ جو ایک گھنٹہ میں ایک فرسخ راہ طے کرتا ہو۔ اور وہ صدر اسلام سے اس وقت تک برابر چل رہا ہو۔ تو مجموعی تعداد اُس کی رفتار کی سولہ ملین میل سے زیادہ ہوگی۔ پس یہ تحدید متاخرین کی اُس تحدید سے جو باہم زمینوں کے درمیان

ان لوگوں نے بیان کی ہیں بہت خوب ہوگی۔ اور متقدمین کی رائے کے بالکل مخالف +

(دوسرا قول) ایک جماعت رُواہ نے آٹھویں امام جناب علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام سے روایت کی ہے۔ کہ حضرتؑ نے مسئلہ ترتیب سماوات و ارض کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔ (ھٰذہ الارض الدنیا والسّماء الدّنیا فوقھا قبّۃ والارض الثانیۃ فوق السّماء الدّنیا والسّماء الثانیۃ فوقھا قبّۃ الخ) "یہ نیچے والی زمین ہے۔ اور اس کا آسمان اس کے اوپر بصورت قبہ کے ہے۔ دوسری زمین اس نچلے آسمان کے اوپر ہے۔ اور دوسرا آسمان اُس کے اوپر بطور قبہ کے ہے"۔ اسی طرح ساتوں زمینوں کو حضرتؑ نے ارشاد فرمایا ہے۔ جیسے ہم مسئلہ ترتیب سماوات و ارضین میں مع شواہد قویہ اور شرح سند و متن روایت کے نقل کرینگے۔ اور نظام جدید سے اس کی مطابقت دکھائینگے +

یہ وہ اقوال مطہرہ ہیں۔ جن پر غور کرنے سے نور ایمان زیادہ ہوتا ہے۔ اور وہ لوگ جو ہمارے مذہب کے مخالف ہیں۔ اُن پر پوری حجت ہے۔ بایں معنی کہ وہ بھی اگر تامل سے کام لیں تو اُن کو ثابت ہو جائیگا۔ کہ بیان کرنے والے ان اقوال کے (حضرات ائمہ طاہرینؑ) یقیناً خدا کے سچے ولی اور ہادیان برحق ہیں۔ جن پر وہ اسرار خفیہ آج سے سوا ہزار برس قبل بغیر آلات و ادوات کی مدد کے محض بالہام ربّانی منکشف تھے!!

(تیسرا قول) عموماً کتب ادعیہ و احادیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُن کے اوصیاء علیہم السلام سے مروی ہے۔ (اللّٰھمّ ربّ السّمٰوات السبع و ربّ الارضین السبع و ما فیھنّ و ما بینھنّ و ربّ العرش العظیم) یعنی "اے اللہ اے ساتوں آسمانوں کے پروردگار اور ساتوں زمینوں کے تربیت کرنے والے اور نیز اُن چیزوں کے جو ان سماوات و ارضین کے اندر اور ان کے درمیان ہیں۔ اور اے عرش عظیم کے پروردگار"۔ اس کلام سے بھی سات زمینوں کا وجود صریح لفظوں میں سمجھا جاتا ہے۔ نیز لفظ بینھنّ بتا رہا ہے۔ کہ یہ زمینیں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ باہم متصل نہیں ہیں۔ لہذا یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ سات زمینوں سے مراد سات اقلیمیں ہیں۔ علاوہ اس کے سات اقلیموں پر زمین کی تقسیم اعتباری ہے۔ کوئی حقیقی تقسیم نہیں ہے۔ نیز یہ کہ اقالیم سبعہ منحصر حصہ شمالی ہی میں نہیں ہیں۔ بلکہ نصف جنوبی میں بھی ایسے حصے فرض ہو سکتے ہیں۔ (بلکہ جزائر کثیرہ حصۂ جنوبی میں بھی ملے ہیں جو آباد ہیں۔ پس تخصیص شمالی حصے کی بیجا ہوگی) اس بنا پر سات کی تعداد درست نہ ہوگی۔ بلکہ دس سے

زیادہ تعداد ہو جائیگی۔(اگر سات زمینوں سے مراد سات اقلیمیں ہوں) چنانچہ حدایق النجوم میں مذکور ہے کہ حکیم کیسیولوس نے سنہ ۱۱ میں زمین کی تقسیم جنوبی حصہ میں بیس اقلیموں پر کی تھی۔ اور اسی طرح شمالی حصہ میں بھی بیس اقلیمیں اُس نے تجویز کی تھیں۔(لہذا معلوم ہوا کہ ایسی فرضی اور اعتباری تقسیم کی طرف معصوم علیہ السلام کی نظر نہیں ہے۔ جو شخص شخص کے خیال کے بموجب کم و بیش ہوتی رہی بلکہ واقعی سات زمینوں کی طرف نظر ہے۔ جو فی نفسہ علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اور یہی رائے متاخرین کی بھی ہے)

(چوتھا قول) کتاب بحار و کتاب خرائج حافظ راوندی قطب الدین سعید میں (جو ساتویں صدی میں علمائے شیعہ سے گذرے ہیں) مروی ہے۔ کہ جناب رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان معراج میں فرمایا۔(وکشط لی عن السموات السبع والارضین السبع حتیٰ رأیت سکانہا وعمارہا وموضع کل ملک منہا) یعنی میرے واسطے ساتوں سماوات اور ساتوں ارضین سے پردہ ہٹا یا گیا۔ یہاں تک کہ میں نے اُن کے ساکنین اور وہاں کے آباد ہونے والوں کو بچشم خود دیکھ لیا۔ اور ہر ملک کا محل بھی دیکھا۔" پردہ ہٹائے جانے سے یہ مراد ہے۔ کہ خدائے تعالےٰ نے حضرتؐ کی نظر میں وہ قوت پیدا کر دی تھی۔ اور تمام موانع کو سامنے سے اس طرح مرتفع کر دیا تھا۔ کہ آپ نے بے تکلف سبع سماوات و سبع ارضین کی سیر کر لی۔

(پانچواں قول) جناب امیر المومنین علیہ السلام کے خطبہ میں جو کتاب نہج البلاغۃ وغیرہ میں منقول ہے مذکور ہے۔(الحمد للّٰہ الذی لا یواری عنہ سماءٌ سماءً ولا ارضٌ ارضاً) حمد اُس خدا کے واسطے جسے ایک سما دوسرے سما کے دیکھنے سے نہیں روکتا۔ اور نہ ایک ارض دوسر ارض کے حالات معلوم کرنے سے مانع ہے۔" یہ کلام مقدس بھی جس طرح تعدد سماوات کو بیان کرتا ہے۔ تعدد ارضین کو بھی بیان فرماتا ہے۔

(چھٹا قول) بحار۔ جامع الاخبار اور انوار النعمانیہ میں رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے حضرتؐ سے سوال کیا گیا تھا۔ کہ کوہ قاف کیا ہے؟ اور اُس کی پشت پر کیا ہے؟ آپ نے فرمایا (سبعون ارضاً من ذھب وسبعون ارضاً من فضۃ وسبعون ارضاً من مسک وسبعون ارضاً سکانہا الملئکۃ لا یکون فیہا حر ولا برد وطول کل ارض مسیرۃ عشر الف سنۃ) کوہ قاف کے پیچھے ستر زمینیں سونے کی ہیں۔ اور ستر زمینیں چاندی کی۔ ستر مشک کی ہیں۔ اور ستر وہ زمینیں ہیں جن کے سکان فرشتے ہیں۔ نہ اُن میں گرمی ہے نہ سردی نیز یہ کہ

ہر زمین کا طول دس ہزار برس کی راہ ہے" (میں کہتا ہوں کہ اس حدیث میں لفظ سبعین ایسا ہی ہے - جیسا کہ لفظ اربعین یا الف وغیرہ کہ محض زیادتی کے ظاہر کرنے کے واسطے لایا جاتا ہے نہ بالخصوص کسی تعیین کے لئے - (جس طرح ہمارے ہاں کہتے ہیں "میں نے ہزاروں آدمی دیکھے - یا سیکڑوں کتابیں پڑھیں - یا بیسیوں برس سے ایسا ہی ہوتا ہے - وغیرہ وغیرہ" تو فی الواقع ان لفظوں سے اُن کے اصلی معنی مراد نہیں ہیں بلکہ صرف زیادتی کا اظہار مقصود ہے - یعنی بہت سے آدمی دیکھے - بہت سی کتابیں پڑھیں - بہت سے برسوں سے ایسا ہی ہوتا ہے - اسی طرح عرب میں فلاں چیز ستر ہزار ہے - یا ستر ہے - یا چالیس ہے - یا چالیس ہزار ہے - وغیرہ - مگر ان سے یہ خاص عدد مراد نہیں ہوتے - بلکہ بہت کے معنی مقصود ہوتے ہیں - یعنی فلاں چیز بہت ہے) اب اس حدیث کے تحقیق طلب مطالب پر نظر فرمائیے - (کوہ قاف) کی نسبت بہت سی حدیثیں عجیبۃ المضامین وارد ہیں - جن کے سمجھنے میں بڑے بڑے کملا حیران ہیں - مگر میرا خیال یہ ہے - کہ قاف سے مخروط ظل زمین مراد ہے - جو اپنی بزرگی کے سبب سے ایک بڑے پہاڑ کے مشابہ ہے - کیونکہ یہ ظل زمین کو محیط ہے - جس طرح دائرۂ افقیہ - بظاہر اسی وجہ سے ہمارے رسولؐ و ائمہ طاہرینؑ کے کلام میں بیشتر وارد ہے - کہ کوہ قاف زمین کو محیط ہے - نیز اس ظل کی سطح ظاہری کا رنگ بسبب روشنی و تاریکی کے مخلوط ہونے کے سبز ہے - اور معصومین علیہم السلام کے کلمات میں بھی عام طور پر یہی معلوم ہوتا ہے - کہ کوہ قاف مثل زمرد کے (سبز) ہے - یا مثل زبرجد سبز کے ہے - اور یہ کہ سبزی سما کی اُسی سے ہے - (یعنی اُسی قسم سے ہے) - کیونکہ سما کا رنگ بھی سبز ہے - اور اس کی سبزی روشنی اور تاریکی کے اختلاط سے پیدا ہوتی ہے - (روشنی تو وہ جو زمین سے منعکس ہو کر اوپر کی طرف جاتی ہے اور تاریکی خود فضا کی) +

دوسرا سبب قاف سے ظل ارض مراد لینے کا یہ ہے - کہ قاف کی تخصیص کچھ ہماری ہی زمین سے نہیں ہے - بلکہ ابن عباس کی روایت سے معلوم ہوتا ہے - کہ کل سیارات کی زمینوں کے لئے کوہ قاف ہے +

تیسرا سبب یہ ہے - کہ بعض حدیثوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے - کہ قاف تمام خلائق کو محیط ہے - اور بعض حدیثوں میں ہے - کہ قاف ہماری اس زمین کے پیچھے واقع ہے - ان سب بیانات سے یہی معلوم ہوتا ہے - کہ قاف کسی خاص پہاڑ کو معصومؑ نے نہیں فرمایا ہے - بلکہ زمین کے ظل مخروطی کو قاف سے تعبیر کیا ہے - کیونکہ زمین کا یہ ظل رات کے وقت تو ہمیں محیط

ہوتا ہے۔ اور دن کے وقت زمین کے نیچے ہوتا ہے۔ اس صورت میں کہا جا سکتا ہے۔ کہ تمام خلائق کو محیط ہے۔ (کیونکہ شب و روز میں مل کر اُس کا دَورہ تمام مخلوقات کے سر پر سے ہو جاتا ہے) +

نیز یہ کہ طول و عرض اس ظل کا تقریباً تین لاکھ فرسخ ہے۔ جیسا کہ حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قاف کا طول ہزار سال کی مسافت کا ہے۔ اور سماء دنیا کے دو لوکنارے اُس پر واقع ہیں۔ یہ بھی اسی کا شاہد ہے۔ کہ قاف سے مراد ظل ارض ہے +

بالجملہ میں نے کوہ قاف کے متعلق علیحدہ رسالہ لکھا ہے۔ جس میں اس کا انطباق ظل ارض پر حسب تحقیق حکماء متاخرین ظاہر کیا ہے۔ یہاں اُس کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے +

دوسرا لفظ اس حدیث میں (سبعون ارضاً) ہے۔ اس سے بظاہر وہ سیارات مراد ہیں جو ہمارے نظام شمسی سے خارج ہیں۔ جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔ کہ علاوہ اس آفتاب کے اور بھی بہت سے آفتاب ہیں۔ اور اُن کے گرد بے شمار سیارات ہیں۔ اور وہ سب بجائے خود مثل ہماری اس زمین کے آبادی و نشیب و فراز و کوہ و دریا رکھتے ہیں (لہذا اُن کو ارض کہنا بہت درست ہے)۔ یا وہ سیارات مراد ہیں جو ہمارے نظام شمسی کے اندر داخل ہیں۔ اس بنا پر ان زمینوں سے مراد وہ چھوٹے چھوٹے سیارات ہونگے۔ جن کی تحقیق ۱۲۱۵ء میں ہوئی ہے۔ کیونکہ سیارات صغار بھی ہمارے اس آفتاب کے گرد گردش کرتے ہیں۔ اور عدد میں بھی قریب قریب اُتنے ہی ہیں جتنے حدیث بالا میں مذکور ہیں یا یں معنی کہ اس وقت تک جتنے سیارے اس قسم کے دریافت ہو سکے ہیں۔ اُن کی تعداد تین سو اور چار سو کے درمیان میں ہے۔ اور ان سب کے مدار مشتری و مریخ کے درمیان ہیں۔ اس سبب سے یہ زمینیں بعد مریخ کے ہماری زمین سے (پشت زمین کی طرف سے) زیادہ قریب ہیں۔ (پشت زمین اس وجہ سے میں نے کہا ہے۔ کہ جو زمین اُس نصف حصہ کو کہنا مناسب ہے۔ جو آفتاب کے رُخ کی طرف واقع ہے۔ لہذا پشت زمین اُسے کہنا چاہیئے۔ جدھر مریخ و مشتری کا رُخ پڑتا ہے)۔ اس بنا پر حضرتؐ کا یہ ارشاد کہ پشت قاف پر ستر زمینیں ہیں یعنی ظل زمین کی جانب مخالف میں ستر زمینیں ہیں نہایت مناسب معنی دیگا۔ (دیکھو نقشہ نمبر۲) سو ہاں یہ چھوٹے چھوٹے سیارے جبل قاف کی پشت پر تمہیں دکھائی دینگے +

(تیسرا لفظ) حضرت ؑ کے کلام کا (من ذھب ومن فضۃ) یعنی کہ "وہ زمینیں جو اس زمین کے علاوہ ہیں سونے اور چاندی وغیرہ کی ہیں"۔ اس امر کے متعلق ہم اپنی رائے کچھ نہیں ظاہر کرسکتے۔ کیونکہ اُن سیارات کی حقیقت ہمیں معلوم نہیں ہے۔ بلکہ ہمیں اس امر کو تسلیم کرنا لازم ہے کہ رسول خدا ؐ نے جو کچھ فرمایا ہے۔ وہی صحیح ہے۔ ممکن ہے کہ اُن سیارات پر مادہ ذہب و فضہ غالب ہو۔ اس وجہ سے حضرت ؑ نے فرمایا کہ وہ زمینیں ذہب و فضہ کی ہیں۔ نیز یہ بھی محتمل ہے۔ کہ حضرت کا مطلب یہ ہو کہ وہ زمینیں سونے چاندی اور مشک کے رنگ کی ہیں۔ (جس طرح ہماری اس زمین کے بعض حصے سرخ رنگ کے بعض سفید رنگ کے بعض سیاہ رنگ کے ہیں۔ جیسا کہ اہل سیاحت اچھی طرح جانتے ہیں)۔ یا یہ کہ اُن سیارات کی طبیعت و خاصیت سونے چاندی اور مشک کی ہے +

رہا یہ امر کہ حضرت ؑ نے فرمایا ہے۔ اُن زمینوں میں نہ حرارت ہے نہ برودت (بلکہ معتدل حالت پر ہیں)۔ تو یہ بھی بہت درست ہے۔ اور اُن ستاروں کی حالت پر اچھی طرح منطبق ہے۔ کیونکہ آفتاب کی حرارت کا غلبہ وہیں زیادہ ہوگا۔ جہاں تک اس کے قُرص کا قریب ہے۔ پھر جس قدر قرب میں کمی ہوتی جائیگی۔ اُسی قدر گرمی کم ہوتی جائیگی۔ یہاں تک کہ محدود نظام شمس کے پاس یعنی فلک نبتون کے بعد بالکل فنا ہوجائیگی۔ برودت اس کے برعکس ہے یعنی نبتون کے بعد سے اُس کا غلبہ ہوگا۔ پھر وہ غلبہ کم ہوتا جائیگا۔ یہاں تک کہ قرص آفتاب کے پاس آکر بالکل فنا ئے برودت ہو جائیگا۔ لہذا معلوم ہوا کہ جو سیارات کو چک مریخ و مشتری کے درمیان واقع ہیں۔ جو کہ نظام شمسی کا حد وسط ہے۔ اُن میں گرمی و سردی دونوں معتدل ہونگی۔ اور یہ کہنا درست ہوگا۔ کہ وہاں گرمی ہے نہ سردی۔ یعنی نہ گرمی کو سردی پر غلبہ ہے نہ سردی کو گرمی پر +

آخر میں حضرت ؑ نے یہ فرمایا ہے۔ کہ (طول کل ارض عشر الف سنۃ) اس میں محتمل ہے۔ کہ عشر بضم عین وشین پڑھیں۔ اور یہ بھی محتمل ہے۔ کہ بفتح عین پڑھیں۔ اگر بضم عین وشین پڑھیں تو حاصل یہ ہوگا۔ کہ طول ہر زمین کا ایک سو برس کی راہ کا ہے۔ اور یہ احتمال اُس مقدار کے خلاف بھی ہوگا۔ جو حکمائے حال نے ان ستاروں کے لئے دریافت کئے ہیں۔ اور اگر بفتح عین وشین پڑھیں۔ تو بظاہر یہ احتمال ہے۔ کہ طول ارض سے مراد اُس کے مدارات کا طول ہے۔ جو بحیثیت آفتاب کے گرد پھرنے کے پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے۔ کہ مراد حضرت ؑ کی یہ ہو۔ کہ ہر زمین کا فاصلہ باہم سے دس ہزار برس کی راہ کا ہے +

(ساتواں قول) درمنثور میں علامہ سیوطی نے ابن عباس رضؓ سے روایت کی ہے۔ کہ

رسول خدا نے فرمایا۔ (سید السمٰوات التی فیھا العرش و سید الارضین التی انتم علیھا) "تمام آسمانوں میں معزز وہ آسمان ہے جس پر عرش ہے اور کل زمینوں میں اشرف وہ زمین ہے جس پر تم لوگ آباد ہو" اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ زمینیں بہت ہیں منجملہ اُن کے ایک زمین ہے جس پر بنی آدم سکونت پذیر ہیں۔ (فیھا میں حرف فی بمعنی علےٰ ہے جس طرح خدائے تعالےٰ کے اس قول میں لاصلبنکم فی جذوع النخل)۔

(آٹھواں قول) بحار و کتاب ثواب الاعمال میں بسند قوی امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ ان اللہ عزوجل فوض الامر الی ملک من الملٰئکۃ فخلق سبع سمٰوات و سبع ارضین و اشیاء الخ۔ یعنی "خدائے تعالےٰ نے خلقت زمین کا کام ایک فرشتے کے حوالہ کیا۔ اُس نے (بحکم خدا) سات سماوات اور سات زمینیں اور چیزیں پیدا کیں"۔

(نواں قول) بحار اور درمنثور میں ابن عباس سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ (خلق اللہ تعالےٰ من وراء ھذہ الارض بحرا محیطا بھا ثم خلق من وراء ذلک جبلا یقال لہ قاف والسماء الدنیا مترفرفۃ علیہ ثم خلق من وراء ذلک الجبل ارضا مثل تلک الارض سبع مرات ثم خلق من وراء ذلک بحرا محیطا بھا و ھکذا حتی عدّ سبع ارضین و سبعۃ ابحر و سبعۃ اجبل) "خدائے تعالےٰ نے اس زمین کے اوپر ایک دریا خلق فرمایا ہے جو اُسے محیط ہے۔ اُس کے پیچھے ایک پہاڑ پیدا کیا ہے جس کو قاف کہتے ہیں۔ اور آسمان دنیا یعنی نیچے والا آسمان اُس پر سایہ فگن ہے (محیط ہے) پھر اُس پہاڑ کی پشت پر ایک اور زمین پیدا کی ہے۔ جو اس زمین سے سات حصہ بڑی ہے۔ اُس کے بعد ایک بحر محیط خلق فرمایا ہے۔ علےٰ ہذا القیاس سات زمینیں۔ سات دریا اور سات پہاڑ گنوائے" اس حدیث سے صاف لفظوں میں ظاہر ہوتا ہے کہ سات زمینیں الگ الگ ہیں۔ اور سات دریا اور سات کوہ قاف ہیں۔ ہر دو زمینوں کے درمیان ایک کوہ قاف اور ایک بحر محیط ہے۔ یہ امر سوائے جدید علم ہیئت کے اور کسی سے مطابق نہیں۔ کیونکہ قدیم علم ہیئت میں ایسی باتوں کا کہیں نشان بھی نہیں)۔

پس مقصود (امام علیہ السلام کا) اُن زمینوں سے یہی سیارات ہیں۔ جن کی بابت پہلے بھی لکھا گیا ہے۔ اور کوہ قاف سے مراد زمین کا ظل مخروطی ہے۔ جو ایک کوہ عظیم سے مشابہ ہے۔ جس کی تحقیق سابق میں بیان کی جا چکی۔ نیز اس تحقیق کے مؤید یہ بھی ہے کہ

اس حدیث میں متعدد کوہ قاف کا وجود بیان فرمایا گیا ہے۔ اور یہ کہ وہ کوہ قاف ہر زمین کی پشت پر ہے۔ (یعنی ہر سیارہ کے)۔ کیونکہ عطارد وغیرہ جتنے سیارات ہیں۔ ان سب کا ایک ظل مخروطی پیدا ہوتا ہے۔ جو طولانی و سبزی مائل ہوتا ہے۔ جو آفتاب کے اُس کی ایک جانب میں مخفی ہونے سے پیدا ہوتا ہے جیسا کہ زمین کے لئے ہے۔ (کیونکہ زمین کے لئے بھی یہی ثابت ہے۔ کہ جب آفتاب اوپر کے نصف حصہ کی طرف روشن ہوتا ہے۔ تو اُس کا ظل نیچے کی جانب ہوتا ہے۔ اور جب آفتاب نیچے جاتا ہے۔ تو اُس کا ظل مخروطی اوپر کی طرف ہوتا ہے جسے رات سے تعبیر کیا جاتا ہے)۔

(باقی رہا) سات دریاؤں کا بیان جو زمینوں کے فاصل ہیں۔ تو اُس کے بیان کے واسطے ایک مقدمہ کی تمہید ضروری ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ مرکز آفتاب کو جو فضا محیط ہے۔ فلک نبتون (نبتن) تک وہ متاخرین حکماء (یورپین فلاسفر) کے نزدیک ایک مادہ لطیفہ سیالہ سے جسے ایتھر کہتے ہیں بھری ہوئی ہے۔ اور یہی فضا جو ایتھر سے مملو ہے۔ باعتبار مدار سیارات سات یا نو حصوں پر منقسم ہے۔ جیسا کہ شکل نمبر ۲ میں دکھلایا گیا ہے۔ انہیں حصوں میں سے جو حصہ درمیان فلک عطارد اور فلک زہرہ کے ہے وہ بیضوی شکل کا ہے۔ علے ہذ القیاس وہ ایتھر سے بھرا ہوا فضا کا حصہ جو زہرہ اور ہماری اس زمین کے درمیان میں ہے۔ اسی طرح اس کے نو حصے ہیں۔ اگر ہم تمام سیار زمینوں کو ملالیں۔ اور اگر خاص سبعہ سیارہ ہی کو لیں۔ تو اُس فضا کے سات ہی حصے ہونگے۔ (مگر ہم آئندہ بیان کرینگے کہ زمینیں صرف سات ہی ہیں)۔ اس بنا پر ایتھر کے بھی سات ہی حصے درجہ بدرجہ ہونگے۔ پس جب کہ یہ سات حصے ممتاز طور پر سمجھ میں آ گئے۔ اگرچہ یہ تقسیم اعتباری ہی ہے۔ (کیونکہ ان حصوں کے درمیان کوئی چیز فی الحقیقۃ فاصل نہیں ہے)۔ تو اب میں کہتا ہوں کہ ان حصوں پر اگر ہم دریاؤں کا اطلاق کریں۔ (یعنی اسی مادہ سیالہ کو جسے ایتھر کہا گیا ہے سات دریا کہیں۔ جیسا کہ حدیث کا بیان ہے)۔ تو کیا مضائقہ ہے۔ خصوصاً جب کہ اس ایتھر اور دریا میں مشابہت بھی پائی جاتی ہے۔

(اولاً) اس وجہ سے کہ جس طرح دریا اُسے کہتے ہیں۔ جو ایک جوہر شفاف و نرم و لطیف یعنی پانی سے بھرا ہوا ہو۔ اسی طرح یہ جوہر (جسے ایتھر کہا گیا ہے) جس سے ہماری کواکب سیارہ ممتلی ہیں شفاف و لطیف و سیال ہے۔ بلکہ اس کی نرمی اور اس کا سیلان و لطافت پانی کے سیلان و لطافت سے کہیں زیادہ ہے۔

(ثانیاً) اس وجہ سے کہ جس طرح دریا کا پانی موج زن اور متحرک ہے۔ اسی طرح ایتھر بھی سیال و متحرک

ہے۔ اور ہمیشہ تموج میں رہتا ہے۔ خواہ ہم حکیم نیوٹن اور اُس کے تابعین کے قول کو مانیں جو
نور کو مادہ لطیفہ اور ذرات صغیرہ سے مرکب مانتے ہیں۔ (جو بہت ہی باریک ہیں) ۔ اور جرم نورانی سے
ہر طرف کو خطوط مستقیمہ پر نہایت سرعت کے ساتھ یعنی ایک سکنڈ میں ۱۹۲۰۰۰ میل بنابر رائے
ڈو مرڈ و مارکی کے یا ۱۲۹۹۹۰۰ میل بنابر رائے حکمائے حال کے حرکت کرتا ہے۔ اور خواہ ہم جالنس
اور اُس سے متاخرین حکماء کی رائے اختیار کریں۔ جو کہتے ہیں کہ نور اُس حسی جوہر کا نام ہے۔ جو مادہ
ایتھر کے (جو فضا میں بھرا ہوا ہے) آنکھ کے پٹھے پر ٹھوکر مارنے سے پیدا ہوتا ہے۔ بہر صورت
ان دونوں مذہبوں کے موافق فضا ایک مادہ سیالہ شفافہ نورانی سے بھری ہوئی ہے۔ جو ہر وقت
موج زن متحرک اور ایک سکنڈ میں کئی ہزار میل کی مسافت طے کرلیتا ہے۔ اور یہی ہمارا مقصود
ہے۔ کیونکہ اس سے پوری مشابہت دریا کے پانی اور اس ایتھر میں پیدا ہوتی ہے +

(ثالثاً) یہ کہ ہر کرہ سیارہ کے واسطے ایک ظل طولانی ہولناک کا پیدا ہونا اُس کی پشت کی
جانب میں آفتاب کے مقابلہ کی وجہ سے ضروری ہے۔ اس بنا پر ہر سیارہ کی شکل اس ظل کے
ساتھ ایسی محسوس ہوگی جیسے لمبی مچھلی ہے۔ سر اُس کا بیضوی کرہ کا جرم ہے۔ اور جسم اُس کا وہ
ظل مخروطی ہے۔ جو طولانی شکل میں روشنی و تاریکی کے مختلط ہوجانے سے اُس کی ظاہر سطح میں دکھائی
دیتا ہے۔ جیسا کہ شکل نمبر ۲ میں دکھایا گیا ہے +

ہم نے اس مقام کی شرح مسئلہ فلک میں بھی کی ہے۔ پس اس شکل کو دیکھ کر فضا میں انسان
بھی خیال کرسکتا ہے۔ کہ یہ بڑی مچھلیوں کی صورتیں ہیں جو تیزی کے ساتھ پانی میں تیر رہی ہیں۔
اور یہی غالباً مقصود ہے اُس کا جو شریعت میں وارد ہوا ہے۔ کہ زمین مچھلی پر ہے۔ یعنی مچھلی کی
شکل پر ہے یعنی اسی صورت سے جو ہم نے بیان کی۔ کہ جرم ارض کے ساتھ ساتھ ایک طولانی
اور مخروطی ظل ضرور ہوتا ہے۔ جس سے زمین کی شکل مع اس ظل کے مچھلی کی شکل کی ہو جاتی ہے۔
اور جب یہ مشابہت ثابت ہوگئی۔ کہ جس طرح دریا کی مچھلیاں ہیں۔ اُسی شکل کے یہ سیارات
بھی ہیں۔ جو فضا میں چل رہے ہیں۔ تو بہت اچھی طرح سے ان فضا والے حصوں کی مشابہت جو
ایتھر سے بھرے ہوئے ہیں دریا سے ثابت ہوگئی۔ اور شاید اسی نکتہ کے لحاظ سے ستاروں
کے چلنے کو شریعت میں سباحۃ یعنی تیرنے سے تعبیر کی گئی ہے۔ جیسا کہ خدائے تعالےٰ فرماتا
ہے۔ کل فی فلک یسبحون۔ اور جناب امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے۔ ومن
تدابیر النجوم التی تسبح فی الفلک +

چوتھی اس وجہ سے کہ ان مجاری متوسط کا طول اُن کے عرض و عمق کی بہ نسبت بسبب ان کے بلیلجی مدارات کے طولانی ہونے کے زیادہ ہے۔ جیسا کہ ارضی دریاؤں میں ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ان کا طول و عرض عمق کی بہ نسبت زیادہ ہے۔ اور جب یہ بات ثابت ہوگئی۔ کہ فضا کے ان متوسط حصوں کو جن میں یہ سیارات چلتے ہیں۔ دریاؤں سے تعبیر کرنا صحیح اور جائز ہے۔ جیسا کہ ان وجوہ مذکورہ بالا نے بتایا۔ تو اب اُن شواہد شرعیہ کو بھی سُنئے۔ جو اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ کہ بحار سماویۃ سے مراد جو ہماری شرع اقدس میں مذکور ہیں یہی فضا کے وہ حصے ہیں۔ جو مدارات کواکب کے درمیان واقع ہوتے ہیں۔ (منجملہ اُن کے وہ حدیث ہے جو کافی اور من لایحضرہ الفقیہ اور تفسیر قمی میں باسناد قوی امام چہارم علی بن الحسین علیہ السّلام سے مروی ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے۔ کہ خدائے تعالےٰ کی اُن نشانیوں میں جنہیں اس نے آدمیوں کے لئے قرار دیا ہے۔ اور وہ اُس کے محتاج بھی ہیں۔ وہ دریا ہے جسے خدا تعالےٰ نے آسمان و زمین کے درمیان پیدا کیا ہے۔ اور اسی دریا میں آفتاب و ماہتاب و نجوم و کواکب کے چلنے کی جگہ مقرر فرمائی ہے۔ (یعنی یہ سب سیارات اُسی دریا میں بترتیب نمبروار چلتے ہیں) *

(دوسرے) چند روایتوں میں وارد ہوا ہے کہ "سماوات میں نور کے کئی دریا ہیں۔ جن کی ضیا نہایت روشن ہے"۔ اور ہم نے ابھی بیان کیا ہے۔ کہ یہ فضا جو ان مدارات کے درمیان واقع ہوئی ہے۔ وہ آفتابی نورانی مادہ سے بھری ہوئی ہے۔ اور آفتاب سے زیادہ کونسا نور نگاہوں میں قوی ہو سکتا ہے۔ جس سے ثابت ہوا۔ کہ اس مضمون کا انطباق ہمارے اُس بیان پر جو ابھی گذر لیا ہے بہت اچھی طرح سے ہوتا ہے *

(تیسرے) مولانا صدرالدین شیرازی مشہور مسلمانوں کے حکیم نے جن کی وفات ۱۰۵۰ء میں واقع ہوئی ہے اپنی کتاب مبدأ و معاد میں کعب سے روایت کی ہے۔ کہ خدائے تعالےٰ نے سات دریا پیدا کئے ہیں۔ اُن میں سے ایک وہ ہے۔ جس کا نام قیس ہے۔ اُس کے بعد ایک اور دریا ہے۔ جس کا نام اصم ہے۔ اسی طرح ساتوں دریا ہیں اور اُن کے نام ذکر کئے ہیں۔ اُس کے بعد فرمایا ہے ثم وراء ذٰلک بحر اسمہ باکی وھو اخر البحار وھو محیط بالکل وکل واحد من ھذہ البحار محیط بالذی تقدمہ۔ یعنی اُس کے بعد ایک اور دریا ہے جس کا نام باکی ہے۔ اور وہی آخری دریا ہے۔ اور وہ ماتحت کے ہر ایک دریا کو محیط ہے۔ اور

ان دریاؤں میں سے ہر ایک اپنے ماتحت کے دریا کو محیط ہے" اس حدیث میں اگرچہ یہ تصریح نہیں ہے۔ کہ یہ دریا آسمان میں ہیں یا زمین میں لیکن چونکہ یقینی طور پر معلوم ہے۔ کہ اس قسم کا کوئی دریا زمین میں نہیں ہے۔ لہذا ماننا پڑیگا۔ کہ ان دریاؤں سے مراد وہی دریا ہیں۔ جو ہمیں فضا میں بتائے گئے ہیں۔ اور یہ حدیث منطبق ہے اُن بیانات پر جن کی ہم نے تائید کی ہے۔ بایں لحاظ کہ ہر دریا کو اُس سے نیچے والے دریا کا محیط بتایا گیا ہے۔ یہاں تک کہ اُس دریا تک پہنچتے ہیں۔ جو سب کو محیط ہے۔ جس طرح کہ ان سیارات کے مجاری کی ترتیب واقع ہوئی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب +

(پانچویں) اس وجہ سے کہ ان دریاؤں کے عمق کی تحدید پانچ سو برس کی راہ سے کی گئی ہے۔ جیسا کہ کتاب توحید صدوق علیہ الرحمۃ اور بحار مجلسیؒ میں رسول اللہ صلعم سے مروی ہے۔ کہ سماوات سبعہ (یعنی ان سات بلندیوں میں) چند دریا ہیں۔ جن میں سے ہر ایک کا عمق یا پانچ سو برس کی راہ کا ہے۔ (اس کے علاوہ اور بھی روایتیں ہیں جو آئندہ مذکور ہونگی)۔ یہی مسافت بعینہ سات زمینوں کے درمیان کی وسعت کی بیان کی گئی ہے۔ اور یہی مسافت ساتوں آسمانوں کے درمیان کی وسعت کی بھی بیان کی گئی ہے۔ جیسا کہ آئندہ مذکور ہوگا۔ تو ان سب روایتوں کو یکجا کرنے سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ بحار (دریاؤں) سے یہی مجاری مراد ہیں جو ان سیارات کے درمیان واقع ہوئے ہیں۔ (اس موقع کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ہمارے رسالہ کوہ قاف کو ملاحظہ کیجئے۔ تو زیادہ نافع ہوگا) +

اور جب یہ مطلب واضح ہو چکا۔ تو اس قول معصوم کی تطبیق نظام (ہیئت) جدیدہ پر کچھ دشوار نہیں کیونکہ حضرتؑ نے جو یہ فرمایا ہے۔ اِنَّ اللّٰہ خلق من وراء ارضنا بحراً محیطاً بہا "خدائے تعالےٰ نے ہماری اس زمین کے اوپر ایک دریا پیدا کیا ہے۔ جو اس زمین کو محیط ہے" اس سے مراد وہی مجریٰ (جس مسافت میں ستارہ کو گردش ہوتی ہے) ہے۔ جو ہماری زمین اور ارض زہرہ یا ارض مریخ کے درمیان واقع ہوئی ہے۔ (ہمارے بیان سے معلوم ہوگا کہ یہ سیارات بجائے خود ارض یعنی زمین ہیں) ثم خلق من وراء ذٰلک جبلاً (اس کے بعد خدا نے ایک پہاڑ پیدا کیا ہے) سے وہ جسم مخروطی ظلی مراد ہے جو پہاڑ سے بہت مشابہ ہے۔ (جیسا کہ سابق میں بیان ہوا)۔ اور وہ ظل الارض ہے یقال لہ قاف (اُسے کوہ قاف کہتے ہیں)۔ یعنی اہل اسرار و معرفت جانتے ہیں کہ اسی ظل مخروطی کا

نام کوہ قاف ہے بسبب نور سطح زمین کے۔ اور یہ لفظ "قاف" مشتق ہے "قفی یقفو" سے جس کے معنی پیچھے چلنے کے ہیں چونکہ ظل ارض بھی پیچھے پیچھے اور بہ تبعیت حرکت آفتاب کے چلتا رہتا ہے۔ (مثلاً اس وقت زمین کے اوپر ہے۔ دو گھنٹے بعد کسی قدر مڑ جاتا ہے۔ بارہ گھنٹے بعد زمین کے نیچے چلا جاتا ہے۔ پھر آفتاب کی حرکت کے ساتھ اوپر آجاتا ہے۔ اور علیٰ ہذا القیاس) اور جس جس طرح نور آفتاب کی حرکت زمین پر ہوتی ہے ـــ اسی طرح یہ ظل بھی برابر حرکت کرتا اور بنتا رہتا ہے۔

السماء الدنیا سے مراد متقدمین فلاسفہ کے نزدیک تو فلک قمر ہے۔ مگر ہیئت جدید کی بنا پر کچھ اور ہی مقصود ہے جیسا کہ ہم آئندہ مسئلہ ترتیب سماوات میں بیان کریں گے۔ مترفرفہ علیہ یعنی وہ سماء دنیا (وہ بلندی جس میں قمر مثلاً حرکت کرتا ہے) اس کوہ قاف (ظل مخروطی زمین) پر پھیلا ہوا اور محیط ہے۔ اور ظاہر ہے کہ سماء دنیا دونوں قولوں (جدید و قدیم دونوں قسم کے فلاسفروں کے قول) کی بنا پر زمین کے ظل مخروطی پر (جسے کوہ قاف کہا گیا ہے) پھیلا ہوا ہے +

ایک اور حدیث میں وارد ہوا ہے کہ ان قاف جبل من زمرد محیط بالدنیا علیہ کنفا السماء "کوہ قاف زمرد کا پہاڑ ہے۔ دنیا کو محیط ہے۔ آسمان کے دونوں کنارے اس پر واقع ہیں"۔ ان دونوں کناروں سے مراد فلک قمر کی وہ قوس ہے۔ جو زمین کے مخروطی ظل پر ہمیشہ پڑتی ہے۔ یہی وہ قوس ہے جس میں قرص قمر کو گہن لگتا ہے جب کہ قمر اس قوس میں آکر ٹھیرتا ہے +

(تنبیہ) اس روایت مذکورہ کے تمام جملے ہیئت شرعیہ کے سمجھنے میں ہماری ترتیب جدید کے بالکل موافق اور اس پر کافی طور سے منطبق ہیں۔ جیسا کہ اہل انصاف و لنظر پر واضح ہے۔ البتہ ایک جملہ اس حدیث میں ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ ثم خلق وراء ذالک الجبل ارضا مثل تلک الارض سبع مرات۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس ظل مخروطی (جس کو قاف کی تعبیر کی گئی ہے) کے اوپر جو زمین ہے (یعنی قمر مثلاً) وہ سات حصے اس زمین سے (جس پر ہم بستے ہیں) زیادہ ہے۔ حالانکہ ہیئت جدیدہ میں اس کے برخلاف ثابت ہے۔ جیسا کہ ہم نے پچھلے مقدمے میں بیان کیا ہے۔ پس اگر یہ تحریرات صحیح مانی جائیں۔ اور سند حدیث بھی مسلم سمجھ لی جائے۔ تو ہمیں اس کی توجیہ ایک مناسب معنی کی طرف کرنی چاہیئے۔ مثلاً ہم یوں کہیں۔ کہ "سبع مرات" کا لفظ "خلق" سے متعلق ہے۔ اور مراد اس سے یہ ہے۔ کہ خدائے تعالےٰ نے اس ظل مخروطی زمین کے اوپر سات مرتبہ زمین خلق فرمائی۔ یعنی سات زمینیں پیدا کیں۔ (جن سے یہی سبعہ سیارہ مراد ہیں)۔ یا یوں کہیں کہ "سبع مرات" سے سات حصہ بڑا ہونا زمین مافوق کا نہیں

مراد ہے۔ بلکہ یہ مشابہت کسی اور امر میں معصوم ؑ نے دی ہے جسے مجمل رکھا ہے۔ اور واضح نہیں فرمایا۔ تو ہو سکتا ہے۔ کہ مراد اس سے سات حصہ حجم کی زیادتی ہو۔ یا سات حصہ وزن میں زیادتی ہو۔ یا سات حصہ نور میں زیادتی ہو۔ یا برودت میں۔ یا سرعت میں۔ یا یہ مراد ہو کہ اس پر اس میں کی نسبت سات حصے مخلوقات زیادہ ہیں۔ یا ہر ایک ان میں سے مراد ہو۔ اس لحاظ سے کوئی منافات فلسفہ جدیدہ اور شریعت کے اس بیان میں نہ ہوگی۔ کیونکہ ان امور میں سے کسی کی نفی فلسفہ جدیدہ نہیں کرتا +

(دسواں قول شریعت کا جس سے تعدد زمین معلوم ہوتا ہے)۔

کتاب بحار اور در منثور سیوطی میں ابن عباس سے مروی ہے۔ کہ رسول اللہ صلعم ہم لوگوں کے پاس تشریف لائے۔ اس وقت ہم سب حلقہ حلقہ مسجد میں بیٹھے تھے۔ پوچھا۔ کیا کر رہے ہو۔ ہم نے عرض کی۔ "آفتاب کی بابت کچھ غور کر رہے ہیں"۔ اس کے بعد تھوڑے فاصلے سے اسی روایت میں ہے۔ کہ پھر حضرت ؐ نے فرمایا۔ "کہ کوہ قاف کے اوپر سات دریا ہیں۔ ہر دریا کی مسافت سات سو برس کی راہ کی ہے۔ اس کے بعد سات زمینیں ہیں۔ جن کی روشنی ان زمینوں کے ساکنین کو پہنچتی ہے۔ اس کی مافوق ستر ہزار امتیں ہیں"۔ انتہی +

اس روایت کا مضمون ہماری تحقیقات سابقہ پر اچھی طرح سے منطبق ہے جو کوہ قاف اور سات دریاؤں اور سات زمینوں کے متعلق ہم نے کی ہیں۔ اور فلسفہ جدیدہ پر بھی منطبق ہے جو اس امر کا قائل ہے۔ کہ ہمارے اس آفتاب کے گرد چند زمینیں ہیں۔ اور یہ کہ ہر زمین میں جاندار مخلوقات بستے ہیں۔ اور ان زمینوں سے اوپر کئی عالم اور بھی ہیں۔ اور کئی نظام شمسی ہیں۔ جو بہت سی مخلوقات و اُمم پر مشتمل ہیں۔ اور وہ مثل بنی آدم کے ہی ہیں۔ جیسا کہ آنحضرت ؐ کے اس کلام سے ظاہر ہے۔ کہ ستر ہزار امتیں ہیں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ +

البتہ حضرت ؐ کا یہ ارشاد کہ ان زمینوں کا نور ان کے ساکنین تک پہنچتا ہے۔ (یا یہ کہ ان کی روشنی سے وہ ضیاء حاصل کرتے ہیں)۔ بظاہر تحقیقات جدیدہ کے خلاف معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی توجیہ آسانی سے یہ ہو سکتی ہے۔ کہ مراد حضرت ؐ کی یہ ہے۔ "کہ ہر زمین کی روشنی دوسری زمین کے رہنے والوں کو محسوس ہوتی ہے۔ زہرہ کی روشنی ہماری زمین کے رہنے والوں کو اور دیگر زمینوں کے ساکنین کو محسوس ہوتی ہے۔ دیگر زمینوں کی روشنی ہماری زمین کے ساکنین اور زہرہ والوں کو محسوس ہوتی ہے"۔ اور اس میں کوئی استحالہ نہیں ہے۔ یا یہ کہ نور سے مراد یہی آفتاب

ہو یعنی آفتاب کی روشنی ان تمام زمینوں پر پہنچتی ہے + اور بعض روایات بحار میں بجائے "نور ہا" (اس کی روشنی) کے "نورنا" (ہماری روشنی) مذکور ہے جس سے مقصود یہ ہے۔ کہ ہماری اس زمین کی روشنی اُن زمینوں کے سکان کو محسوس ہوتی ہے۔ جس سے یہ مطلب واضح ہوتا ہے کہ جس طرح اور سیارات ہیں۔ اُسی طرح ہماری یہ زمین بھی ایک ستارہ ہے۔ جو مثل دیگر سیارات کے روشن اور ایک مکمل کوکب ہے (اور یہ مطلب بھی فلسفہ جدیدہ کے مخالف نہیں ہے کیونکہ جدید فلاسفر اس زمین کو بھی ایک سیارہ کوکب مانتے ہیں) +

(گیارھواں قول شریعت کا) کتاب بحار علامہ مجلسیؒ اور کامل الزیارۃ (تصنیف حافظ جعفر بن قولویہ متوفی ۳۶۸ھ) میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ حدیث طولانی ہے منجملہ اُس کے فقرات کے یہ بھی ہے۔ وما من لیلۃ تاتی علینا الا واخبار کل ارض عندنا وما یحدث فیہا وما من ارض من ستۃ ارضین الی السابعۃ الا ونؤتی بخبرھم۔ "ہر شب کو ہمیں تمام زمینوں کی خبریں ملتی ہیں اور نیز جو کچھ اُن میں واقع ہوتا ہے وہ سب ہمیں معلوم ہوتا ہے چھوٹی بلکہ ساتوں زمینوں تک کے حالات واخبار ہمارے پاس آتے ہیں (یعنی ہمیں معلوم ہوتے ہیں)"۔ دیکھئے ابھی دوربینیں ایجاد بھی نہ ہوئی تھیں۔ اور یہ آلات جن سے آج کل کام لیا جارہا ہے بنائے بھی نہ گئے تھے۔ مگر چند قرن اس سے پہلے کامل النفوس اور روحانی لوگوں پر ان زمینوں کے حالات منکشف تھے اور اُن کی روح لطیف اُن عوالم سے اس طرح متصل تھی کہ بغیر ان آلات کی مدد کے محض خدائے تعالےٰ کے فیضان کے سبب سے ان تمام حوادث واخبار کو جانتے تھے۔ جو آج دوربینیں لگا لگا کے بھی وہ حالات حکماء کو معلوم نہیں ہوسکتے +

(بارھواں قول شریعت کا) تفسیر فاضل نیشاپوری۔ بحار۔ تفسیر درمنثور سیوطی میں سات یا اس سے زیادہ کتابوں سے نقل کیا ہے۔ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ان الارضین السبع ما بین کل ارض منہا والارض الاخری مسیرۃ خمس مائۃ عام "ساتوں زمینوں میں ہر ایک زمین کا فاصلہ دوسری زمین سے پانچ سو برس کی راہ کا ہے" (اس حدیث کے باقی الفاظ وعبارات ترتیب سماوات کی بحث میں آئینگے) +

یہ حدیث بھی اس مطلب کو صاف لفظوں میں بتا رہی ہے۔ کہ مراد سات زمینوں سے سیارات سبعہ ہیں +

(تیرھواں قول شریعت کا) ابن سلام والی روایت جو بحار وغیرہ میں مروی ہے۔
(اس کی سند کا بیان آئندہ آئیگا)۔ اُس میں ایک یہ بھی مضمون ہے کہ اُس نے آنحضرت صلعم سے
"جبل" کے نیچے کا حال دریافت کیا۔ (بظاہر جبل سے مراد وہی کوہ قاف ہے) حضرت نے فرمایا
اُس پہاڑ کے نیچے ایک زمین ہے۔ ابن سلام نے پوچھا۔ اُس کا نام کیا ہے؟ فرمایا "جاریہ"
پوچھا۔ اُس کے نیچے کیا ہے؟ فرمایا "دریا" پوچھا اُس کا نام؟ فرمایا "سہسلک" یہ سُن
کے ابن سلام یہودی بولا۔ یا محمد تم نے سچ کہا۔ اچھا اُس دریا کے نیچے کیا ہے؟ فرمایا "زمین"
پوچھا اُس کا نام۔ فرمایا "ناعمہ"۔ پوچھا۔ اُس کے نیچے کیا ہے؟ فرمایا "دریا"۔ پوچھا۔ نام
کیا ہے؟ فرمایا "زاحش"۔ کہا اُس کے نیچے کیا ہے؟ فرمایا "زمین"۔ پوچھا۔ اُس کا نام کیا
ہے۔ فرمایا "فسیحہ"۔ ابن سلام بولا۔ تو آپ اس زمین کا کچھ حال بیان کریں۔ حضرت
نے فرمایا "اے ابن سلام یہ ایک سفید زمین ہے۔ جیسے آفتاب۔ اس کی ہوا مشک جیسی
خوشبودار ہے۔ روشنی اس کی چاند کی طرح ہے۔ گھاس وہاں کی زعفران کی سی ہے" الخ۔

مَیں نے اس حدیث سے چند امور کا استنباط کیا ہے:-

(۱) یہ کہ زمینیں متعدد ہیں (جیسے کہ صدر دعوے میں بیان کیا گیا ہے) حدیث
کے ظاہر الفاظ سے صاف صاف اس دعوے کا ثبوت ملتا ہے۔ رہی یہ بات کہ اس حدیث
میں صرف تین زمینوں کو بیان فرمایا ہے۔ اس سے ہمارے دعوے کو کچھ ضرر نہیں پہنچتا۔
کیونکہ سائل نے اس سے زیادہ سوال ہی نہ کیا۔ (بلکہ فسیحہ کے ذکر تک پہنچ کر اُس کا حال
پوچھنے لگا)۔ اگر پوچھنے والا اس سے زیادہ سوال کرتا۔ اور بقیہ زمینوں کا حال بھی دریافت کرتا
تو بالضرور آپ ارشاد فرماتے۔

(۲) یہ کہ زمین متحرک ہے۔ کیونکہ سائل نے جب ماتحتِ جبل کا حال پوچھا۔ تو آپ نے
فرمایا۔ (ارض اسمہا الجاریۃ) "ایک زمین ہے جس کا نام جاریہ ہے" یعنی چلنے والی۔ اور
اکثر نام سے اُس کی صفت و علامت جو اُس کی ذات کے لئے لازم ہو مراد ہُوا کرتی ہے جیسا کہ
دوسری حدیث میں جناب امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ہے۔ (ان اسم السماء الدنیا
رفیعۃ) "آسمانِ دنیا کا نام رفیعہ ہے" یعنی اس آسمان کی ظاہری صفت لازمہ یہی ہے کہ
وہ رفیع یعنی بلند ہے۔ لہذا معلوم ہُوا کہ حدیث مذکور سابق میں آنحضرت نے لفظ الجاریۃ
فرما کر اس مطلب کو ظاہر فرمایا ہے۔ کہ ہماری زمین کی صفت و علامت لازمہ یہ ہے کہ وہ

متحرک ہے اور فضا میں چلتی رہتی ہے۔ اسی طرح قیامت تک چلتی رہیگی +

(۳) یہ کہ یہ تینوں زمینیں جو حدیث میں مذکور ہیں ان کے حالات بالکل ہماری اس زمین اور مریخ مع مشتری کے متعلق ہیں۔ جس طرح سے کہ حکمائے حال نے ان کی ترتیب بیان کی ہے کیونکہ آنحضرت ؐ نے ان تینوں زمینوں کو ہمارے نیچے فرمایا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ بلحاظ مقابلہ آفتاب کے یعنی جبکہ آفتاب بلند ہوگا۔ تو مریخ و مشتری کا مدار ہمارے اور ہماری زمین کے نیچے ہی واقع ہوگا۔ خصوصاً بلحاظ اس کے کہ یہ کلام حضرت ؐ کا دن کے وقت صادر ہوا ہے۔ جو اور بھی ہمارے خیال کی تقویت کرتا ہے۔ کیونکہ دن کے وقت مریخ و مشتری ہم سے نیچے حرکت کرتے ہیں۔ (اور شب کو ہم سے جانب فوق میں) +

اس حدیث میں جو آپ نے تحت الجبل فرمایا ہے۔ اس سے یا تو مطلق کوہ یا جنس کوہ مراد ہے۔ یا خاص کوئی پہاڑ مراد ہے جسے وہ سائل اور آنحضرت جانتے تھے (جس کی وجہ سے نام لینے کی ضرورت نہ پڑی کہ وہ کونسا پہاڑ ہے) اسمہا الجاریۃ سے مراد یہ ہے۔ کہ اس زمین کی لازمی صفت اور خاص علامت یہ ہے۔ کہ فضا میں چلتی رہتی ہے۔ (ہم آئندہ مسئلہ عدد سیارات میں ایک حدیث پیش کرینگے۔ جس میں ہماری اس زمین کا نام جاریہ فرمایا گیا ہے)۔ رہی یہ بات کہ خاص کر اسی زمین کی یہ صفت کیوں بیان کی۔ حالانکہ اور زمینیں (سیارات) بھی متحرک ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اوروں کی حرکت کا حال تو عام طور پر لوگوں کو بھی معلوم تھا۔ لیکن ہماری زمین کی حرکت کا حال مخفی تھا۔ اس وجہ سے ضرورت پڑی۔ کہ آپ اسے واضح فرماویں +

پھر آپ نے فرمایا ہے۔ وتحتہا بحر۔ یعنی اس زمین کے نیچے دریا ہے۔ دریا سے مراد وہ وسیع و طولانی و عمیق رستہ ہے۔ جو جوہر سیال متموج (ایتھر) سے بھرا ہوا ہے۔ جیسا کہ ہم نے نویں قول میں بہ تفصیل بیان کیا ہے۔ پھر آپ نے جو یہ فرمایا ہے۔ کہ "اس کے نیچے زمین ہے"۔ میرے خیال میں مراد آپ کی اس زمین سے مریخ ہے۔ کیونکہ ہم سابقاً بیان کر چکے ہیں۔ کہ سیارات پر لفظ ارض (زمین) کا اطلاق صحیح ہے۔ پھر آپ نے جو یہ فرمایا ہے۔ کہ نام اس کا "ماھد" ہے۔ یعنی صفت و علامت لازمہ اس کی نعومت (نرمی) ہے۔ اور قاموس وغیرہ کتابوں میں ناعم کا لفظ باغ اور اس زمین پر اطلاق کیا گیا ہے جس میں نباتات اور سبزی زیادہ ہو یہی حال کرۂ مریخ کا ہے۔ جیسا کہ جدید تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ مریخ کے ایک تہائی

حصے پر پانی غالب ہے (یعنی محیط ہے)۔ اور دو ثلث پانی سے خالی ہے۔ بخلاف ہماری زمین کے۔ (کہ اس کا دو ثلث حصہ پانی میں ڈوبا ہوا ہے صرف ایک ثلث خالی ہے) تو معلوم ہوا۔ کہ مریخ کا کھلا ہوا حصہ جو پانی سے الگ ہے۔ زیادہ سرسبز و شاداب ہے۔ اور بہ نسبت ہماری زمین کے اُس پر نباتات زیادہ ہیں۔ علاوہ اس کے کہ وہاں کی حرارت و برودت بھی معتدل ہے۔ اس وجہ سے اور بھی شادابی وہاں کی اس زمین کی شادابی سے زیادہ ہوگی۔ نیز اُس کرہ کے نباتات کا رنگ سُرخی مائل ہے۔ اور ہماری زمین کے نباتات کا رنگ سبزی مائل ہے۔ اس وجہ سے مریخ کا رنگ سرخ محسوس ہوتا ہے۔ اور جب یہ بات ثابت ہو گئی۔ تو معلوم ہوا۔ کہ کثرت نباتات کی وجہ سے کرۂ مریخ کو ناعمہ کہنا زیادہ مناسب تھا۔ جیسا کہ حضرتؑ نے ارشاد فرمایا۔ کیونکہ اس صفت کو اس کرہ سے خاص خصوصیت ہے۔

پھر حضرتؑ نے اس کے نیچے دریا فرمایا ہے۔ بظاہر ان دریاؤں سے مراد حضرتؑ کی وہی سماوی دریا ہیں جن کی تحقیق میں نے نویں قول میں بیان کی ہے۔ بلکہ اگر آپ تمام اُن حدیثوں کو ملاحظہ کریں گے۔ جن میں سماوی دریاؤں کا ذکر ہے۔ تو اکثر بلکہ کُل کو ہماری تحقیق سابق پر منطبق پائیں گے۔

نیز حدیث سابق میں یہ جو فرمایا گیا ہے۔ (وتحت ذلک البحر ارض) "اُس دریا کے نیچے پھر ایک زمین ہے"۔ میرے خیال میں اس زمین سے مراد کرۂ مشتری ہے۔ کیونکہ جو اوصاف اس زمین کے فرمائے ہیں۔ وہ سب مشتری پر منطبق ہیں۔ مثلاً آپ نے فرمایا۔ کہ اُس کا نام "فسیحہ" ہے۔ فسیحہ کے معنی وسیع ہیں۔ چونکہ بہ نسبت دیگر زمینوں کے اس زمین (کرۂ مشتری) کا عرض زیادہ ہے۔ کیونکہ اس کا حجم بہ نسبت ہماری زمین کے تقریباً ایک ہزار چار سو درجہ زیادہ ہے۔ (جیسا کہ سابقاً مذکور ہوا) تو ظاہر ہے۔ کہ اسے بلفظ فسیحہ (چوڑی اور کشادہ) تعبیر کرنا اس کے حال کے زیادہ مناسب اور اس کی ذاتی صفات میں سے ہے۔ پھر آپ نے فرمایا۔ (هی ارض بیضاء کالشمس) "یہ زمین آفتاب کی طرح سفید ہے"۔ میرے خیال میں آفتاب سے اس زمین (کرۂ مشتری) کو تشبیہ دینے کی یہ وجہ ہے۔ کہ اس پر روشنی ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ بخلاف ہماری زمین اور دیگر اراضی فوقانیہ کے۔ کہ ان میں بسبب کسی اور جسم ظلمانی کے حائل ہو جانے کے روشنی زائل بھی ہو جاتی ہے۔ (جیسا کہ شب کے وقت ہماری زمین پر بسبب آفتاب کے نیچے چلے جانے کے تاریکی ہو جاتی ہے) اور آفتاب ہمیشہ

نورانی رہتا ہے ۔کیونکہ جرم اُس کا منشاء انوار ہے ۔علی ہذا القیاس مشتری پر بھی کبھی تاریکی نہیں آتی۔کیونکہ اس کے آٹھ چاند ہیں۔(جیسا کہ تحقیقات جدیدہ سے ثابت ہؤا ہے)۔اور وہ ہمیشہ اس کے گرد حرکت کرتے رہتے ہیں۔علاوہ بریں وہاں کی رات بھی بہت چھوٹی ہے۔ اور نصف حصہ اُس کا آفتاب کی وجہ سے بھی روشن رہتا ہے ۔اور زحل کی روشنی بھی اُس پر اس طرح پڑتی ہے۔جس طرح ہماری زمین پر چاند کی روشنی۔(ان تمام اسباب کے جمع ہو جانے کی وجہ سے مشتری کا بڑا حصہ ہمیشہ نورانی رہتا ہے ۔اس وجہ سے آنحضرت ؐ نے اس کو آفتاب سے تشبیہ دی ہے) +

نیز آپ نے فرمایا ہے ۔ضوئُها کالقمر "اس زمین کی روشنی مثل چاند کے ہے ۔ بظاہر اس تشبیہ کی یہ وجہ ہے کہ مشتری کا نور ذاتی نہیں ہے ۔بلکہ آفتاب اور دیگر چاندوں سے جو اُس کے گرد پھرتے رہتے ہیں روشنی حاصل کرتا ہے جس طرح سے چاند کی روشنی بھی ذاتی نہیں ہے۔ بلکہ آفتاب کی وجہ سے اس پر روشنی رہتی ہے +

آفتاب سے تشبیہ دینے کے بعد اس جملہ کو ارشاد فرمانے کی یہی وجہ ہے۔کہ کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ نور اس کا ذاتی ہے۔کیونکہ پہلی تشبیہ سے یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا۔اُس کو یوں رفع فرمایا ہے کہ یہ زمین سفید تو ایسی معلوم ہوتی ہے۔ جیسے آفتاب۔مگر روشنی اس کی ذاتی نہیں ہے۔بلکہ اکتسابی ہے۔ جیسے باقی سیارات کا نور بھی آفتاب ہی سے مکتسب ہے +

نیز آپ نے فرمایا ہے ۔کہ (نباتها کالزعفران) "گھاس وہاں کی مثل زعفران کے ہے"۔ چونکہ وجہ شبہ اس جملہ میں حضرت ؐ نے بیان نہیں فرمائی ۔اس وجہ سے مطلب اس کا مجمل رہ گیا۔لہذا ممکن ہے۔کہ آپ کی مراد یہ ہو کہ کرہ مشتری کی گھاس طبیعت و خواص میں زعفران کی طرح ہے۔یا شکل میں زعفران کی طرح ہے۔ یا رنگ میں زعفران سے مشابہ ہے ۔جس طرح کہ کرہ مریخ کی نباتات کا رنگ سُرخی مائل ہے ۔ہماری زمین کی نباتات کا رنگ سبزی مائل ہے ۔اسی طرح ممکن ہے۔کہ مشتری کی نباتات کا رنگ زعفران کی طرح زرد ہو۔جیسا کہ فلاسفۂ حال قائل ہیں۔اس بنا پر حضرت ؐ کے کلام کا مطلب یہ ہوگا۔کہ رنگ وہاں کی گھاسوں کا ایسا ہے۔ جیسے زعفران کا رنگ ۔واللہ اعلم بالصواب +

اس مقام پر نامناسب نہ ہوگا۔اگر سیارات کی زمینوں کا رنگ اور اُن کے نباتات متکونہ موافق تقویم جدیدہ کے بیان کر دئے جائیں ۱۳۱۹ھ تقویم موید اعظم میں (زحل) کا رنگ صاص (رانگ) کا

لکھا ہُوا ہے۔ مشتری کا رنگ سفید زردی اور گندمی رنگ سے مخلوط ہے۔ مریخ کے رنگ میں سرخی ہے۔ زہرہ میں خالص سفیدی ہے۔ عطارد کا رنگ دو رنگوں سے مرکب ہے"۔ اب اس قول کو اُس حدیث سے ملا کر دیکھئے۔ جو سابقاً ذکر ہوئی۔ کہ کس طرح ایک دوسرے سے مطابق ہے۔ علاوہ اس کے اس حدیث میں اور بھی اسرار ہیں۔ جن میں سے کچھ تو اس کتاب میں مذکور ہوئے اور ہونگے۔ اور باقی کسی اور کتاب میں بیان کئے جائینگے +

چودھواں قول شریعت کا کتاب بحار میں (حافظ مثنے احتاط) سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ مَیں نے چھٹے امام جعفر بن محمد علیہ السلام سے سماوات کی بابت دریافت کیا۔ تو فرمایا۔

سبع سماوات لیس منہا سماء الّا وفیہا خلق و بینہا وبین الاخری خلق حتیٰ ینتہی الی السابعۃ قال قلت والارض فقال سبع منھن خمس فیھن خلق من خلق الرب واثنتان ھواء لیس فیہا شئی الخ۔ "سات آسمان ہیں۔ اور ان میں کوئی آسمان ایسا نہیں ہے۔ جس میں خدائے تعالےٰ کی مخلوقات میں سے ایک خلقت نہ ہو۔ اور اُس آسمان اور دوسرے آسمان کے درمیان میں بھی خلقت ہے۔ یہاں تک کہ ساتویں آسمان میں بھی مخلوقات ہیں"۔ راوی کہتا ہے۔ مَیں نے عرض کی۔ "اور زمینیں کتنی ہیں"؟ فرمایا۔ "وہ بھی سات ہیں۔ پانچ تو آباد ہیں۔ اور دو میں صرف ہوا ہے۔ اور کچھ نہیں" +

مصنفِ کتاب ہیئۃ الدین کہتا ہے۔ کہ مَیں نے اس حدیث کو بلفظہ اور بعبارتہ جناب شیخ محدث نوری رحمہ اللہ کے کتب خانہ میں خود کتاب مثنے احتاط میں بھی دیکھا ہے۔ جو اصحاب جناب صادق علیہ السلام سے تھے۔ اور انشاء اللہ ہم اسے اُس مقام پر بھی ذکر کرینگے۔ جہاں ترتیب سماوات اور اُس کی حقیقت اور اُس میں مخلوقات کے موجود ہونے کی بحث کرینگے +

اس حدیث میں معصومؑ نے جو یہ فرمایا ہے۔ اثنتان لیس فیہا شئی۔ "دو زمینوں میں کوئی آبادی نہیں ہے"۔ بظاہر ان دو زمینوں سے مراد عطارد اور کرۂ ارانوس ہے۔ جن میں فلاسفۂ حال کا گمان غالب ہے کہ آبادی نہیں ہے۔ لیکن اکثر احادیث میں مخلوقات کے ہونے کا بیان ہے۔ جس سے بظاہر اس حدیث اور دیگر احادیث میں اختلاف بیان معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر ہم یہ کہہ لیں۔ کہ یہ اختلاف بحسب اختلاف اوقات ہے۔ یعنی ایک زمانہ میں یہ دونو سیارے مخلوقات سے خالی تھے۔ اُسی زمانے کو جناب صادق علیہ السلام نے بیان فرمایا ہے۔ پھر

ان میں مخلوقات پیدا ہوئی جیسا کہ باقی حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے۔ یا یہ کہ سابق میں موجود تھے۔ پھر فنا ہو گئے۔ تو یہ اختلاف بیان ظاہری رفع ہو جائیگا۔ یا یہ مطلب لیں کہ جن احادیث میں مخلوقات کا وجود ان دونوں سیاروں میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ کسی خاص قسم کی مخلوقات ہیں۔ اور حضرت نے جو نفی فرمائی ہے۔ وہ کسی خاص قسم کے حیوانات کی نفی فرمائی ہے۔ (مگر مترجم کے نزدیک پہلی تاویل اس پچھلی تاویل سے بہتر ہے) +

(پندرھواں قول شریعت کا) کتاب بصائرالدرجات۔ اختصاص شیخ مفیدؒ۔ منتخب الاختصاص (اس میں چار طریقوں سے یہ روایت ہے)۔ اور یہی رجب باسناد قوی امام محمد باقر علیہ السلام سے امام (مہدی منتظر علیہ السلام عجل اللہ فرجہ کی بابت مروی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اما انہ سیرکب السحاب ویرقی فی الاسباب اسباب السموات السبع والارضین السبع خمس عوامر و ثنتان خرابات: ترجمہ آگاہ ہو کہ آپ (امام مہدیؑ) ابر پر سوار ہونگے۔ ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کے اسباب پر صعود فرمائینگے ان سات زمینوں میں سے پانچ تو آباد ہیں۔ اور دو ویران ہیں" +

اس روایت کی دلالت زمین کے متعدد ہونے اور ان کے آباد ہونے پر مخلوقات نوع انسانی سے واضح ہے +

لیکن حضرت نے جو یہ فرمایا ہے۔ ویرقی فی الاسباب الخ۔ اس سے بظاہر مراد آپ کی یہ ہے۔ کہ وہ آلات صعود و ترقی جو بالفعل ناقص ہیں۔ وہ اس وقت تک کامل ہو جائینگے۔ مثلاً ہوائی جہاز یا بیلون وغیرہ جو بخار یا قوت کہ بائی سے ہوا میں چلائے جاتے ہیں۔ اگرچہ ان میں آج یہ قوت نہیں ہے کہ کرۂ زمین سے دیگر کرات تک پہنچ سکیں۔ مگر اس وقت یہ ذرائع بہت اچھی طرح مکمل ہو کر ایسے ہو جائینگے۔ کہ اس زمین سے تمام سماوات اور ارضین فوقانیہ تک جا سکینگے +

کیا اس سے ناظرین قیاس نہیں کر سکتے۔ کہ ابھی چند روز قبل یہ حالت تھی۔ کہ ایک ہاتھ بھی آدمی زمین سے اوپر نہیں جا سکتا تھا۔ اور اب علوم کی ترقی اور تربیت افکار سے یہاں تک نوبت پہنچی کہ لوگ ہوائی جہازوں میں سوار ہو کر فضا میں بلکہ ابر سے بھی اوپر اور پہاڑوں سے بھی اونچے میلوں چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ لوگوں کا بیان ہے۔ کہ (ڈاکٹر نک) اتنا کرہ بخار میں اوپر کو بلند ہوا۔ کہ بارومیٹر بارہ ڈگری گھٹ گیا۔ اس کے بعد

بیلون کے ذریعے سے تیس ہزار میٹر بلند ہوا جیسا کہ اخبار الھلال ۱۳۲۷ھ میں مذکور ہے۔
پس جب کہ اتنی تھوڑی مدت میں جو آج سے صرف دو قرن ہوتے ہیں۔اس قدر ترقی ہوئی۔اور اس
حد تک لوگوں نے آلات کے بنانے میں کامیابی حاصل کی۔تو کچھ بعید نہیں ہے۔کہ تدریجاً یہ
وسباب و آلات اس قدر ترقی کریں۔کہ اس کرہ ہوا سے نکل کر اس سے اوپر کی فضا تک بھی پہنچ
جائیں۔اور کل مقدمات و مبادی ان آلات کے مکمل ہو جائیں۔اور موانع جو بالفعل نظر آرہے ہیں۔
سب مرتفع ہو جائیں۔اور لوگ ان کے ذریعے اوپر کے کرات تک پہنچ کر وہاں کے ساکنین
سے میل جول پیدا کریں۔جیسا کہ قرآن مجید کی ایک آیت میں اس مطلب کا اشعار معلوم ہوتا
ہے۔سورۂ حجر میں خدائے تعالیٰ فرماتا ہے۔ ولو فتحنا علیهم بابا من السماء فظلوا فیه
یعرجون "یعنی اگر ان لوگوں پر آسمان کا ایک دروازہ کھول دیں۔(یعنی کوئی سبب آسمان
تک چڑھنے کا مہیا کر دیں) تو لوگ اس دروازہ میں سے ہو کر چڑھنے لگیں"+
یا یہ کہ انہیں کرات کے رہنے والوں کے پاس بذریعہ ترقی علوم ایسے آلات مہیا ہو
جائیں۔کہ ہم تک ان آلات کے ذریعے سے آسکیں۔اور ہم ان سے سیکھ کر وہاں تک
جانے کے آلات بنالیں۔بہر حال یہ سب صورتیں ممکن ہیں۔خواہ ہم خود ترقی کر کے وہاں
تک پہنچیں۔یا ان کی تعلیم سے فائدہ اٹھا کر ان کے کرات تک جا سکیں۔اور ہرگز نفوس
قابلہ ان کے قبول کرنے سے انکار نہیں کرتے۔(جبکہ روزانہ ترقی علوم و فنون کو آنکھوں
مشاہدہ کر رہے ہیں) اور کاش کوئی شخص اگر میری تمام زندگی کے دنوں کو اس زمانے کی
ترقی کے ایک دن کے مقابلہ میں خرید تا۔تو اس زندگی کو اس کے ہاتھ فروخت کرنے
پر تیار تھا۔اور ہرگز مجھے اس تجارت میں خسارہ نہ ہوتا۔بلکہ فائدہ ہی فائدہ تھا۔لیکن
ہم اپنی عمر و استعداد کی حالت کو جو دیکھتے ہیں تو ابتک ان علوم و فنون کے ابتدائی معلومات کے
ادراک سے بھی قاصر ہیں۔باوجودیکہ ایک خلق کثیر اس دنیا کی ان مبادی پر فائز ہے۔مگر ہم اس
کے مشاہدے سے بھی محروم ہیں۔دیکھئے ایک جزدی چیز ہے دوربین اور ٹیلسکوپ۔جن سے
چاند کے پہاڑ وغیرہ دکھائی دیتے ہیں۔مگر آج تک ہمارے ملک میں ان کا وجود نہیں+
(خلاصہ یہ کہ) اسباب سماویہ کا اتنی ترقی کرنا جس سے مسافرین ان اراضی سیارات تک
آئندہ زمانہ میں جاسکتے ہیں ظاہر و مظنون ہے۔لہذا صحیح و جائز ہوگا۔اگر ہم اسی مطلب پر جناب
امام محمد باقرؑ کے اس ارشاد کو جسے سابق میں امام مہدی علیہ السلام کی بابت لکھ آئے ہیں محمول

کریں۔ رہا ابر پر سوار ہونا (جیسا کہ حدیث سابق میں ہے) بایں معنی کہ اس کے اوپر تک چل سکتے ہیں۔ یعنی ہم بیلون وغیرہ کے ذریعے سے ابر سے اوپر تک چلے جاسکتے ہیں۔ اور وہ نیچے ہی رہ جاتا ہے۔ تو یہ آج بھی ممکن ہے۔ اس کے قبول کرنے میں توکسی کو بھی عذر نہیں ہو سکتا۔ لہذا معلوم ہوا کہ جو کچھ معصوم نے اس موقع پر فرمایا ہے۔ وہ اس زمانے کی ترقی پر نظر فرما کے قبل ان اسباب و آلات کے پیدا ہونے اور بنائے جانے کے اپنے علم وہبی کے ذریعے سے فرمایا ہے۔ اور بالکل صحیح و مطابق فلسفہ جدیدہ کے ہے۔ یہ ہے وہ شریعت حقہ جو ایک ذرہ برابر بھی عقل سے مخالف نہیں۔ اور نہ فلسفہ جدیدہ اس کی نفی کر سکتا ہے) +

اس حدیث کے مضمون سے قریب قریب ایک اور حدیث امام خامس محمد باقرؑ سے اور نیز ان کے فرزند بزرگوار امام جعفر صادقؑ سے کتب مذکورہ بالا میں مروی ہے (وصف جناب امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالبؑ میں) کہ فرمایا۔ انّہٗ اختار السحاب الصعب علی الذلول فدارت بہ سبع ارضین فوجد ثلث خراب واربع عوامر الخ۔ یعنی حضرتؑ نے ایک ابر سخت کو منتخب فرمایا۔ اور اس پر سوار ہوئے۔ جس نے آپ کو ساتوں زمینوں کی سیر کرا دی۔ جن میں سے تین کو آپ نے غیر آباد پایا۔ اور چار کو آباد۔ یہ وہ بیان ہے۔ جہاں تک اپنے ذہن نے کام دیا ہے۔ باقی واقعیت کا علم خدا کو اور اس کے اولیائے معصومین علیہم السلام کو ہے +

پانچواں مسئلہ

اس امر کے بیان میں کہ سیارات تو نو ہیں اور زمینوں کی تعداد شریعت میں سات بیان کی گئی ہے پھر مطابقت کیونکر ہوگی؟

سوال یہ ہے کہ جدید فلسفہ سیارات کی تعداد نو بتاتا ہے۔ اور شریعت آپ کی زمینوں کی تعداد سات بتاتی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ شائد صاحب شریعت کو دو سیاروں کا حال معلوم نہ تھا۔ اور اگر کہئے۔ کہ بیان صاحب شریعت کا فلسفہ قدیم کے موافق ہے۔ یعنی حکمائے یونان کواکب سیارہ کو سات ہی بتاتے تھے۔ تو پھر اس پر بھی یہ اعتراض ہوگا۔ کہ شریعت تو

ان کو زمینوں سے تعبیر کرتی ہے۔ جو بظاہر جدید فلسفہ کے مطابق ہے۔ اور حکماے سابقین نے کبھی سیارات پر زمین کا اطلاق نہیں کیا۔ اور نہ اُنہوں نے ہماری اس زمین کو جس پر ہم بستے ہیں سیّارات میں شمار کیا ہے۔ باوجودیکہ اس کو زمین کہنا مسلمات فریقین سے ہے۔ نیز یہ کہ فلسفہ قدیم آفتاب کو سیّارات میں شمار کرتا ہے۔ حالانکہ وہ دونوں قسم کے فلسفیوں کے نزدیک زمینوں کے شمار میں داخل نہیں ہے۔ پس کیونکر صاحبِ شریعت کا یہ بیان صحیح مانا جائے۔ جو سماوات سبعہ اور ارضین سبعہ کی بابت فرمایا ہے۔ اور دو سیّاروں (فلکان۔ نبتون) کو بالکل بیان نہیں کیا +

جواب

چونکہ اس سوال کی دو شقیں ہیں۔ اس لئے ہم نے جواب کو بھی دو حصّوں میں بیان کیا ہے۔ پہلے حصّے میں اسکا جواب دیا ہے۔ کہ آیا صاحبِ شریعت نے زمینوں کا شمار سات تک بیان کیا ہے یا نہیں۔ دوسرے حصّے میں یہ بیان کیا ہے۔ کہ آیا صاحبِ شریعت نے سیّارۂ فلکان و نبتون کا بیان کیا ہے یا نہیں +

(حصّۂ اوّل) اگرچہ اکثر کلمات شریعت میں زمینوں کے متعدد ہونے اور سماوات کے سات ہونے کا بیان ہے۔ لیکن کسی مقام پر عدد کا بیان کرنا زائد کی نفی نہیں کرتا۔ مثلاً اگر کوئی شخص کہے۔ کہ مَیں نے دس آدمی دیکھے۔ تو اس سے یہ نہیں سمجھا جاسکتا۔ کہ اس سے زائد اس نے نہیں دیکھے۔ بلکہ ممکن ہے۔ کہ کسی خاص وجہ سے ان ہی دس آدمیوں کا ذکر کیا ہو۔ اور بقیہ کو کسی مصلحت سے بیان نہ کیا ہو۔ اس کی مثالیں کلام عرب میں بہت ہیں۔ اور شاہد اس مطلب پر یہ ہے۔ کہ ہمارے ائمہ معصومین ؑ نے اپنے خاص خاص اصحاب سے بیان فرما دیا ہے۔ کہ زمینوں کی تعداد سات سے زیادہ ہے۔ جیسا کہ ہم آئندہ بیان کرینگے۔ کہ ان حضرات ؑ نے سیّارۂ فلکان و نبتون کا بھی ذکر اپنی حدیثوں میں فرمایا ہے۔ نیز اس سے سابق دائرے مسئلہ کے پچھلے فول میں ہم نے ۵۰ حدیث نقل کی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ معصوم ؑ نے زمینوں کی تعداد قریب قریب تین سو بیان فرمائی ہے۔ اور بعض حدیثوں میں چالیس زمینوں کا ذکر کیا ہے۔ نیز اس قسم کی اور حدیثیں مسئلہ تعدد عوالم میں بیان ہونگی +

اور جب یہ بات معلوم ہوگئی۔ تو اسے بھی سمجھ لینا چاہئے۔ کہ اکثر ان حضرات ؑ نے سات

ہی زمینوں کا تذکرہ اپنے کلام میں کیوں فرمایا" فلکان" اور "نبتون" کو کیوں چھوڑ دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ عام نگاہوں میں سات ہی سیارے متحرک معلوم ہوتے تھے۔ حتےکہ حکمائے یونان نے بھی سات ہی شمار کئے۔ لیکن ان میں سے بعض کی حرکت کو وہ بالکل سمجھے بھی نہیں (مثلاً زمین کہ اس کو حکمائے سابقین نے سیارہ نہیں سمجھا ہے)۔ اور وہ سات یہ تھے۔ زمین۔ زہرہ۔ عطارد۔ مریخ۔ مشتری۔ زحل۔ ارانوس +

حکمائے سابقین بھی قائل تھے۔ کہ "ارانوس" دکھائی دیتا ہے۔ مگر یہ کہ بہ نسبت اور ستاروں کے بہت چھوٹا سا ستارہ ہے۔ جیسے سُہا۔ ہاں اُس سے زیادہ روشن ہے۔ تو اہل ہیئت قدیم وجدید دونوں ہی کوکب "ارانوس" کے وجود کے قائل تھے اور ہیں۔ اگرچہ قدماً کو اُس کی حرکت محسوس نہیں ہوئی۔ کیونکہ اُس کی رفتار بہت کم ہے۔ نیز روشنی بھی اُس کی بسبب دیگر سیارات عظیمہ کے کم ہے۔ رہے "فلکان" اور "نبتون"۔ تو ان میں سے اوّل یعنی فلکان چونکہ آفتاب سے بہت قریب ہے۔ اور دوم یعنی نبتون آفتاب سے بہت دور واقع ہوا ہے۔ اس وجہ سے کوئی شخص محض نگاہ سے ان کو نہ دیکھ سکا۔ اور اب جو ان کو محسوس کیا گیا ہے۔ تو بڑی بڑی مکمل دوربینوں کے ذریعے سے۔ نہ فقط نگاہ کی قوت سے۔ لہذا بہت اچھی طرح ممکن ہے۔ کہ ہمارے ائمہ علیہم السلام نے عامہ ناس سے گفتگو کے موقع پر انہیں سیارات کا ذکر فرمایا ہے۔ جو آنکھوں سے دکھائی دیتے تھے۔ یا اس قابل تھے۔ کہ اگر غور سے نظر کریں۔ تو دکھائی دے سکیں۔ باقی وہ سیارات جو صرف آنکھوں کی قوت سے دکھائی نہ دے سکتے تھے۔ اور نہ اُس زمانے کے لوگوں کا دماغ اُن کے ادراک واحساس تک پہنچا تھا۔ اس لئے ان سیارات کا ذکر اُن سے بے فائدہ تھا۔ بلکہ ان کے بیان میں خوف تھا اس امر کا۔ کہ لوگ کہینگے۔ لو صاحب! اگر فلکان و نبتون موجود ہیں۔ تو دکھائی کیوں نہیں دیتے۔ اور چونکہ دکھائی نہیں دیتے۔ لہذا معصوم نے معاذ اللہ غلط بیان کیا۔ کیونکہ آدمی اُسی شے کا اقرار کرتا ہے۔ جسے وہ آنکھوں سے محسوس کر لیتا ہے (خصوصاً عوام الناس)۔ باقی جو خاص خاص اصحاب مومنین تھے۔ اور جن کو معصومین کے بیان پر پورا اعتماد تھا۔ کہ یہ حضرات ہرگز خلاف واقع نہیں بیان کرتے۔ اُن سے ان دو سیاروں کو بھی بیان کر دیا ہے۔ جیسا کہ آئندہ میرے بیان سے واضح ہوگا +

(۵) یہ امر کہ سماوات کو سات ہی کیوں بیان کیا۔ حالانکہ وہ بھی نو ہیں۔ تو اُس کا یہ جواب

ہے۔ کہ سماوات کا لحاظ بھی باعتبار زمینوں کے ہے۔ جب تمام زمینوں میں سے اُنہیں زمینوں کا ذکر فرمایا جو محسوس ہیں۔ تو سماوات کو اُسی قدر بیان کرنا ضروری تھا جو اُن زمینوں کے مقابل میں ہیں۔ تاکہ سُننے والوں کو تشویش نہ پیدا ہو۔ (کہ زمین تو صرف سات اور آسمان نو۔ یہ کیا معنی)۔

نیز یہاں ایک احتمال اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ آئندہ جیساکہ بیان ہوگا۔ سماوات سے مراد وہ کرات بخاریہ ہیں۔ جو ہر زمین کے کرات ہوائیہ کو محیط ہیں۔ اور کرۂ بخاریہ دو ہی سببوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک حرارت اور اجزائے ناریہ سے۔ جو جسم ارضی سے اُٹھتے ہیں۔ دوسرے کثرت رطوبت اور اجزائے مائیہ سے۔ اور یہ دو چیزیں صرف سیّارات سبعہ ہی میں ابتک محسوس ہوسکی ہیں۔ اِسی وجہ سے حال کے فلاسفروں نے کرۂ بخاریہ کا دکھائی دینا صرف ان سات سیاروں میں بیان کیا ہے۔ جیساکہ آئندہ بارھویں مسئلہ میں ہم تصریحات حکمائے حال کو بیان کریں گے +

رہے وہ دو مستور سیارے یعنی فلکان اور نبتون۔ توان دو سیّاروں میں ان دونوں سببوں کا پایا جانا بعید ہے۔ فلکان میں تو اس وجہ سے۔ کہ وہ آفتاب سے بہت ہی قریب ہے۔ اس وجہ سے ممکن نہیں۔ کہ اُس میں رطوبت باقی ہو۔ جس سے بخارات اُٹھ سکیں۔ اور نبتون چونکہ آفتاب سے بہت ہی دور ہے۔ اِس وجہ سے عقلاً بعید معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُس میں حرارت پائی جاتی ہو۔ اور جب حرارت نہ ہُوئی۔ تو بخارات کہاں سے پیدا ہونگے۔ چنانچہ حکمائے حال نے آفتاب کی حرارت نبتون میں (نو سو درجہ) بہ نسبت ہماری اس زمین کے کم بتائی ہے۔ اور جب کہ ان دو سیّاروں سے بخارات کا اُٹھنا ممکن نہ ہُوا۔ توان کے واسطے سماوات کا ہونا بھی ممکن نہ ہُوا۔ اس وجہ سے ہوسکتا ہے۔ کہ معصومین ؑ نے ان دونوں کے واسطے سماوات کا بیان نہیں کیا +

لیکن اس قدر عرض کرنا ضروری ہے۔ کہ یہ امور جو ابھی بیان کئے گئے ہیں۔ یا آئندہ بیان ہونگے۔ ظنیات ہیں۔ اور قریب بصحت اپنے گمان و فہم و دلائل ظاہرہ کے بموجب معلوم ہوتے ہیں۔ ہم ان دلیلوں کو مبادی یقینیہ نہیں کہتے۔ اور نہ ان ظنی دلیلوں سے حکم قطعی پیدا کرتے ہیں۔ لیکن یہ کہتے ہیں۔ کہ ایسا گمان ہوتا ہے۔ کہ فی الواقع ایسا ہی ہو۔ باقی حقیقت کا علم اُسی کو ہے۔ جو ان کا خالق ہے۔ والحق ادری بالذی خلقہ +

(**دُوسرا حصّہ**) کیا ہماری شریعت نے "فلکان" اور "نبتون" کا ذکر فرمایا ہے۔ یا

نہیں۔ اگر بیان نہیں کیا ہے۔ تو کیا کوئی خاص مصلحت تھی؟ اِس مقام کی تحقیق کے واسطے اتنا کہنا ضروری ہے۔ کہ نام کسی چیز کا ہر ملک میں مختلف ہوتا ہے۔ پس یہ ضروری نہیں۔ کہ جو کسی خاص قوم میں لفظ متداول ہو۔ صاحب شریعت نے بھی اُسی کو فرمایا ہو۔ بلکہ جائز ہے۔ کہ اُس کے ایسے اوصاف بیان کر دئے ہوں۔ جو اُس پر منطبق ہوتے ہوں۔ اور سمجھنے والے سمجھ سکتے ہوں۔ کہ یہ فلاں شے کا ذکر ہے۔ (مثلاً انگریزی میں چاند کو مُون کہتے ہیں۔ تو کیا ضروری ہے۔ کہ ہم بروقت بیان قمر کے لفظ مُون ہی زبان سے ادا کریں۔ جب ہی اُس کی حقیقت سمجھ میں آئیگی۔ یا یہ کہ بعض اوصاف کا اُس کے بیان کر دینا جو مُون پر منطبق ہوں کافی ہوگا۔ عرف و استعمال و عقل کا حکم ہے۔ کہ بیشک بیان اوصاف کافی ہو سکتا ہے) + بہر حال ہم اب کہتے ہیں۔ کہ ہماری شریعت اسلامیہ نے ان دو سیاروں کو بھی بیان فرمایا ہے۔ اور اُن کے ایسے اوصاف ارشاد کر دئے ہیں۔ جو ہُو بہُو نبتون اور فلکان پر منطبق ہیں +

نبتون (جس کی تحقیق سنہ ۱۲۶۴ ہجری مطابق سنہ ۱۸۴۶ء میں ہوئی ہے) کی طرف میرے گمان میں یہ حدیث اشارہ کرتی ہے۔ جو بحار اور معانی الاخبار وغیرہ میں باسناد قوی چھٹے امام جناب جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ جب کہ لوگوں نے آپ سے "افق مبین" کو دریافت کیا ہے۔ کہ یہ کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا۔ قاع بین یدی العرش فیہ انہار تطرد۔ "ایک صاف زمین ہے عرش کے سامنے۔ جس میں نہریں بہتی ہیں"۔ (قاع) لغت میں ارض یعنی زمین کو کہتے ہیں۔ اور "طرد" کے معنی جریان کے ہیں۔ اِس حدیث کا مخالف ہونا فلسفہ قدیم سے اور موافق و منطبق ہونا کرہ نبتون پر واضح ہے۔ کیونکہ "عرش" لغت میں سقف کو کہتے ہیں۔ اور زبان شریعت میں منتہائے عوالم اجرام و اجسام کا نام عرش ہے۔ جس طرح کہ "کرسی" کا لفظ ہماری شریعت میں محدد افلاک سیارات کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اور جو ہمارے اس آفتاب کے عالم کی انتہائی حد ہے۔ اس بنا پر ممکن ہے۔ کہ وہ زمین جسے معصوم نے اس حدیث میں بیان فرمایا ہے۔ کہ عرش کے سامنے ہے۔ وہ "ارض نبتون" ہی ہو۔ کیونکہ بظاہر وہی ایک ایسا کرہ معلوم ہوتا ہے۔ جو عالم آفتاب کا منتہی ہے۔ اور تمام اجرام ثوابت کے سامنے ہے۔ اور بظاہر اُسے افق کہنے کی یہ وجہ ہے۔ کہ اُس کا مدار حرکت ہمارے تمام ان اجرام سماویہ اور اُن کے مدارات کو محیط ہے۔ جس طرح افق تمام جرم زمین کو محیط ہے +

باقی رہا "فلکان" (جس کی تحقیق سنہ ۱۲۶۴ ہجری مطابق سنہ ۱۸۴۶ء میں ہوئی ہے)۔ اُسکی

طرف بظاہر یہ حدیث ناظر ہے۔ جو کتاب بحار میں علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے نقل فرمائی ہے۔ اور کتاب مناقب میں (حافظ شیخ رجب برسی نے) جس کی تالیف سنہ ۸۱۸ھ میں ہوئی ہے۔ اور نیز مصباح کفعمی میں (جس کے مؤلف فاضل کفعمی ابراہیم عالم شیعی علماے قرن نہم سے ہیں) باسناد قوی ساتویں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام بن جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے۔ حضرت نے اپنے آبائے طاہرین ع سے اُنہوں نے جناب رسالت مآب محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے۔ کہ آپ نے فرمایا۔ جبرئیل ع نے بیان کیا۔ والذی بعثک بالحق نبیاان خلف المغرب ارضاً بیضاء فیہا خلق من خلق اللہ "قسم اُس پروردگار کی جس نے آپ کو سچا نبی بنایا ہے۔ کہ مغرب کی پشت پر ایک سفید زمین ہے۔ جس میں مخلوقات خدائے تعالےٰ میں سے ایک مخلوق رہتی ہے۔" یہاں تک کہ فرمایا۔ ومسیر الشمس فی بلادھم اربعین یوماً "اور آفتاب کی گردش اُن کے شہروں میں چالیس دن کی ہے۔" یعنی بقدر چالیس دن کی گردش آفتاب کے اُس کا طول وعرض ہے +

اسی حدیث کی مثل ایک اور حدیث ہے۔ جسے علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے بحار میں بعض مفسرین سے نقل کیا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے۔ "کہ خدائے تعالےٰ نے جبل قاف کی پشت پر (یعنی اُس سے اوپر) ایک سفید زمین پیدا کی ہے۔ جو مثل جلادار چاندی کے ہے۔ طول اُس کا بقدر آفتاب کے چالیس روز گردش کرنے کے ہے۔" الخ +

ان مطالب کا کوکب فلکان پر انطباق واضح ہے۔ کیونکہ وہ اس سبب سے کہ آفتاب سے بہت زیادہ قریب ہے۔ اور شعاع آفتاب اُس پر قوت کے ساتھ پڑتی ہے۔ جلادار چاندی سے بھی زیادہ روشن معلوم ہوتا ہے +

اس مطلب کے سمجھنے کے واسطے ناظرین کو صرف اس قدر سمجھنا کافی ہوگا۔ کہ "عطارد" کا بُعد آفتاب سے ۲۹ درجہ ہے۔ باوجود اس کے آفتاب کی روشنی اور اُس کی حرارت "عطارد" میں بہ نسبت ہماری اس زمین کے آٹھ گُن زیادہ ہے۔ اور کوکب "فلکان" صرف ۷ درجہ آفتاب سے دور ہے۔ تو ظاہر ہے کہ آفتاب کی روشنی اُس پر کس حد کی پڑنی چاہئے۔ اور کس قدر اُسے چمکدار رہنا چاہئے۔ اسی وجہ سے اہل یورپ نے اس سیارہ کا نام "فلکان" رکھا ہے۔ کیونکہ "فلکان" ایک آتشی پہاڑ کا نام ہے۔ (یہ لفظ اصل برکان کا معرب ہے)۔ حاصل یہ کہ "فلکان" بسبب اس کے کہ آفتاب سے زیادہ نزدیک ہے بہ نسبت اور اجرام کے زیادہ مفید ہے +

ایک اور وجہ اس تطبیق کی یہ ہو سکتی ہے۔ کہ ہر ارض سیارہ کا طول اُس کے خط استوا کو کہتے ہیں یعنی دائرۂ استواء کو۔ جیسا کہ ہماری اس زمین کے لئے ہے۔ اور آفتاب کا مقابلہ کوکب فلکان کے دائرہ طولیہ کے اجزاء سے بیس روز (ہماری زمین کے دنوں کے حساب سے) کی مقدار میں ہوتا ہے۔ یعنی ہمارے دنوں کے اعتبار سے بیس روز میں پورا دورہ فلکان کا آفتاب کے گرد ہو جاتا ہے۔ تو گویا اُس کی سالانہ رفتار بیس روز کی ہوئی۔ نہ محوری رفتار۔ کیونکہ فلکان کی محوری رفتار (یعنی اپنے مرکز کے گرد حرکت کرنا) تو تقریباً اٹھارہ گھنٹہ میں پوری ہوتی ہے۔ اور آفتاب کے گرد سالانہ حرکت اُس کی بیس روز میں تمام ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے وہاں کے دن اور رات دونوں ہی نو نو گھنٹے کے ہیں۔ اور جب کہ دونوں کے مجموعے کی مقدار بیس روز کی حرکت کے مقابلہ میں ہوئی۔ تو صرف ایک کی (یعنی دن یا رات کی) چالیس دن کے مقابلہ میں ہوئی۔ تو ممکن ہے۔ کہ معصومؑ نے لفظ "یوم" سے جو حدیث میں فرمایا ہے۔ "نہار" (یعنی صرف وہی حصہ جو روشن ہوتا ہے۔ اور رات کا مقابل ہے) مراد لی ہو۔ کیونکہ عرب میں یوم نہار کو بھی کہتے ہیں۔ (اگرچہ اصل وضع اس لفظ کی مجموعۂ شب و روز کے واسطے ہے)۔ تو اس بنا پر حدیث کا مطلب یہ ہو گا۔ کہ طول کرۂ فلکان کا آفتاب کے چالیس روز کے چلنے کی مقدار کے برابر ہے۔ جو کرۂ فلکان کی گردش سالانہ ہے۔ اور یہ کہ اُس کی زمین بسبب آفتاب کی زیادہ روشنی کے جلادار چاندی کی طرح سفید ہے۔ اور یہ کرہ فلکان کوہ قاف (ظل مخروطی زمین) کے اُس طرف یعنی جانب مخالف میں واقع ہے۔ اور یہ کہ کرہ مذکورہ بلحاظ ہماری زمین کے جانب مغرب میں واقع ہے۔ جبکہ یہ زمین آفتاب کے اعتبار سے جانب مشرق میں واقع ہو +

اسی حدیث کے قریب قریب اور بھی روایتیں ہیں جنہیں حافظ سیوطی نے درمنثور میں بعض ائمہ کوفہ سے نقل کیا ہے۔ اور غالباً سیوطی کی مراد بعض ائمہ کے لفظ سے جناب امام جعفر صادق ع ہوں۔ (کیونکہ بیشتر اس قسم کے حکمی نکتے اور رموز فلسفیانہ حضرتؑ ہی سے لوگوں نے سیکھے اور سُنے ہیں) مضمون روایت یہ ہے۔ کہ چند اصحاب رسولؐ ایک موقع پر مجتمع تھے۔ آنحضرتؐ کا اُدھر سے گذر ہوا۔ لوگ تعظیم کے لئے کھڑے ہوئے۔ آپ اُن کی طرف بڑھے یہ دیکھ کر سب خاموش ہو گئے۔ آپ نے دریافت فرمایا۔ کہ کیا باتیں کرتے تھے۔ عرض کی۔ کہ اس وقت آفتاب کو دیکھ کر اُسی کے باب میں فکر میں کر رہے تھے۔ کہ کہاں سے آتا ہے۔ اور کدھر جاتا ہے۔ اور نیز خلقت پروردگار عالم کی بابت غور کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں اسی طرح مخلوقات پروردگار میں غور و فکر کیا کرو۔ لیکن خود پروردگار عالم کے معاملہ میں غور و فکر نہ کرنا۔ (کیونکہ اُس کی

حقیقت کا سمجھنا عقل انسانی سے باہر ہے ❖

خدائے تعالےٰ نے مغرب کے اُس طرف ایک زمین خلق فرمائی ہے جو سفید ہے۔ اُس کی سفیدی اور روشنی بقدر آفتاب کے چالیس روز کی رفتار کے ہے۔ اس زمین میں خدائے تعالےٰ کی مخلوقات میں سے ایک خلقت کثیر رہتی ہے ❖

(**تتمۂ ضروریہ**) چند روایات میں ہمارے ائمۂ معصومین ؑ کے اشارے اس امر کے بھی ہیں۔ کہ ایک زمین ایسی بھی موجود ہے۔ جسے لوگ آنکھوں سے نہیں دیکھتے۔ اور وہ بہ نسبت ہماری زمین کے بہت زیادہ بڑی ہے۔ چنانچہ حافظ فخر الدین طریحی نے کتاب مجمع البحرین میں فخر الدین کی کتاب جواہر القرآن سے نقل کیا ہے۔ اور اُس نے اپنی سند سے جناب رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے۔ حضرت ؐ نے فرمایا۔ اللہ تعالےٰ ارضًا بیضاء مسیرۃ الشمس فیہا ثلثون یومًا ھی مثل الدنیا ثلثون مرۃ یعنی پروردگار عالم نے ایک زمین پیدا کی ہے جس میں آفتاب کی پوری گردش تیس روز کی مقدار میں ہوتی ہے۔ اور یہ زمین دنیا سے تیس گنا بڑی ہے" دوسری روایت شیخ زاہد ابواللیث سمرقندی نے اپنی کتاب میں وارد کی ہے۔ (اس کتاب کا ایک نسخہ خود میرے پاس بھی موجود ہے۔ بہت پرانا نسخہ ہے۔ بظاہر قریب ۵۰۰ ہجری کا لکھا ہوا ہے) مضمون اُس کا یہ ہے۔ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "خدائے تعالےٰ کی ایک زمین ہے سفید۔ جو دنیا سے تیس حصے بڑی ہے۔ آفتاب اس زمین کے گرد تیس روز میں پورا دورہ تمام کرتا ہے۔ یہ زمین مخلوقات سے بھری ہوئی ہے" تیسری روایت (بحار الانوار) اور (بصائر الدرجات) میں جناب امام جعفر صادق (علیہ السلام) سے منقول ہے۔ آپ نے فرمایا۔ ان من وراء ارضکم ھٰذہ ارضًا بیضاء ضوئہا منہا فیہا خلق یعبدون اللہ تعالےٰ ولا یشرکون بہ شیئًا۔ "تمہاری اس زمین سے اوپر ایک روشن زمین ہے جس کی روشنی ہم سے یعنی ہماری زمین کے عکس سے ہمارے آفتاب کی وجہ سے ہے۔ اُس میں خدائے تعالےٰ کی پیدا کی ہوئی ایک خلقت رہتی ہے۔ جو اُس کی عبادت کرتی ہے۔ اور کوئی اُن میں سے کافر نہیں ہے"۔

(میں کہتا ہوں۔ کہ) ان حدیثوں سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ آئندہ انشاء اللہ کوئی اور کرہ سیارہ بذریعہ آلات رصدیہ معلوم ہوگا۔ جو ابھی تک دائرۂ تحقیق میں نہیں آیا ہے۔ (جس طرح فلکان و نپتون وغیرہ اتنی مدت بعد حال کے آلات اور دوربینوں سے محسوس و معروف ہوئے۔ لیکن

ان روایات میں یہ بھی احتمال ہے۔ کہ مراد اس زمین سے جس کا ذکر ان احادیث میں آیا ہے "کرۂ فلکان" ہی ہو۔ بشرطیکہ (ہی مثل الدنیا ثلثون مرۃ) کے جملہ میں تاویل کی جائے۔ اور کہا جائے کہ اگرچہ زمانہ حال کی تحقیق بتاتی ہے۔ کہ کرۂ فلکان بہ نسبت زمین کے چھوٹا ہے۔ لیکن ممکن ہے۔ کہ حکمائے حال کو اشتباہ ہوا ہو۔ اور در اصل وہ زمین یعنی کرۂ فلکان اس زمین سے اسی قدر بڑا ہو جس قدر حدیث میں مذکور ہے۔ چنانچہ بعض فلاسفران حال کا یہ قول ہے بھی۔ کہ چونکہ آج تک ہمیں اس زمین کا کوئی چاند دکھائی نہیں دیا ہے۔ اور نہ کوئی اور علامت۔ اس وجہ سے ہم صاف نہیں کہہ سکتے۔ کہ یہ کس قدر طول و عرض رکھتا ہے۔ اور ہم سے کس قدر بعید ہے۔ (لہذا اچھی طرح ممکن ہے۔ کہ اگرچہ ان لوگوں نے چھوٹا ہونا کرہ فلکان کا ہماری زمین کی نسبت بیان کیا ہے۔ لیکن چونکہ یہ قول ان کا تحقیق نہیں ہے۔ سفے الواقع غلط ہو۔ اور وہی درست ہو۔ جو معصوم نے ارشاد فرمایا ہے)۔ اور جب ہم یہ تاویل کرینگے تو حضرت کے اس کلام کی توجیہ بھی کچھ اور کرنی پڑیگی۔ (ومسیرۃ الشمس فیہا ثلثون یوما)+

نیز ان احادیث سے یہ بھی محتمل ہے کہ کسی اور زمین سیارہ کی طرف اشارہ ہو۔ جو ہمارے نظام شمسی میں داخل ہے۔ اور وہ علاوہ "فلکان" اور "نبتون" کے ہے۔ اگرچہ ابھی تک ایسی کسی زمین کا ہونا جدید ہیئت نے ثابت نہیں کیا ہے۔ لیکن کسی کو انکار بھی نہیں ہے۔ اس سے کہ علاوہ ان نو سیاروں کے اور بھی موجود ہوں۔ اور وہ آئندہ کسی ذریعہ سے معلوم ہوں۔ نیز ہم عنقریب بیان کرینگے۔ کہ روایات و احادیث سے ایسا ثابت ہوتا ہے۔ کہ نجوم سیارہ در اصل گیارہ ہیں۔ (دیکھو مسئلہ اعداد سیارات)۔ بلکہ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ سیارات جو اب تک رصد جدید سے بھی مرصود نہیں ہیں۔ ان کا مقام افلاک نجوم مذکورہ سے علیحدہ بلکہ کرۂ نبتون سے بھی علیحدہ ہے۔ لہذا ہمیں چاہئے۔ کہ ان کی تحقیق کے بھی منتظر رہیں۔ انشاء اللہ کسی وقت یہ بھی منکشف ہو کر رہینگے۔ جبکہ آلات رصدیہ اور دوربینیں اور بھی مکمل ہو جائینگی۔ لیکن اس وقت میرا یہ خیال ہے۔ کہ اگر آئندہ ان سیارات کا انکشاف ہو (انشاء اللہ)۔ تو نام ان کا "نجم محمدی" رکھنا چاہئے۔ کیونکہ حضرت ہی نے اسے بیان فرمایا ہے۔ اور ان کے صفات و مقام کو ایک ہزار کئی سو برس پہلے واضح فرما دیا ہے۔ مگر کہاں ایسا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اگر تحقیق ان کی ہوگی بھی۔ تو یورپین فلاسفروں کے ہاتھوں۔ وہ جو کچھ چاہینگے۔ ان کا نام تجویز کرینگے۔ مسلمانوں کا یہ حوصلہ کہاں ہے۔ اور ان کے قلوب میں یہ گرمی اور ان کی ہمتوں میں یہ زور کب ہے۔

کہ تحصیل کمالات کریں۔ اور خود ایسے آلات مہیا کریں۔ جن سے ان کواکب کی تحقیقات کرکے "نجم محمدیؐ" ان کا نام رکھیں۔ اہل فرنگ اگرچہ بالفعل موفق ہیں۔ اور تحقیقات میں کوتاہی نہیں کرتے۔ لیکن پھر بھی مسلمانوں پر اُن کی نظر مشفقانہ نہیں ہے۔ بلکہ برتاؤ ان کا ہم سے ظاہراً کچھ اور باطناً کچھ ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا مشن ہمیشہ ہماری شریعت کے آثار کے مٹانے کے درپے رہتا ہے۔ اور ہمارے دین کے کلمہ جامعہ کی تفریق کے فکر میں سرگرم ہے۔ اور ہم ہیں۔ کہ غافل سو رہے ہیں۔ تو کب یہ امید ہو سکتی ہے۔ کہ ہمارے رسولؐ کے نام سے اس سیارہ کو موسوم کرینگے۔ اِلّا یہ کہ خدائے تعالےٰ شاید مسلمانوں کی اس حالت کو بدل دے۔ ان کی ہمتیں بلند ہوں۔ ورنہ مسلمانوں کی اس حالت پر تو رونا آتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ نہایت گہرے غار میں پستی کے چلے جا رہے ہیں۔ اور بالکل ہوشیار نہیں ہوتے۔ اور اپنے تئیں نہیں سنبھالتے۔ غالباً یہی وہ زمانہ ہے۔ جس کی خبر معصومؑ نے دی ہے۔ کہ مومن کا دل ایسا ہو جائیگا۔ جیسے نمک میں پانی گھُل جاتا ہے۔ اور بے نام و نشان ہو جاتا ہے۔ خدا توفیق خیر دے ✤

چھٹا مسئلہ

سبع سماوات اور سبع ارضین کی حقیقت اور اُن کی ترتیب کے بیان میں

(تقریر سوال) ساتوں آسمان اور ساتوں زمینوں کی نسبت اکثر مسلمانوں کا یہ خیال ہے۔ کہ مراد ان سے سبعہ سیارات کے وہ افلاک ہیں۔ جنہیں حکمائے یونان نے ثابت کیا ہے۔ اور اُن کی رائے یہ ہے۔ کہ یہ افلاک اجسام شفاف کروی ہیں۔ اور ایک دوسرے سے اس طرح ملے ہوئے ہیں۔ جیسے نہ بتہ پیاز کے چھلکے۔ اسی طرح کے اور اوصاف بھی ان افلاک کے بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ جدید زمانہ کے محققین حکماء نے جو بعد ایک ہزار سنہ ہجری کے ہوئے ہیں۔ وہ ان تمام خیالات کو جہل مرکب بتاتے ہیں۔ اور جو تحقیقاتیں بالفعل ہوئی

ہیں۔ اُن سے وہ پردۂ جہالت جو عقلوں پر قدیم فلاسفروں کے خیالات کی وجہ سے مرتفع ہوگیا ہے۔ ان تحقیقات کی رُو سے جو کچھ ان لوگوں نے سیارات و ثوابت کے کئے ہیں۔ اُن سے کہیں ویسے افلاک کا اثر وجود بھی نہیں پایا جاتا۔ بلکہ ان لوگوں نے قدیم تحقیقات کے بالکل مخالف باتیں پائی ہیں۔ جنہیں اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔ اور وہ آئندہ بیان بھی ہونگی پس جب کہ ان اجرام عظیمہ (یونانی آسمانوں) کا وجود ہی نہ پایا گیا۔ اور قدیم علم ہیئت کی بنیاد ہی اُکھڑ گئی۔ تو اُن سماوات و ارضین کا وجود کس مقام پر ہوگا۔ جنہیں بانی اسلام نے بیشمار اقوال میں اپنے بیان کیا ہے (سلام اللہ علیہ)۔

جواب

جو لوگ کہ مسلمانوں کی کتابوں کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ اُن پر ہرگز یہ بات مخفی نہیں ہے۔ کہ اگرچہ ان کے نزدیک عدد سماوات میں سب کا اتفاق ہے۔ کہ وہ سات ہیں۔ لیکن بیان حقیقت افلاک میں اور قدیم فلاسفروں کے افلاک پر ان افلاک کی تطبیق میں مختلف الرائے ہیں۔ مطلب یہ کہ اگرچہ عام طور پر مسلمانوں نے سات آسمانوں کا وجود تسلیم کیا ہے۔ لیکن ہر شخص کی ان کے بارے میں وہی رائے نہیں ہے۔ جو حکمائے یونان کی رائے تھی۔ کہ یہ افلاک موٹے موٹے تہ بتہ اجسام شفافہ متحرک بالارادہ ہیں)۔ چنانچہ بنی نوبخت (قدماء مذہب امامیہ اثنا عشریہ) کی یہ رائے ہے۔ کہ وہ سماوات سبعہ جن کا ذکر شریعت میں موجود ہے۔ وہ اُن کے افلاک سے اوپر ہیں۔ (جنہیں یونانی فلاسفہ مانتے تھے)۔ اور یہی رائے حافظ فاضل محمد کرا چکی کی ہے۔ جن کی وفات ۴۴۹ھ ہجری میں واقع ہوئی۔ البتہ یہ ضرور ہوا۔ کہ قرون متوسط نبویہ میں چونکہ بطلیموسی خیال مسلمانوں میں عام طور پر پھیل گئے تھے۔ اس وجہ سے عام مسلمانوں کا اس دور میں یہی خیال ہو گیا تھا۔ کہ سماوات سبعہ سے مراد یہی افلاک عظیمہ سیارات سبعہ ہیں۔ بلکہ اکثر مسلمان فلسفیوں کا یہ خیال ہوگیا تھا۔ کہ "کرسی" سے مراد فلک ثوابت (آٹھواں آسمان) ہے۔ اور "عرش" سے مراد فلک الافلاک ہے۔ (یعنی نواں آسمان ہے۔ جس کی حرکت دوریہ چوبیس گھنٹے کی بتاتے ہیں) جیسا کہ ہیئت قدیمہ نے بیان کیا ہے۔

باقی رہی حقیقت سماوات سبعہ کی۔ (کہ وہ در اصل کیا چیز ہیں۔ اُن کی ماہیت کیا ہے) سو وہ ہمیشہ علمائے اسلام کے نزدیک نامعلوم ہی رہی۔ (اور کسی نے واقعی فیصلہ

نہ دیا تھا کہ ان کی ماہیت کیا ہے ۔ کیونکہ جو مضامین اور اقوال شارع اسلام علیہ السلام اور ان کے اوصیائے کرام کے بتواتر و یا باحاد اس وقت تک منقول ہوئے ہیں ۔ وہ حکمائے قدیم کے اقوال پر کسی طرح منطبق نہیں ہوتے ۔ نہ بلحاظ ماہیت ۔ اور نہ بلحاظ اوصاف ۔ بلکہ مخالفت و تنافی دونوں بیانوں میں بہت اچھی طرح ظاہر ہے ۔ اس وجہ سے کہ اسلامی شریعت کا بیان یہ ہے ۔ کہ "سما" (جیسے فلک کہئے یا آسمان) پھٹ بھی سکتا ہے ۔ لپٹ بھی سکتا ہے ۔ اور چاند سورج بھی گر سکتے ہیں ۔ شق بھی ہو سکتے ہیں ۔ اور یہ کہ "سماء" بخار یا دھوئیں سے پیدا ہوا ہے ۔ اور یہ کہ اُن میں رستے ہیں ۔ دروازے ہیں ۔ مخلوقات ہیں ۔ چوپائے ہیں ۔ اور یہ کہ حادث ہیں ۔ ازلی نہیں ہیں ۔ زائل ہونے والے ہیں ۔ ابد الآباد تک رہنے والے نہیں ہیں ۔ اور یہ کہ جنت مع اپنے تمام لذات و اشجار و اثمار و انہار و حور و قصور کے بالفعل ان سماوات کے درمیان موجود ہے ۔ وغیرہ وغیرہ امور ۔ جو بالکل ہیئت بطلیموسی کے مخالف ہے ۔ (پھر کوئی کیونکر کہہ سکتا ہے ۔ کہ اسلامی شریعت فلسفہ قدیم کے اقوال کی پیرو یا اُس کے مطابق باتیں بیان کرتی ہے) ۔ اسی مخالفت و تنافی کی وجہ سے ہمارے علماء سابقین نے اکثر ظاہر اقوال شریعت میں تاویلیں کی ہیں ۔ اور اپنے خیال کے مطابق ان اقوال کی تطبیق فلسفہ قدیمہ پر کرنی چاہی ہے ۔ کیونکہ ان علماء کے دماغوں میں وہی پُرانا فلسفہ بسا ہوا تھا ۔ اور اُسی سے مستانس تھے ۔ اور یہ نہ جانتے تھے ۔ کہ کسی روز اُس کی کمزوری اور غلطی ظاہر ہوگی نیز اس سے بھی کسی قدر بے پروائی کر گئے کہ ہمارے نبی عربی صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم اور اُن کے اوصیاء علیہم السلام برابر لوگوں کو فلسفیوں کے اقوال کی متابعت سے منع فرماتے اور ڈراتے رہتے تھے ۔ (کاش اگر اسی نکتہ پر یہ حضرات علماء نظر فرماتے ۔ تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ ہمارے ہادیان برحق نے امور حکمیہ فلسفیہ کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے ۔ وہ ہرگز اُن کے اقوال کی متابعت میں نہیں فرمایا ہے ۔ اور نہ وہ مطابق الواقع اُن کے موافق ہیں) ۔ پس اگر دراصل قدیم حکماء کی رائیں شریعت کے اقوال کے مطابق تھیں ۔ تو اس ممانعت اور تخویف و تحذیر کی کیا وجہ تھی ۔ بہرحال چونکہ ہمارے ہادیان برحق ہمیشہ ہم کو متابعت فلاسفہ و منجمین سے منع فرماتے رہے ہیں ۔ اس وجہ سے ہم کو یقین کامل حاصل ہوتا ہے ۔ کہ ہرگز ان کے اقوال اُن کے اقوال کے موافق نہ تھے ۔ ورنہ کوئی وجہ ممانعت کی نہیں ہو سکتی +

اور چونکہ حقیقت "سماوات" اور اُس کی ترتیب کا بیان مطابق لسان شریعت کے

اس کتاب کے نہایت ضروری مسائل میں سے اور بنظر زمانہ حال کے زیادہ نافع اور بلحاظ عصر جدید کی اسلامیت کے بہت دشوار مسئلہ تھا۔ اس وجہ سے میں نے پوری کوشش اس کی تحقیق و تدقیق میں صرف کی ہے۔ اور امداد الٰہی پر بھروسہ کر کے اس خاص مسئلہ کو ترتیب سماوات سے الگ کر کے لکھا ہے۔ تاکہ واضح طور پر معلوم ہو جائے کہ ہماری اسلامی شریعت میں "سماوات" کی حقیقت کیا بیان کی گئی ہے۔ اور یہ کہ لفظ "سماء" ہماری شریعت میں کس معنی سے مستعمل ہوا ہے۔ جسے ہم نہ جانتے تھے +

اب میں کہتا ہوں کہ اس میں بالکل شبہ نہیں کہ عرف اور لغت دونوں ہی "سماء" بلند چیز کو کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ لفظ "سمو" سے مشتق ہے۔ جس کے معنی "علو" (بلندی) ہے۔ "فاضل قزوینی" نے کہا ہے۔ کل مافوق الارض فھو سماء "زمین سے جو چیز بلند ہو اُسے سماء کہتے ہیں"۔ وفی طریق اللغۃ یقولون ما علاک فھو سماء "اور لغت میں ہر اس شے کو جو تم سے اوپر ہو سماء کہینگے"۔ علامہ طبرسی نے تفسیر مجمع البیان میں فرمایا ہے۔ کل ما علاک واظلک فھو سماء وکل ما استقر علیہ قدمک فھو ارض "جو چیز تم سے بلند اور تمہارے سر پر سایہ افگن ہو۔ وہ سماء ہے۔ اور جس پر تمہارے پاؤں ٹکیں۔ وہ ارض (زمین) ہے"۔ غرض یہ ایک ایسی بات ہے جس میں کسی کو شبہ نہیں ہے۔ کیونکہ عرف و لغت دونوں ہی اس موقع پر متفق ہیں۔ اسی وجہ سے مینہ۔ ابر۔ فلک۔ فضاء بلند۔ اجرام کواکب وغیرہ کو سماء کہا گیا ہے۔ اور یہ سارے استعمال حقیقی ہیں۔ ان میں کوئی مجازی نہیں ہے۔ اس وجہ سے کہ شے بلند کے تحت میں یہ سب مذکورہ بالا چیزیں داخل ہیں۔ لہٰذا لفظ "سماء" ایک کلی ہوا۔ اور یہ اشیاء مذکورہ اُس کے افراد ٹھیرے۔ اور ظاہر ہے۔ کہ کلی کا اطلاق اُس کے افراد پر اطلاق حقیقی ہوتا ہے نہ مجازی +

اور یہ بھی معلوم ہے۔ کہ شارع اسلام (جناب محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اُن کے خلفاء نے اس لفظ کے استعمال میں کوئی خاص اصطلاح جدید نہیں اختراع فرمائی ہے۔ بلکہ اُسی معنی میں اسے بولتے ہیں۔ جسے اُس وقت کے اہل عرف و زبان سمجھ سکتے تھے۔ لہٰذا جب کبھی لفظ "سماء" کا ان کی زبان سے نکلا ہے۔ اُس سے مراد ان کی وہ شے تھی۔ جو بلندی پر واقع ہے۔ (خواہ ابر ہو۔ یا کواکب ہوں۔ یا مدارات کواکب ہوں۔ وغیرہ وغیرہ) +

مگر بعد تحقیقات و تلاش معلوم ہوتا ہے۔ کہ شریعت میں اس لفظ کا استعمال تین معنوں

میں سے کسی ایک معنی میں آیا ہے۔ جس میں معنی "علو" ضرور ملحوظ ہیں +

(ایک) محض فضائے بلند اور فضائے خالی (جو ہماری زمین سے اوپر اٹھکر سے بھری ہوئی ہے)۔ جیسے خدائے تعالے نے ارشاد فرمایا ہے۔ (وجعل فی السماء بروجاً) "اللہ نے بلندی پر برجوں کو بنایا ہے" +

(دوسرے) خود کرات بلند اور اراضی سیارہ کو سما کہا ہے۔ جیسا کہ اس حدیث میں ہے۔ ان فی السماء آدم کآدمکم ونوح کنوحکم۔ (اوپر کے کروں میں ویسے ہی آدم و نوح ہیں۔ جیسے تمہارے کرۂ زمین پر آدم و نوح گذرے ہیں) وغیرہ حدیثیں جو آئندہ مذکور ہونگی +

(تیسرے) وہ جسم عظیم کروی جو ہماری اس زمین اور باقی زمینوں کو محیط ہے۔ بیشتر اسی معنی سے شریعت میں لفظ سماء کا اطلاق ہوا ہے۔ خصوصاً جبکہ سبع ارضین کے ساتھ یہ لفظ آیا ہے +

اسی جسم عظیم کے سمجھنے میں علماء کو اضطراب و اختلاف پیدا ہوا ہے۔ کوئی سمجھا ہے کہ یہ جسم بھی عنصری ہے۔ کوئی اس کو جسم فلکی کہ گیا ہے۔ کوئی جسم مادی بتاتا ہے۔ اور کوئی جوہر قدسی مجرد عن المادہ۔ کسی نے عرض کہا ہے۔ اور کسی نے جوہر مثلاً جو شخص یہ سمجھا ہے کہ سماء سے مراد محض بلندی ہے۔ وہ اس کو عرض کہتا ہے نہ جوہر +

رہی تحقیق حق کہ ان اقوال میں کون سا قول فی الواقع صحیح ماننے جانے کے قابل ہے۔ (اپنے ظن و ادراک کے موافق۔ ورنہ واقع حقیقی کا علم خدا کو ہے۔ ہماری بحث اس وقت صرف اس سے ہے۔ جو بظاہر الفاظ شریعت بتاتے ہیں۔ اور جس کی مساعدت عُرف و لغت کرتے ہیں۔ نہ نفس الامر سے) اس مطلب کے سمجھنے کے واسطے ایک مقدمہ کے بیان کی ضرورت ہے۔ جو تسلیم شدہ ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ ہر شخص کا اس امر پر اتفاق ہے کہ زمین کو چاروں طرف سے ہوا محیط ہے۔ اور یہ بھی مانی ہوئی بات ہے۔ کہ جو حرارت آفتاب سے ہماری زمین کی طرف آتی ہے۔ وہ شعاعوں کے ساتھ سطح زمین سے منعکس ہو کر ہر طرف کو پھیلتی ہے۔ اور جس قدر اوپر کو یہ حرارت بذریعہ شعاع منعکس بلند ہوتی جاتی ہے اُسی قدر ضعیف ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بہت اوپر جا کر بالکل فنا ہو جاتی ہے۔ (چنانچہ کرہ زمہریر میں حرارت نہیں ہے۔ یا بہت کم ہے) +

ہاں اس امر میں ضرور اختلاف ہے کہ یہ حرارت کہاں تک اوپر جاتی ہے۔ قدماء نے

تو تینتالیس میل بتایا ہے۔ اور متاخرین نے اس سے کم۔ لیکن ان میں بھی اختلاف ہے۔
اور جہاں سے یہ حرارت ختم ہونے لگتی ہے۔ وہیں بخارات اور دھوئیں جو زمین سے بلند
ہوئے ہیں منجمد ہوتے (اور ابر بنتے) ہیں۔ نیز جو رطوبتیں بذریعہ ہوا وہاں تک جاتی ہیں وہ
جم جاتی ہیں۔ اس دعوے پر ان لوگوں کے پاس بہت سی دلیلیں ہیں۔ اسی وجہ سے اُس
ہوا کے کئی درجے معین کئے ہیں۔ جو زمین کو محیط ہے۔ مثلاً ایک طبقہ نسیم ہے۔ جو زمین
سے متصل ہے۔ اس طبقہ کی ہوا زمین سے متصل ہے۔ جس کی ہوا برابر چاروں طرف چلتی
رہتی ہے۔ یہ آخری طبقہ ہے۔ اور انسانی زندگی کے لئے مناسب۔ اس کا بالائی حصّہ
بنا بر کتاب (عجائب المخلوقات) سولہ ہزار ذراع زمین سے بلند ہے۔ بعضوں نے اس سے
زیادہ بھی لکھا ہے۔ یا مثلاً طبقہ زمہریریہ جس کی ہوا ساکن ہے۔ اور رطوبات منجمدہ و بخارات
کثیفہ سے بھری ہوئی ہے۔ اسی طبقہ کے ابتدائی حصّہ میں ابر پیدا ہوتے اور بجلیاں چمکتی
ہیں۔ اس طبقہ میں انسان کی زندگی نہیں ہوسکتی۔ بلکہ جو کوئی اس حد تک پہنچ جاتا ہے۔
تو اُس کو کپکپی شروع ہو جاتی ہے۔ نکسیر جاری ہو جاتی ہے۔ ضعف ہو جاتا ہے۔ اور
کان۔ آنکھ اور دیگر منافذ سے خون بہنے لگتا ہے +

یہاں تک تو اس معاملہ میں حکمائے متاخرین نے متقدمین حکماء سے موافقت کی
ہے۔ مگر چند امور میں مخالفت کی ہے۔ (منجملہ اُن کے یہ ہے۔ کہ متاخرین نے کرۂ نار کو
نہیں تسلیم کیا ہے۔ حالانکہ قدماء کا خیال ہے۔ کہ یہ کرّہ ہوائی کرۂ کو محیط ہے۔ (دوسرا)
یہ کہ متاخرین نے ہوا و بخار کا وزن ثابت کیا ہے۔ بخلاف قدماء کے۔ (تیسرے) یہ کہ کرۂ
ہوائی اور بخاری اُس فضاء میں جو اجزائے ارضیہ سے خالی اور جوہر اثیریہ (ایتھر) سے
بھری ہوئی ہے متحرک مانا ہے۔ جیسا کہ آسمانی دریاؤں کے ذکر میں بیان ہوا +

متاخرین نے اُس ہوا کے تحرک میں جو ہماری زمین سے ملی ہوئی ہے اختلاف کیا ہے۔
(فلامریون) فرانسیسی کا قول ہے کہ وہ جسم جو زمین کو محیط ہے۔ اُس کی ضخامت تقریباً ایک لاکھ
میٹر ہے۔ اور اُس نے اس کا نام (اٹمسفر) رکھا ہے۔ جس کی اصل (اٹامس اسفر) ہے۔ جو
یونانی کلمہ ہے۔ اور معنی اس کے بخارہ ور کے ہیں +

اس زمانے کے فلاسفروں کا خیال ہے۔ کہ اٹمسفر کی بلندی پندرہ فرسخ سے کم نہیں
ہے۔ اگرچہ اس امر میں اختلاف کیا ہے۔ کہ اس سے اوپر کیا ہے۔ اور بنیاد ان کے ہاں

حساب کی یہ ہے۔ کہ صبح اور شام کیفیت نور کی رفتار کیا ہے۔ اور کتنی دیر میں نور آفتاب کرۂ ہوا سے نفوذ کر کے زمین تک پہنچتا ہے اسی بنا پر فاضل شندوی نے کتاب عروس بدیعہ میں لکھا ہے۔ کہ "وہ کرہ جو ہماری زمین کو محیط ہے۔ اس طرح ہے۔ جیسے غلاف یا جلد کسی جسم کو محیط ہوتی ہے۔ اور بلندی اُس کی اُس حد سے ہے۔ جہاں تک انکسار نور کی حد ہے۔ اور وہ تقریباً پینتالیس میل زمین سے بلند ہے۔ اسی کے ذریعے سے شفق کی شناخت ہوتی ہے۔ اور شاید اس کا امتداد ایک سو یا دو سو میل تک زمین سے اوپر ہو"۔

اس خیال سے تصحیح اُس رائے کی بھی ہوتی ہے۔ جس میں کہا گیا ہے۔ کہ کرۂ محیطیہ بالارض کی زمین سے بلندی تیس فرسخ ہے۔ (جس کے نوّے میل ہوتے ہیں)۔ کتاب آیات بینات میں مذکور ہے۔ کہ "شہاب ثاقب اور وہ شفق جو جانب قطب شمالی میں نمایاں ہوتے ہیں۔ اس کرۂ محیط زمین میں ستر میل سے تین سو میل تک بلندی میں واقع ہیں اور بعض کا خیال ہے۔ کہ اس کرۂ محیط کی بلندی پانچ سو میل ہے"۔ سر اسحاق نیوٹن سے منقول ہے۔ کہ "اس کی پچاس فرسخ بلندی کا قائل تھا"۔ مؤلف (حدائق النجوم) نے بہت سی قوی دلیلیں اس امر پر بیان کی ہیں۔ کہ "کرۂ بخاریہ ارضیہ کی بلندی زمین سے ایک سو میل ہے"۔ غایۃ الامر یہ ہے۔ کہ کہ لیا جائے۔ کہ بعض طبقے اس کے کثیف ہیں۔ اور بعض لطیف۔ اور کرۂ اثیری تک پہنچ کر بہت ہی زیادہ لطیف ہو گئے ہیں۔

باقی فجر اور شفق۔ (وہ روشنی جو طلوع آفتاب سے قبل اور غروب آفتاب کے بعد اٹھارہ درجے آفتاب کے افق سے نیچے چلے جانے کے بعد مغرب و مشرق میں نمایاں ہوتی ہے) چونکہ ان کا وجود کثافت ہوا سے ہوتا ہے۔ تو لامحالہ ان کا ظہور پینتالیس میل زمین سے اُوپر شروع ہوتا ہوگا۔ مگر یہ کوئی دلیل اس امر پر نہیں ہے۔ کہ کرۂ بخاریہ اتنی ہی بلندی تک ہے۔ بلکہ اس سے صرف اس قدر ثابت ہو سکیگا۔ کہ کرۂ بخاریہ کا کثیف حصہ صرف پینتالیس میل بلند ہے۔ اور اس سے یہ نہیں معلوم ہو سکتا۔ کہ بخار لطیف اور ہوائے لطیف بھی اس سے اُوپر نہیں ہے۔ خصوصاً جب ہم بعض ایسی سچی علامتیں بھی مشاہدہ کرتے ہیں۔ جو اس امر پر ناطق ہیں۔ کہ ہوا و بخار کا وجود سو میل زمین سے اُوپر تک ہے۔ یہاں تک کہ وہ اثیر (ایتھر) سے مل جاتا ہے"۔ حکیم فانیک نے کتاب النقش فی الجو کے تیسرے حصہ میں بیان کیا ہے۔ کہ "ہماری زندگی ایک ایسے

گھرے سیال سمندر میں بسر ہو رہی ہے۔ جس کی گہرائی بحر اوقیانوس کی سوگنی گہرائی سے کم نہیں ہے۔ جو کرۂ زمین کو محیط ہے!! آگے خدا کو علم ہے۔ کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ مگر اس بیان کا محصل یہ ہے۔ کہ ہماری اس زمین سے محیط ایک کرۂ بخار ہے۔ جو موجب غذا ذہی حیوانات زمین ہے۔ اور اجزائے کہربائی سے بھرا ہوا ہے۔ کبھی اس کرۂ محیط کو زمہریر کبھی جلد کبھی المسفر۔ کبھی کرہ ثلج (برف) وغیرہ الفاظ سے بھی تعبیر کر لیتے ہیں۔ اور کسی طرح ہند ۵ فرسخ (پینتالیس میل) سے اس کی بلندی کم نہیں ہے۔ اگرچہ اُس سے زیادہ کے بھی لوگ قائل ہیں۔ اور یہ کرۂ بخاریہ مع کرۂ ہوا کے ہماری اس زمین کے ساتھ تمامی حرکات ارضیہ میں حرکت کرتا رہتا ہے۔ خواہ وضعی حرکت ہو۔ یا انتقالی۔ اور جب یہ **مقدمہ سمجھ میں آگیا۔ تو میں کہتا ہوں** کہ اس وقت میرے ذہن میں ایک عجیب بات آئی ہے۔ جو بظاہر تو تعجب خیز معلوم ہوتی ہے۔ مگر اُس کے شواہد پر غور کرنے سے اچھی نظر آتی ہے۔ اُس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ لفظ "سماء" کا اطلاق جب کہ ہر موجود علوی پر ہوتا ہے۔ یعنی جو شے اپنے سے اُوپر ہووے سماء ہے۔ تو ممکن ہے۔ کہ ہماری زمین کا آسمان (جسے ہم لوگ سماء گنتے اور سمجھتے ہیں) یہی کرہ بخاریہ ہو۔ جو اس زمین کی ہوا کو محیط ہے۔ (یعنی ممکن ہے۔ کہ زبان شریعت میں جو سماء فرمایا گیا ہے۔ اُس سے مراد کرہ بخار ہو۔ جو کرۂ ہوا سے اُوپر اور اُس سے محیط ہے)۔ علیٰ ہٰذا القیاس دیگر زمینوں کے آسمانوں سے مراد بھی وہی کرۂ بخاریہ ہو جو اُس کی ہوا کو محیط ہے۔ اس امر کے تسلیم کرنے میں نہ کوئی عقلی خرابی لازم آتی ہے۔ اور نہ شرعی نہ لغوی اور نہ عرفی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے۔ کہ اگر غور کیا جائے۔ تو اس کے لئے بہت سے شواہد عدا آیات قرآنیہ اور روایات ائمۂ طاہرین ع سے ملینگی۔ جیسا کہ ہم آئندہ بیان کرینگے۔ اور عنقریب ہم یہ بھی واضح کرینگے۔ کہ ہر زمین سبعہ سیارہ کے واسطے ایک کرۂ ہوائیہ ہے۔ جو اُسے محیط ہے۔ اور نیز ایک کرۂ بخاریہ ہے +

اب میں اُن اقوال شرعیہ کو بیان کرتا ہوں۔ جو اس امر کی شہادت دیتے ہیں۔ کہ لفظ "سماء" سے مراد شرع میں یہی کرۂ بخاریہ ہے۔ جو ہر زمین کو محیط ہے۔ تقریباً دس قسم کے قول اس بارہ میں دستیاب ملے ہیں +

(**پہلی قسم**) کی وہ احادیث ہیں۔ جو بیان کرتی ہیں۔ کہ آسمان کی خلقت بخارات سے ہوئی ہے۔ (پس کرۂ بخاریہ ہی کو سماء کہنا کیا بعید ہے۔ اور کونسا عقلی مانع

موجود ہے) اور از بسکہ ہمارے علمائے سابقین ان احادیث کی شرح میں حقیقت کی تہ تک نہ پہنچ سکے۔ تو ایسی تاویلات رکیکہ کر گئے ہیں۔ جن کا ضعف وسقم عند التامل معلوم ہوتا ہے +

اس قسم کے اخبار جو مجھے ملے ہیں۔ اُن میں سے (ایک) وہ ہے۔ جو کتاب بحار و کتاب انوار النعمانیہ۔ عیون الاخبار۔ علل الشرائع۔ خصال۔ تفسیر برہان۔ تفسیر نور الثقلین اور تفسیر صافی وغیرہ میں جناب امیر المومنین علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے۔ کہ ایک مرد شامی نے آپ سے دریافت کیا۔ کہ "پہلی وہ شئے جسے خدائے تعالےٰ نے خلق فرمایا ہے۔ وہ کیا ہے؟" آپ نے فرمایا "خلق النور" پہلے خدائے تعالےٰ نے نور کو پیدا کیا" سائل نے پوچھا۔ "تو آسمان کس چیز سے پیدا ہوئے؟" آپ نے فرمایا "من بخار الماء" پانی کے بخارات سے" (دوسری) وہ ہے۔ جو تفسیر حافظ قمی۔ بحار۔ کتاب الانوار وغیرہ میں ایک طولانی حدیث کے ذیل میں منقول ہے۔ معصوم نے فرمایا "فثار من الماء بخار کالدخان فخلق منہ السماوات" پس پانی سے بخار مثل دھوئیں کے اُٹھا اُس سے پروردگار عالم نے سماوات کو پیدا کیا" (تیسری) وہ ہے۔ جو کتاب بحار اور دُرّ منثور میں ابن عباس سے مروی ہے۔ "ان اللہ اجری النار علی الماء فبخر البحر فصعد فی الھواء فجعل السماوات منہ" خدائے تعالےٰ نے آگ کو پانی پر جاری کیا۔ (یعنی پانی میں حرارت پیدا کی۔ خواہ بذریعہ حرکت ہو۔ یا اور کسی ترکیب سے)۔ اُس سے دریا میں بخارات پیدا ہوئے۔ اور وہ ہوا میں بلند ہوئے۔ اُن سے خدائے تعالےٰ نے "سماوات" کو پیدا کیا" (چوتھی) وہ حدیث ہے جو شرح کیدری میں مذکور ہے۔ جو کتاب نہج البلاغہ کی شرح ہے۔ لکھتے ہیں۔ کہ روایت میں وارد ہے۔ کہ "ان اللہ تعالےٰ لما اراد خلق السماء والارض خلق جوھرا اخضر ثم ذوبہ فصار ماء مضطربا ثم اخرج منہ بخارا کالدخان فخلق منہ السماء" خدائے تعالےٰ نے جب ارادہ کیا۔ کہ سماء و ارض کو پیدا کرے۔ تو اُس نے ایک جوہر سبز خلق فرمایا۔ پھر اُسے پگھلا دیا۔ کہ وہ موج زن پانی ہو گیا۔ پھر اُس سے بخارات اُٹھائے۔ جو دھوئیں کی طرح سے تھے۔ اُس سے سماء کو پیدا کیا" کما قال ثم استوی الی السماء وھی دخان الخ جیسا کہ پروردگار عالم خود فرماتا ہے کہ "وہ سماء پر غالب ہوا۔ درحالیکہ وہ دھواں تھا" (پانچویں) وہ حدیث ہے جو

بحارالانوار اور نیز درمنثور میں ابن عباسؓ سے مروی ہے۔ فرمایا کہ کان عرشہ علی الماء فارتفع بخار الماء ففتقت منہ السماوات "خدا کا عرش پانی پر تھا۔ پھر پانی سے بخار اٹھا۔ تو اس سے سماوات پیدا کئے گئے۔" (چھٹی) وہ حدیث ہے۔ جو نیز کتاب بحارالانوار اور تفسیر فرات میں جناب امیرالمومنین علیہ السلام سے مروی ہے۔ حدیث طولانی ہے منجملہ اس کے فقرات کے یہ بھی ہے۔ ان اللہ بدالہ ان یخلق الخلق فضرب با مواج البحور فثار منہا مثل الدخان کاعظم ما یکون من خلق اللہ فبنا بھا سماء رتقاً "جب پروردگار عالم کی مشیت میں گزرا۔ کہ مخلوقات کو پیدا کرے۔ تو سمندروں کی موجوں کو تلاطم کیا۔ جس سے بہت ہی عظیم الشان سے عظیم الشان دھوئیں کی مانند ایک چیز بلند ہوئی۔ اسی سے سماء محکم و متقن کو پیدا کیا ہے۔" یہاں تک کہ آپ نے فرمایا۔ کہ ثم استویٰ الی السماء وھی دخان میں دخان سے مراد وہی شے ہے۔ جو سمندروں کے پانی سے بلند ہوئی تھی۔ میری نظر میں اور نیز اور لوگوں کی نظر میں بھی آیت مذکورہ میں دخان سے مراد وہی بخار ہے جو مشابہ دھوئیں کے دریاؤں سے بلند ہوا تھا۔ کیونکہ پانی سے دھواں نہیں اٹھتا۔ بلکہ بخارات اٹھتے ہیں۔ جو اپنی غلظت میں دھوئیں سے مشابہ ہوتے ہیں +

(**دوسری قسم**) اُن اقوال شرعیہ کی ہے۔ جو اس امر کو بیان کرتے ہیں۔ کہ خلقت "سماوات" کی "دخان" (دھوئیں) سے ہوئی ہے۔ (اول) وہ ہے۔ کہ جس کا استنباط قرآن مجید سے ہوتا ہے۔ سورۂ سجدہ میں خدائے تعالےٰ فرماتا ہے۔ ثم استویٰ الی السماء وھی دخان۔ خصوصاً اس امر پر نظر کرکے کہ جملہ "وھی دخان" جملہ مستانفہ ہے زیادہ اس خیال کو قوت ہوتی ہے۔ کہ مراد اس سے یہی ہے۔ کہ سماوات کی خلقت دخان سے ہوئی۔ (جس سے مراد بخارات ہیں۔ اور بعلاقہ مشابہت بخار کو دخان سے تعبیر کردیا ہے)۔ ہم آئندہ بھی بیان کرینگے۔ کہ دخان سے مراد بخار ہی ہے + (دوم) وہ حدیث ہے۔ جو کافی وافی اور بحار وغیرہ کتب احادیث میں منقول ہے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے خبر خلقت سماء میں فرمایا ہے۔ کان کل شئی ماء وکان عرشہ علی الماء فامر اللہ الماء فاضطرم ناراً ثم امر النار فخمدت فارتفع من خمودھا دخان فخلق اللہ السماوات من ذلک الدخان وخلق الارض من الرماد "پہلے تمام پانی ہی پانی تھا۔ اور خدا کا عرش پانی ہی پر تھا پس پروردگار عالم نے حکم دیا پانی کو۔ کہ اس میں سے آگ

پیدا ہو۔ پھر آگ کو حکم دیا کہ بجھ جائے۔ جب وہ بجھ گئی۔ اور اُس سے دخان بلند ہوا۔ تو خدائے تعالےٰ نے سماوات کو اُس دخان سے پیدا کیا۔ اور زمین کو رماد (اُس کی راکھ) سے پیدا کیا +

(سوم) وہ خبر ہے۔ جو تفسیر قمی وغیرہ میں نقل ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ خدائے تعالےٰ نے دخان کو حکم دیا کہ تو بستہ ہو جا۔ وہ بستہ ہو گیا (اور آسمان بن گیا) + (چہارم) کتاب کافی۔ وافی اور بحار میں امام محمد باقر علیہ السلام سے خلقت سماوات وارض کے بیان میں مذکور ہے۔ فرمایا کہ "پانی سے اس قدر دخان بلند ہوا جس قدر خدا نے چاہا۔ پھر اُس دخان سے سماء صاف کو خلق فرمایا" یہاں تک کہ آپ نے ارشاد کیا "پھر اُسے پیٹا (یعنی مدور کیا)۔ اور زمین سے جانب فوق میں اُسے جگہ دی" + (پنجم) تفسیر ثعلبی وغیرہ میں ہے کہ "خدائے تعالےٰ نے جب ارادہ کیا کہ سماوات سبع وارضین سبع کو پیدا کرے۔ تو ایک جوہر مثل سماوات سبع اور ارضین سبع کے پیدا کیا۔ پھر اُس کی طرف ہیبت سے نظر کی۔ جس کی وجہ سے وہ پانی پانی ہو گیا۔ پھر پانی کی طرف نظر فرمائی۔ تو اُس میں جوشش پیدا کیا۔ اور بلند ہوا۔ اور اُس سے کف اُٹھا۔ اور نیز دھواں۔ کف سے تو زمین کو پیدا کیا۔ اور دخان (دھوئیں) سے سماء" اور یہی مطلب ہے قول خدائے تعالےٰ ثم استوی الی السماء وھی دخان کا۔ (میں کہتا ہوں۔ کہ) شاید حضرتؑ کی مراد اس فقرہ سے کہ "ایک جوہر مثل سماوات سبع اور ارضین سبع کے پیدا کیا" یہ ہو۔ کہ وہ جوہر جو خلق فرمایا گیا تھا۔ اُس کا مادہ اصلیہ ایسا ہی تھا۔ جیسا ان سماوات وارضین کا ہے۔ یا یہ کہ حجم و مقدار اُس کی اس قدر تھی۔ جس سے اتنے بڑے سماوات وارضین پیدا ہو سکیں۔ بہر حال + (ششم) وہ روایت ہے۔ جسے ایک جماعت علماء نے روایت کیا ہے۔ کہ لما خلق الارض اثار منھا دخانا فذلک قولہ تعالےٰ ثم استوی الی السماء وھی دخان "جب پروردگار عالم نے زمین کو خلق فرمایا تو اُس سے دھواں اُٹھایا۔ اور یہی مراد ثم استوی الی السماء وھی دخان سے ہے" (مترجم عرض کرتا ہے۔ کہ یہ روایت مطلب مستدل علیہ کے بالکل مطابق نہیں ہے۔ اور بلا ضرورت اسے درج کیا گیا ہے) + (ہفتم) تفسیر قمی۔ کتاب الحج کافی۔ انوار نعمانیہ۔ بحار الانوار اور تفسیر عیاشی وغیرہ میں بالاسناد امام پنجم جناب محمد باقر علیہ السلام اور جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ جس کا ماحصل یہ ہے۔ کہ "اُس موج اور کف سے (جو سمندر سے اُٹھے تھے) دخان ساطع بغیر آگ کے بلند ہوا۔ اُس سے خدا نے

سماء کو پیدا کیا ✦ (ہشتم) بحار وغیرہ میں مروی ہے جس کا ایک فقرہ یہ بھی ہے۔ کہ نکالا پانی سے (خدائے تعالیٰ نے) دخان اور طین اور زبد کو (طین یعنی کیچڑ۔ زبد کف) دخان کو حکم دیا کہ وہ بلند ہو۔ جب بلند ہوا۔ تو اُس سے سماوات بنائے۔ اور طین (کیچڑ) سے زمین ✦ (نویں) بحار و درمنثور میں حبہ عرنی سے مروی ہے۔ کہ میں نے علیؑ ابن ابی طالبؑ کو ایک روز یہ قسم کھاتے ہوئے سُنا۔ والذی خلق السّماء من دخان وماء۔ قسم اُس کی جس نے سماء کو دخان و آب سے پیدا کیا ہے ✦ (دسویں) بحار عیون۔ علل اور خصال میں ایک شامی کے سوال کے جواب میں مذکور ہے۔ کہ امیر المومنینؑ نے فرمایا۔ واسم سماء الدنیا رفیعا وھی من دخان وماء "نیچے والے سماء کا نام رفیعا ہے۔ جس کی ساخت دھوئیں اور پانی سے ہے" ✦ (گیارھویں) تفسیر قمی وغیرہ میں ہمارے نبی خاتم المرسلین جناب محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث طویل کے ذیل میں مروی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ کہ "خدا نے ہواؤں کو پانی کی طرف بھیجا جس کی وجہ سے دخان (دھوآں) اُٹھا۔ اور کف سے اوپر بلند ہوا۔ دھوئیں سے تو خدائے تعالیٰ نے سماوات سبع کو پیدا کیا۔ اور کف سے ارضین سبع کو پھر زمین کو پانی پر پھیلایا" ✦ (بارھویں) بحار میں ابن عباسؓ سے اور نیز ابن ابی مسعود سے مروی ہے۔ (جو دونوں ہی اصحاب رسولؐ و ائمہؑ سے ہیں) کہ "خدائے تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا" اس کے بعد کہا۔ کہ اخرج من الماء دخانا فارتفع فوق الماء وما علیہ فسماہ سماء "پانی سے دھوآں اُٹھایا۔ اور جب وہ بلند اور اونچا ہوا۔ تو اُس کا نام سماء رکھا" ✦

بالجملہ ان تمام حدیثوں سے میرے ذہن میں یہ بات آتی ہے۔ کہ مراد اس دخان سے جس کے معنی دھوئیں کے ہیں "بخار" ہے۔ غایۃ الامر یہ ہے۔ کہ چونکہ بخارات اور دھوئیں کا منشا ایک ہی ہوتا ہے۔ یا یہ کہ ازبسکہ دونوں ایک دوسرے سے مشابہ ہوتے ہیں۔ ظاہر نظر اور عرف عام کے لحاظ سے۔ اس وجہ سے "بخار" پر لفظ "دخان" کا اطلاق کیا گیا ہے ✦

میرے اس خیال کی موید وہ عبارت ہے۔ جو مسعودی کی تاریخ مروج الذہب میں اور فاضل ابن میثم کی شرح نہج البلاغہ میں مذکور ہے۔ کہ مفسرین کا اتفاق ہے۔ کہ وہ

۱؎ دونوں کا منشا و مظہر ایک ہی ہونا شاید یہی بات ہے۔ کیونکہ دھوآں اجزائے ارضیہ و ہوا سے مرکب ہے۔ اور بخارات اجزائے مائیہ اور ہوا سے۔ کما لایخفی علی من لہ نظر فی الطبیعیات ✦ ۔ مترجم ✦

دخان جس سے خلقت سماوات کی ہوئی ہے۔ وہ پانی کے ابھرنے اور اُس کے بخار خیز ہونے سے بسبب تموج کے ہوئی ہے"۔ ابن ہشام رحمہ اللہ لکھتے ہیں۔ کہ دخان درحقیقت بخار ہی ہے۔ (تعجب ہے۔ مترجم) ۔ اور مشابہت حسبِ صورت میں موجود ہے۔ کیونکہ دخان اور بخار کی ایک ہی صورت ہوتی ہے۔ (اس میں تامل نہیں۔ مترجم) ۔ نیز میرے مؤید ابوالبقا کا قول ہے۔ جو اُس کے کلیات میں ہے۔ کہ کل دخان یسطع من ماء حار فھو بخار وکذلك من الندی۔ "ہر وہ دخان جو گرم پانی سے اُٹھے۔ اُس کا نام ہی بخار ہے۔ اسی طرح جو دخان کسی تر چیز سے بلند ہو"۔ نیز بعض روایات بحار و درمنثور میں ذیل تفسیر "ثم استوی الی السماء وھی دخان" میں لکھا ہے۔ فکان ذلك الدخان من تنفس الماء "یہ دخان پانی کے تنفس و تموج سے پیدا ہوا تھا"۔

نیز بعض روایات میں تصریح بھی موجود ہے۔ کہ اُس پانی سے بخار مثل دخان کے اُٹھا۔ جس سے "سماء" کی خلقت ہوئی۔ جیسا کہ دوسری۔ چوتھی اور چھٹی روایت میں قسم اول کے گذرا۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ازبسکہ وہ بخار غلیظ تھا۔ تو دھوئیں سے مشابہ ہوا۔ لہٰذا اُس پر دھوئیں کا اطلاق کیا گیا۔ نہ کہ دراصل وہ دخان تھا + نیز پانی سے دھوئیں کا اُٹھنا صاف بتا رہا ہے۔ کہ دراصل وہ دھواں بخار ہی تھا۔ اس وجہ سے کہ پانی سے بخار ہی اُٹھتا ہے نہ دھُواں +

خلاصہ یہ کہ ان اخبار پر نظر کرنے سے اس قدر معلوم ہُوا۔ کہ وہ سیارات سبعہ جو زمینوں کو محیط ہیں "بخار" سے مخلوق ہیں۔ نیز میں آئندہ اُن حکماء کے اقوال کو بھی نقل کرونگا۔ جنہوں نے کرہ ہائے سیارات کی زمینوں کے گرد بخارات کے کرے مشاہدہ کئے ہیں۔ لہٰذا ہمارا وہ خیال قوی معلوم ہوتا ہے۔ کہ سماوات سے مراد دراصل وہ کرۂ بخاریہ ہے۔ جو زمینوں کو محیط ہے۔ اور اقوال ظواہر شریعت بھی بظاہر اس کے مؤید ہیں +

(**تیسری قسم**) کی وہ حدیثیں ہیں۔ جو اس امر کو بتاتی ہیں۔ کہ "سماء" کی خلقت سمندر یا آب منجمد سے ہے۔ یا موج مکفوف یعنی بستہ سے ہے۔ مگر محصل تینوں لفظوں کا ایک ہی ہے۔ کہ آسمان کی خلقت پانی سے ہے۔ (ایک) وہ حدیث ہے۔ جو علل الشرائع۔ عیون الاخبار۔ خصال اور بحار وغیرہ میں باسند جناب امیرالمومنین علیہ السلام سے مروی ہے۔

کسی نے حضرت ؑ سے دریافت کیا۔ کہ نیچے والا سماء کس چیز سے بنا ہے۔ تو فرمایا "من موج مکفوف" بعض روایتوں میں ہے۔ کہ فرمایا "من بحر مکفوف" مگر مراد دونوں لفظوں سے ایک ہی ہے۔ یعنی آب بستہ ومنجمد ۔ (دوسری) نہج البلاغہ وغیرہ میں جناب امیر المومنین علیہ السلام سے ایک خطبہ کے ذیل میں مروی ہے۔ جس میں آپ نے آسمان کی خلقت موج دریا سے بتائی ہے۔ فرمایا ہے "ثم رفعہ فی ھوآء منفتق وجو منفھق فسوی منہ سبع سماوات جعل سفلاھن موجا مکفوفا وعلیاھن سقفا محفوظا وسمکا مرفوعا" یعنی خدائے تعالےٰ نے اُس پانی کو پہلے ایک فضائے وسیع اور جو کشادہ میں بلند کیا۔ پھر اُس سے سات آسمان بنائے۔ جن میں سے نیچے والے کو موج بستہ کی صورت میں بنایا۔ اور اوپر والے کو محفوظ چھت اور عمارت بلند" جس کا مطلب بظاہر یہ ہے۔ کہ ہر آسمان کے نیچے والے حصے کو موج بستہ کی صورت بنایا۔ تاکہ گر پڑنے سے بچے۔ اور اوپر والے کو سقف محفوظ کی صورت میں بنایا کہ وہاں تک دخان اور کثافات ارضیہ اور شیاطین نہ پہنچ سکیں ۔ (تیسری) بحار و رنشید میں ایک دعا کا فقرہ ہے۔ "وامرت الماء فجمد ثم الھوآء فجعلت منہ سبعا وسمیتہ السموات" "خدایا تو نے پانی کو حکم دیا۔ کہ وہ بستہ ہو جائے۔ تو اُس سے تو نے سات آسمان بنائے۔ اور اُن کے نام سماوات رکھے ۔ (چوتھے) سوالات عبد اللہ بن سلام کے ذیل میں ایک سوال ہے۔ کہ اُس نے جناب رسالت مآب صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا۔ کہ سماء دنیا کس چیز سے مخلوق ہے۔ تو آپ نے فرمایا "من موج مکفوف" اُس نے کہا "یہ موج مکفوف کس چیز سے مخلوق ہے"۔ تو فرمایا کہ "اے ابن سلام یہ موج مکفوف اُس ٹھیرے ہوئے پانی کا نام ہے۔ جس میں حرکت وتموج نہ ہو۔ اور در اصل وہ دخان تھا"۔ تو اُس نے کہا "آپ نے سچ فرمایا" اسی طرح اور بھی روایات ہیں جن میں تصریح اُس معنی کی کو گئی ہے۔ جسے ہم نے اختیار کیا ہے۔ یعنی موج مکفوف یا بحر مکفوف جس کے معنی ممنوع من السیلان کے ہیں۔ اور قسم اپنی جان کی کہ ظواہر اقوال شارع اسلام جو کچھ نظر آئینگے۔ وہ ہماری اُس ترتیب اور احتمال کے موافق نظر آئینگے۔ جسے ہم نے اس کتاب میں بیان کیا ہے۔ آئندہ خدا کو علم ہے۔ کہ حق کیا ہے ۔

(چوتھی قسم) کی وہ حدیثیں ہیں۔ جو اس امر کو بتاتی ہیں۔ کہ سماء پانی کا مخزن ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی سورۂ قمر میں ہے۔ "ففتحنا ابواب السماء بماء منھمر" یعنی "ہم نے سماء کے دروازوں کو برسنے والے پانی کے ساتھ کھول دیا" اور سورۂ فرقان میں ہے۔ "یوم تشقق

السّماء بالغمام و نزّل الملئکة تنزیلا ۔ یا یہ کہ نزّلنا من السّماء ماء وغیرہ آئیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ پانی کا معدن آسمان ہے ۔ یعنی کرۂ بخار ۔ تو اگرچہ یہ کرہ اُن رطوبات کا مجمع ہے ۔ جو بذریعہ بخارات اوپر کی جانب صعود کر گئے ہیں ۔ مگر یہ کہ اس میں کوئی منافات نہیں ہے ۔ کہ یہ سب رطوبات کسی ایک مقام پر مجتمع ہو کر ابر کی صورت پیدا کریں ۔ اور برس جائیں ۔ جس طرح کہ شبنم وغیرہ زمین پر گرتی ہے ۔ اس لحاظ سے ہماری شریعت اقدس کا یہ کلام کہ مینہ آسمان سے سحاب پر نازل ہوتا ہے ۔ اور سحاب اُس کو چھان کر نیچے گراتا ہے ۔ بالکل درست و مناسب ہوگا ۔ (باین معنی کہ سماء سے مراد یہی کرۂ بخاریہ ہے جس میں رطوبات مجتمع ہو کر ابر کی صورت پیدا کر لاتے ہیں ۔ پھر اُس ابر سے مینہ برستا ہے ۔ اب اگر غور کیجئیگا ۔ تو معلوم ہوگا ۔ کہ یہ آیتیں جو ابھی مذکور ہوئی ہیں ۔ ہمارے مختار کے بالکل مطابق اور دیگر اقوال ظاہرہ شریعت کے موافق و مناسب ہیں ۔ اور نیز اُس کے بھی مطابق ہیں جسے حکماء محققین یورپ نے تسلیم کر لیا ہے ۔ باقی ہے قدماء حکماء ۔ وہ چونکہ سماوات سبع کی نسبت یہ رائے رکھتے تھے ۔ کہ اجسام سیارہ ہیں ۔ اور افلاک کو عناصر سے منزہ و مبرا جانتے تھے ۔ تو لامحالہ اُن کو اس قسم کی آیتوں میں تاویل کرنی پڑتی تھی ۔ اور کہتے تھے ۔ کہ مراد ان آیتوں میں لفظ سماء سے جہت فوقانیہ ہے ۔ (بخلاف ہمارے اس مختار کے جس میں ہم نے آسمان سے مراد صرف کرۂ بخاریہ ہی لیا ہے ۔ تو ہم کو ضروری نہیں ۔ کہ سماء سے جہت فوقانی مراد لیں ۔ بلکہ ہم کہینگے ۔ کہ خدائے تعالےٰ نے لفظ سماء سے حقیقی آسمان مراد لیا ہے ۔ اور اُسی سے مینہ برسنے کو فرمایا ہے ۔ جس میں کوئی تکلف کرنے کی ضرورت نہیں ہے) +

چند اخبار اس قسم کے بھی ہیں ۔ جن سے تصریح اس امر کی معلوم ہوتی ہے ۔ کہ آسمان معدن آب ہے ۔ جیسے وہ روایت جو کتاب بحار و علل الشرائع وغیرہ میں مذکور ہے ۔ کہ ایک یہودی نے جناب امیر المومنین علیہ السّلام سے سوال کیا ۔ کہ سماء کو سماء کیوں کہتے ہیں ؟ آپ نے فرمایا ۔ اس وجہ سے کہ " یہ وسم ماء ہے یعنی معدن آب ہے " اس روایت کو جن جن لوگوں نے لکھا ہے ملخصاً " یعنی معدن آب ہے " کو جزو روایت ہی بیان کیا ہے ۔ جس سے معلوم ہوتا ہے ۔ کہ خود حضرتؑ ہی نے وسم الماء کی تفسیر معدن الماء سے فرمائی ہے +

نیز تفسیر آیۃ کانتا رتقا ففتقنا ھما میں روایت کی گئی ہے۔ کہ ان اللہ فتق الارض بالخضر والسماء بالمطر۔ خدائے تعالےٰ نے زمین سے سبزی پیدا کی۔ اور آسمان سے مینہ نازل کیا۔ علاوہ بریں دیگر ظواہر کلام شرع بھی اس امر کے مصرح ہیں۔ کہ مینہ آسمان ہی سے برستا ہے۔ اور کسی عالم یا حکیم نے اس بیان میں بحث نہیں کی ہے۔ اور نہ تردد سے کام لیا ہے۔ (تو اب کیا وجہ کہ خواہ مخواہ سماء سے جانب علو صرف مراد لی جائے کیوں نہ اس کرۂ بخاریہ کو جو جانب فوق میں ہے اور ہمارے کرۂ ارضیہ کو محیط ہے سماء کہا جائے جس سے ظواہر شرعیہ کی مخالفت نہ لازم آئے)۔ باقی رہی قدماء کی ترتیب (پہلا دوسرا تیسرا وغیرہ آسمان اور وہ بھی نہایت ثخن دار اور جسیم) تو اس کی بنا پر ضرور لفظ سماء میں تاویل کرنی پڑیگی۔ اور ہماری ترتیب پر بالکل اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ جو معنی شرعی اور عرفی لفظ سماء کے ہیں۔ اُسی پر ہم اس لفظ کو محمول کرتے ہیں۔ جو نفس الامر کے مطابق ہے۔ واللہ اعلم ؛

(**پانچویں قسم**) کی وہ متواتر حدیثیں ہیں۔ جو اس امر پر دلالت کرتی ہیں۔ کہ زمین کی خلقت آسمان سے پہلے ہوئی ہے۔ قطع نظر ان آیات کے جو اس مطلب کو صاف لفظوں میں ظاہر کر رہی ہیں۔ (جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ دراصل زمین ہی جسم ثقیل کردی ہے اور باقی جو کچھ اس سے اوپر ہے۔ اسی کے بخارات و دخان سے بنا ہے۔ اُسی کو سماء کہتے ہیں)۔ مگر چونکہ وہ حدیثیں بیشمار تھیں۔ اور اُن سب کا اس جگہ بیان کرنا ناممکن تھا۔ اس لئے ہم صرف بعض آیتوں کو یہاں بیان کرتے ہیں۔ باقی جسے تفصیل مقصود ہو۔ وہ احادیث کی کتابوں میں دیکھ لے۔ دیکھئے خدائے تعالےٰ فرماتا ہے (سورۂ بقر میں)۔ ھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا ثم استوی الی السماء فسوٰھن الخ۔ وہی ایسا خالق ہے۔ جس نے تمہارے واسطے زمین کی تمام چیزوں کو پیدا کیا۔ پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اُنہیں ترکیب دی"۔ سورۂ فصلت میں فرمایا ہے۔ قل ائنکم لتکفرون بالذی خلق الارض الی قولہ تعالےٰ ثم استوی الی السماء وھی دخان۔ "اے ہمارے رسول کہو۔ کہ کیا تم انکار کرتے ہو اُس معبود کا۔ جس نے زمین کو پیدا کیا"۔ آگے اس کے فرمایا۔ "پھر مستوی ہوا آسمان کی طرف درانحالیکہ وہ دخان تھا"۔ (استوی کے معنی غلبہ کے ہیں۔ یا یہ مراد ہو۔ کہ جب زمین کو بنا چکا۔ تو آسمان کی ترکیب و ترتیب کی طرف متوجہ ہوا) ان دونوں آیتوں میں لفظ ثم بالترتیب کے معنی مع تاخیر کے دیتا ہے۔ (یعنی پہلے زمین بنائی پھر آسمان۔ مگر کچھ دیر بعد)۔

اب چونکہ ظواہر آیات قرآنیہ اور نیز احادیث صاف اس امر کو بتاتے ہوئے ملے۔ کہ آسمان کی خلقت زمین کے بعد ہوئی ہے۔ تو اگلے محققین نے انواع و اقسام کی تاویلات کرنی شروع کیں۔ اور اپنے پہلے خیال کے موافق آیتوں اور حدیثوں کو ڈھالنا چاہا۔ کیونکہ ان آیات وغیرہ کا مطلب ان لوگوں کے خیالات اور مسلمات کے مخالف تھا۔ اس وجہ سے کہ ان لوگوں نے تسلیم کر لیا ہے۔ کہ آسمان کی خلقت زمین سے پہلے ہوئی ہے۔ اور یہ تقدم بھی تقدم ذاتی و شانی و دہری و زمانی وطبعی و مکانی ہے۔ یعنی ہر صورت سے آسمان ہی مقدم ہے۔ اور زمین کی خلقت موخر ہے (حالانکہ احادیث و آیات اس کے برخلاف بیان کرتی ہیں)۔ بخلاف اس کے کہ اگر ہم سماء کی تفسیر کرۂ بخاریہ سے کریں۔ جیسا کہ سابقاً ہم نے آیات و اخبار کے ذریعہ سے بیان کر دیا ہے۔ تو اس بنا پر بالکل اس بات کی ضرورت نہیں ہے۔ کہ آسمانوں کو مقدم مانا جائے۔ بلکہ مؤخر ہی ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ کرۂ بخار زمین کے گرداگرد ہے۔ اور اس کا وجود نہیں ہو سکتا۔ الّا یہ کہ زمین اور پانی سے بخارات اٹھیں اور اس سے یہ کرہ بنے۔ خواہ ان بخارات کا اٹھنا بذریعہ حرارت داخلیہ زمین کے ہو۔ یا بذریعہ اس حرارت کے ہو۔ جو زمین کی حرکات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ خصوصاً اس حرارت کی وجہ سے جو آفتاب کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس بنا پر کرہ بخاریہ کی خلقت ہر طرح سے کرہ زمین کی ساخت سے بعد ہوگی۔ اور یہی بات ظواہر اقوال شرع بھی بتا رہے ہیں۔ (پھر کیوں نہ مانا جائے۔ کہ آسمان صرف اس کرہ بخار کا نام ہے)۔

(چھٹی قسم) کی وہ حدیثیں ہیں۔ جو بتاتی ہیں۔ کہ وہ سبزی جو فضائے آسمان میں نظر آتی ہے۔ وہ دراصل سماء کا رنگ ہے۔ اور اس امر پر سب کا اتفاق بھی ہے۔ کہ یہ سبزی دراصل کرہ بخار کی ہے۔ اسی وجہ سے اس فضائے محیط کو قدماء و متاخرین دونوں ہی "قبۂ زرقاء" (نیلگوں قبہ) کہتے ہیں۔ علاوہ اس کے ہم نے جو حدیثیں "رسالہ کوہ قاف" میں نقل کی ہیں۔ اُن سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ کہ یہ لاجوردی رنگ دراصل سماء کا ہے۔ اور یہ امر بھی مسلم ہے۔ کہ قدماء جس چیز کو سماء یا فلک کہتے ہیں۔ اُس کا کوئی رنگ نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ تو پھر جن کلاموں اور حدیثوں میں سماء کے واسطے خضرۃ ثابت کی گئی ہے۔ اُس سے ہم یہ کیوں نہ مراد لیں۔ کہ آسمان کی سبزی کو بیان کیا گیا ہے۔ اور آسمان سے مراد یہی کرۂ بخاریہ ہے۔ کیونکہ یہ بات مان لی گئی ہے۔ کہ رنگ مذکور نہیں حاصل ہو سکتا۔ مگر کرہ

بخاریہ میں۔ تو معلوم ہوا کہ جہاں جہاں لفظ سماء بولا گیا ہے۔ اور اس کا رنگ بیان کیا گیا ہے۔
اُس سے مراد یہی کرۂ مذکور ہے۔ نہ کہ وہ فلک جسے بطلیموس وغیرہ نے بیان کیا ہے۔
(جس کا حاصل یہ ہوتا ہے۔ کہ شریعت کی زبان میں لفظ سماء اسی کرہ پر اطلاق ہوتا ہے۔ اور
یہی آسمان ہے۔ نہ کوئی اور۔ شرع بالکل اُس سماء کے مخالف ہے۔ جسے قدماء حکماء
بیان کرتے تھے)۔ دیکھئے جناب خواجہ محقق نصیر الدین طوسی علیہ الرحمہ کتاب تذکرہ میں
فرماتے ہیں۔ وقالوا یعنی الحکماء الزرقۃ التی یظن الناس انہا لون السماء فانہا
تظہر فی کرۃ البخار لانہ لما کان الالطف منہ اشد صعودًا من الاکثف کانت
الاجزاء القریبۃ من سطح کرۃ البخار اقل قبولًا للضوء من الاجزاء القریبۃ
من الارض لکثرۃ البعد واللطافۃ ولہذا تکون کالمظلمۃ بالنسبۃ الی ہذہ
الاجزاء القریبۃ فیری الناظر فی کرۃ البخار لونا متوسطا بین الضیاء
والظلام۔ یعنی" حکماء نے بیان کیا ہے۔ کہ وہ نیلگون رنگ جسے عام لوگ آسمان کا رنگ
سمجھتے ہیں۔ وہ دراصل کرۂ بخار میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس وجہ سے کہ بخار لطیف حصہ چونکہ بہ نسبت
کثیف کے زیادہ بلند ہو جاتا ہے۔ تو وہ حصہ جو کرۂ بخار سے قریب ہے۔ اُس میں روشنی کا
نفوذ بہ نسبت زمین سے قریب والے حصہ کے کم ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ بعید اور لطیف زیادہ ہے
اسی وجہ سے وہ تاریک معلوم ہوتے ہیں۔ بہ نسبت ان اجزائے قریبہ کے۔ اسی وجہ سے
دیکھنے والے کو کرۂ بخار کا رنگ درمیان تاریکی اور روشنی کے معلوم ہوتا ہے۔ (یعنی بالکل
روشن ہے نہ بالکل سیاہ۔ بلکہ نیلگوں یا سبزی مائل ہے)۔ نیز مشہور حکیم (فلاماریون)
فرانسیسی نے کہا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے۔ کہ وہ سبزی جو فضا میں محسوس ہوتی ہے۔ وہ
کرۂ المسفر کا رنگ ہے۔ جو ہماری زمین کو مثل طبقہ معلومۃ الثخن کے محیط ہے۔ اور ظاہر
ہے۔ کہ ہوائے مجتمع متراکم کی صفائی جب زیادہ ہوگی۔ تو نیلا اور سبز ہی رنگ دکھائی دیگا۔
جیسا کہ سمندر کا پانی جب زیادہ صاف ہوتا ہے۔ تو اُس کا رنگ سبز ہی معلوم ہوتا ہے۔
حالانکہ جہاں پانی کم ہے۔ وہاں یہ رنگ نہیں معلوم ہوتا" نیز علاوہ اُن احادیث کے
جن کا حوالہ سابق میں ہم نے دیا ہے۔ ایک حدیث تفسیر حافظ قمی میں خلقت سماء
کے بیان میں وارد ہے۔ کہ کانت السماء خضراء علی لون الماء العذب۔ یعنی
"آسمان کا رنگ اسی طرح سبز ہے۔ جیسے شیریں پانی کا رنگ سبز معلوم ہوتا ہے" جبکہ

مقدار میں زیادہ صاف اور شفاف ہو"۔ اور بعض نسخوں میں بجائے لفظ لون الماء العذب کے لون الماء الاخضر ہے۔ اور دوسری حدیث انوار نعمانیہ میں مذکور ہے۔ کہ خداتعالےٰ نے درمیان سماء و ارض کے ایک دریا پیدا کیا ہے۔ اور اُسے اپنی قدرت سے ٹھیرایا ہے۔ اور یہ سبزی جو ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ اُسی دریا کے پانی کی سبزی ہے۔ مطلب اس حدیث کا واضح ہے۔ اور ہر ذی عقل سمجھ سکتا ہے۔ کہ معصوم نے کیا مراد لی ہے۔ (مترجم عرض کرتا ہے۔ کہ اس حدیث کے الفاظ کا مطلب صاحب کتاب کے مطلب سے کسی قدر مغائر ہے۔ کیونکہ صاحب کتاب سماء کی خضرۃ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ اور حدیث مذکور اُس بحر کی خضرۃ بتاتی ہے۔ جو درمیان سماء ارض کے ہے۔ لہذا اس حدیث کا پیش کرنا اس موقع پر خالی اشکال سے نہیں ہے) +

(ساتویں قسم) کی وہ حدیثیں ہیں جو اس امر پر دلالت کرتی ہیں۔ کہ "سماء" یعنی آسمان ستاروں کے مدارات کے نیچے واقع ہے۔ (جن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ تمام کواکب اوپر ہیں۔ اور آسمان اُن کے نیچے ہیں۔ حالانکہ قدماء کا آسمان تو وہی ہے۔ جس کے اندر ستارے کو حرکت ہوتی ہے۔ نہ یہ کہ ستارے اس سے اُوپر ہیں۔ پس لامحالہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ شریعت اُس آسمان کی ہرگز قائل نہیں۔ جس کے قائل بطلیموسی ہیں بلکہ جسے آج کل کے فلاسفر آسمان کہتے ہیں۔ اُسی کو ہماری شریعت اسلامیہ بھی آسمان کہتی ہے) + منجملہ اُن روایات کے ایک روایت جابرؓ انصاری کی ہے۔ جو تفسیر قمیؒ وغیرہ میں مذکور ہے۔ (بذیل تفسیر آیہ رایت احد عشر کوکبا)۔ معصومؑ نے بعد ذکر کرنے ستاروں کے ارشاد فرمایا ہے۔ کہ کل ھذہ النجوم محیط بالسماء یعنی تمام ستارے آسمان کو محیط ہیں"۔ ظاہر ہے۔ کہ ستارے کسی حال میں کسی چیز کو محیط نہیں ہو سکتے۔ سوا باعتبار اپنی گردشوں کے۔ پس معلوم ہوا۔ کہ یہ سیارات اپنی گردش میں آسمان کو محیط اور اُس کے گرد دورہ کرنیوالے ہیں۔ یہ معنی کسی طرح درست نہیں ہو سکتے سوا اُسی صورت میں جبکہ ہم سماء سے مراد کرہ بخاریہ لیں۔ اور اسی تمہید لطیف سے ہم اُن روایتوں کو جمع کر سکتے ہیں۔ جن میں سے بعض کا یہ بیان ہے۔ کہ "سماء" فلک کے نیچے ہے۔ اور بعض کا اس کے برخلاف کہ فلک نیچے ہے سماء کے۔ حالانکہ اس قسم کے روایات اس سے سابق آپس میں متناقض سمجھے جاتے تھے۔ (اور لوگ ان کے جمع کرنے اور ان کے صحیح محل پر محمول کرنے سے عاجز تھے) لیکن

ہم اس طرح ان حدیثوں کو جمع اور اُس کی تصحیح کر سکتے ہیں کہ ہر سیارہ کے کرۂ بخاریہ کو سماء کہتے ہیں۔ اور ہر سیارے کے مدار کو فلک۔ جیسا کہ ہم نے تحقیق فلک میں بیان کیا ہے۔ اس بنا پر ہر سیار کی زمین کا سماء فلک کے نیچے واقع ہوگا۔ اور نیز فلک کے اوپر بھی۔ (یعنی بعض کے اعتبار سے نیچے اور بعض کے اعتبار سے اوپر) ۔ دوسری روایت بحار میں تفسیر درمنثور سے منقول ہے۔ کہ "قمر اور شہاب ثاقب سماء دنیا سے اوپر ہیں" یہ حدیث بھی کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی۔ اِلّا یہ کہ سماء دنیا کی تفسیر کرۂ بخاریہ سے کی جائے۔ یعنی چونکہ سماء دنیا سے مراد یہی کرۂ بخاریہ ہے۔ تو ظاہر ہے۔ کہ چاند اور کل شہاب ثاقب اِس سے اُوپر ہیں۔ ورنہ قدیم فلسفے کے بیان کے بموجب تو یہ سب سماء دنیا کے اندر ہیں۔ یعنی فلک اوّل میں رہتے ہیں۔ نہ کہ اُس سے اوپر۔ حالانکہ معلوم ہے کہ شہاب ثاقب کسی طرح افلاک نجوم کے اوپر نہیں رہ سکتے۔ (مترجم عرض کرتا ہے۔ کہ قدماء کا بھی یہ مسلک عام نہیں ہے۔ کہ قمر و شہب ثواقب سب کے سب فلک اول میں ہیں۔ بلکہ صرف قمر کو وہ لوگ فلک اوّل میں بتاتے ہیں۔ اور شہب کو تو اسی کرۂ بخاریہ میں بیان کرتے ہیں۔ یا اس سے اوپر۔ نہ نفس فلک اول میں۔ فتامل) اور مَیں عنقریب بیان کرونگا کہ اسی کرۂ بخاریہ کو سماء دنیا کہنے کے کیا کیا دلائل ہیں۔ جہاں مسئلہ مذنبات (ستارہ ہائے دمدار) کا ذکر آئیگا۔ خلاصہ یہ کہ مختلف احادیث اور مضامین جو شریعت اسلامیہ سے منقول ہوئی ہے۔ انکی تصحیح و جمع اور ان کا باہم ارتباط نہیں ہو سکتا۔ اِلّا اسی ترتیب و نظام کی رُو سے جسے مَیں نے اس کتاب میں مفصل بیان کیا ہے۔

(آٹھویں قسم) کے وہ جملہائے شرعیہ ہیں۔ جو ہمیں اس طرف ہدایت کرتے ہیں۔ کہ ہوا کا محدّب اور منتہا آسمان سے ملا ہوا ہے۔ اور وہ اس کے استحکام میں دخل رکھتی ہے۔ جیسا کہ دعاء جناب یعقوب علیہ السلام میں ہے۔ جو کتاب تفسیر حافظ قمی کی تفسیر سورۂ یوسف علیہ السلام میں بیان ہوئی ہے۔ یا من شید السماء بالھواء وکبس الارض علی الماء "اے وہ معبود جس نے آسمان کو ہوا سے مستحکم کیا۔ اور زمین کو پانی پر قائم کیا اور جمایا"۔ حالانکہ یہ شخص اس بات کو جانتا ہے۔ کہ ہمارے جس آسمان کا استحکام و تقوم ہے۔ وہ کرۂ بخار ہے۔ (نہ وہ آسمان جسے حکماء سابقین کہتے تھے۔ کیونکہ اُن کا آسمان تو خود بخود مستحکم اور نہایت ٹھوس واقع ہوا ہے۔ اُسے کسی

ہوا سے استحکام حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے) +

نیز جو دعا سے روز عرفہ میں امام سوم جناب سبط اصغر حسینؑ ابن علی علیہ السلام سے مروی ہے۔ اور اسے کتاب بحار میں اور کتاب بلد امین فاضل کفعمی ابراہیم نے وارد کیا ہے اور صحیفہ حسینیہ وغیرہ میں بھی منقول ہے۔ اور وہ یہ ہے "یا من کبس الارض علی الماء وسد الھواء بالسماء" اور بعض نسخوں میں سدّ کی جگہ شیّد ہے۔ بہر صورت ہمارا مطلب حاصل ہے۔ اور ہمارے دعوے کی تائید ہوتی ہے۔ کیونکہ "سدّ الھواء بالسماء" سے بظاہر یہی مراد معلوم ہوتی ہے کہ آسمان کرۂ ہوا کو محیط ہے۔ اور یہ مطلب بھی قدماء فلسفین کی رائے کے مخالف ہے۔ کیونکہ وہ آسمان اور کرۂ ہوا کو ایک دوسرے سے متصل نہیں مانتے۔ بلکہ کرۂ نار کو درمیان کرۂ ہوا اور فلک اوّل کے حد فاصل بتاتے ہیں +

(نیز) کتاب بحار میں جناب امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ہے۔ ایک حدیث طولانی کے ذیل میں حضرتؑ نے فرمایا ہے "وسدّ الھواء بین الارض والسماء" یہ کلام بھی صریح اُسی مطلب کو بتا رہا ہے۔ جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے + (مخفی نہ رہے کہ یہ احتمال جو ان اقوال میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی احتمالات ان میں ہیں۔ مگر ظاہر سیاق کلام ان کا اُسی مطلب کے زیادہ موافق ہے۔ جسے ہم نے اختیار کیا ہے۔ اور اس احتمال کی رُو سے اختلاف بیانی کا الزام بھی روایات سے دفع ہوتا ہے۔ اور تحقیقات جدیدہ کی موافقت بھی ہوتی ہے +

(**نویں قسم**) کی وہ آیات و روایات ہیں۔ جو اس امر کو بتاتی ہیں کہ سماوات طبق طبق اور تہ بتہ ہیں۔ جیسا کہ ہمارے بہت سے قدماء علماء نے سمجھا ہے۔ اور اس بات کا دعوے کیا ہے۔ کہ ان آیات و روایات سے یہ سمجھ میں آتا ہے۔ کہ سماوات ایک دوسرے سے متصل ہیں۔ اور اُن کے درمیان میں خلاء ہے۔ منجملہ اُن کے محدث نعمت اللہ الجزائری بھی ہیں۔ جنھوں نے اپنی شرح صحیفہ سجادیہ میں لفظ اطباق سماوات کی شرح فرماتے ہوئے فرمایا ہے کہ "یہ کلام اور نیز اور بہت سی حدیثیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں۔ کہ آسمانوں کے درمیان خلاء ہے۔ اور بڑی وسعت ہے۔ پس حکماء ریاضیین کا یہ کہنا کہ ہر نیچے کے فلک کا بالائی حصّہ اوپر کے فلک کے تحتانی حصہ سے ملا ہوا ہے باطل ہے۔ اور ان روایات کی تاویل اس طور پر کرنا جس سے حکماء کے قول سے مطابق ہو جائیں اور

بھی زیادہ لغو ہے +

مجھے بہت ہی اچھا معلوم ہوتا ہے کہ سید جلیل یعنی حافظ نعمت اللہ جزائری کس قدر ظواہر کلمات شریعت کو مضبوطی کے ساتھ مانتے ہیں۔ اور فلسفی مطالب کی طرف خواہ مخواہ ان ظواہر شریعت کو پھیرنے سے کراہت رکھتے ہیں۔ حالانکہ فی الواقع یہ بات صحیح ہے۔ کہ ابھی ان فلسفی مطالب کی صحت کا یقین نہیں ہوا ہے۔ پھر کیوں ہم یقینی باتوں کو چھوڑ کر غیر یقینی کو اختیار کریں +

اور میرا خیال ہے۔ کہ وجہ اس اچھی خصلت کی اس سید میں پائے جانے کی یہ ہے۔ کہ ان کو اپنے دین کے امور کے مستحکم ہونے کا پورا یقین ہے۔ اسی وجہ سے وہ اقوال شریعت کو خواہ مخواہ فلسفہ پر ڈھالنا نہیں چاہتے۔ خدا ہمیں بھی اپنے دین پر قائم رکھے۔ کہ ہم اُس کی طرف رجوع کر سکیں +

نیز تمام دینداروں کے لئے یہی مناسب ہے۔ کہ ظاہر شریعت اور معلومات شریعت سے عدول کر کے اُس کے مخالف مطالب فلسفیہ کی طرف رجوع کرنے کو سہل نہ سمجھیں خواہ وہ فلسفہ جدید ہو یا قدیم۔ جب تک کہ حقیقت واضح نہ ہو جائے۔ اور براہین قویہ اُس پر قائم نہ ہو جائیں۔ البتہ اُس وقت مناسب ہوگا۔ کہ اُن ظواہر منقولہ میں جو حقائق معقولہ کے مخالف ہیں تاویل سے کام لیا جائے۔ اور یہ بات عقلاً اور نقلاً دونوں طرح درست ہے۔ (نہ یہ کہ بلاوجہ ہیر پھیر کر کے اقوال شریعت کو فلسفہ کے مطابق کرے۔ اگرچہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو) +

(دسویں قسم) کے وہ کلمات اور دعائیں ہیں۔ جو ہمارے نبیؐ کے اوصیاءؑ سے نقل کئے گئے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سماوات اور ارضین دونوں ہی میں وزن اور میلان خفت اور ثقل موجود ہے۔ جیسا کہ چوتھے امام جناب علی بن الحسین علیہ السلام سے حضرتؑ کی تسبیح میں مروی ہے۔ کہ فرمایا آپ نے سبحانك تعلم وزن السماوات سبحانك تعلم وزن الارضین سبحانك تعلم وزن الشمس والقمر سبحانك تعلم وزن الظلمة والنور سبحانك تعلم وزن الفئ والهواء سبحانك تعلم وزن الريح كم هي من مثقال ذرة الخ۔ اس تسبیح کو حضرتؑ سے بہت لوگوں نے نقل کیا ہے۔ مثلاً فقیہ حافظ محمد عاملی متوفی سنہ ۱۱۰۴ھ نے صحیفہ ثانیہ کی پچپنویں دعا میں نقل کیا ہے۔ اور فرمایا ہے۔ کہ زہری نے سعید بن مسیب سے اس کو روایت کیا ہے۔ نیز سید حافظ ملا نعمۃ اللہ جزائری متوفی سنہ ۱۱۱۲ھ نے اپنی شرح متعلقات صحیفہ سجادیہ میں فرمایا ہے

کہ شیخ فقیہ (محمد بن مکی عاملی شہید اوّل شہید ۷۸۶ھ) نے ان ملحقات دعاؤں کی روایت کی ہے۔ اور منجملہ اُن کے اس تسبیح کو بھی ذکر کیا ہے ؛

یہ مضمون دعاؤں کی پرانی کتابوں میں جابجا مذکور ہے۔ اور ظاہر ہے۔ کہ مضمون اس کا پرانے فلسفے کے بالکل مخالف ہے۔ کیونکہ قدیم فلاسفروں کے نزدیک "وزن" نام ہے "کسی جسم کے اوپر مرکز کی طرف میل کرنے کا"۔ پس اگر اُس جسم کا مرکز علوی ہے۔ جیسے کرۂ نار اور کرۂ ہوا۔ تو اس کے میلان کا نام خفت ہے۔ اور اگر مرکز اُس کا سفلی ہے۔ جیسے مٹی اور پانی۔ تو اس کے میلان کا نام ثقل ہے۔ اسی وجہ سے ان لوگوں کا اتفاق ہے۔ کہ فلکیات میں بالکل وزن نہیں ہے۔ خواہ وہ دوسرے جسم کے حامل ہوں۔ جیسے خود افلاک۔ یا محمول ہوں۔ جیسے اجرام مرکوزہ مثل آفتاب ماہتاب اور دیگر سیارات کے (جنہیں وہ مانتے ہیں۔ کہ افلاک سبعہ میں جڑے ہوئے ہیں۔ اور وہ ان کا حامل ہے)۔ کیونکہ اُن کے نزدیک وزن نام ہے میل مستقیم کا۔ اور ظاہر ہے۔ کہ اُن کی رائے کے مطابق کسی فلکی جسم میں مبدء میل مستقیم نہیں پایا جاتا۔ (بلکہ اُن کا خیال ہے۔ کہ ہر فلک صرف دوری ہی حرکت کر سکتا ہے۔ جس کا نام وہ حرکت وضعیہ رکھتے ہیں۔ اور اسی بناپر افلاک میں خرق والتیام کو محال بتاتے اور مسئلہ نبوت یا صعود وہبوط ملائکہ کے منکر ہیں)۔ دیکھئے ان کا رئیس شیخ بوعلی بن سینا طبیعیات کتاب شفا کے "فن ثانی" میں لکھتا ہے۔ کہ "فلک مطلقاً کروی جسم ہے۔ شفاف ہے۔ صرف اُس میں مبدء میل مستدیر ہے"۔ یہاں تک کہ آگے چل کر کہتا ہے۔ کہ "وہ اجرام واجسام جن کو یہ افلاک اُٹھائے ہوئے ہیں۔ (یعنی جو ان کے اندر پائے جاتے ہیں۔ جیسے کواکب ثوابت وسیارہ) نہ اُن میں خفت ہے نہ ثقل۔ نہ کسی قسم کا میل ہے اور نہ تحریک ہے نہ کسی جسم کو دفع کرنے اور اُس سے حرکت میں مقابلہ کرنے کی قوت ہے"۔ یہ بیان تو ان لوگوں کا فلکیات کے متعلق ہے۔ رہے عنصریات تو اُس میں ان لوگوں نے دو حالتوں کا خیال کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ ہر جزو کرۂ زمین کا یا کرۂ آب وکرۂ ہوا وکرۂ نار کا خود اُسی کرہ کے مرکز کی طرف میل طبعی رکھتا ہے۔ مثلاً پتھر جب اوپر سے پھینکا جائیگا۔ تو زمین کی طرف آئیگا۔ اور پھونکنے سے جو ہوا پیدا ہوتی ہے۔ وہ کرۂ ہوا کی طرف جائیگی۔ اور شعلہ ہمیشہ کرۂ نار کی طرف مائل ہوگا۔ اسی حالت میں اُن کے نزدیک میل اور وزن کا احساس وادراک ہوتا ہے۔ اور جب "وزن" بولتے ہیں۔ تو یہی حالت میلانی مراد لیتے ہیں ؛ دوسرے پورے کرۂ ارض کا میلان یا پورے کرۂ ہوا کا میلان یعنی نیچے یا اوپر کی

طرف جھکنا اور مائل ہونا۔ مگر اس کیفیت کو وہ لوگ ان اجسام کے لئے محال بتاتے ہیں۔ (کیونکہ ان کا قول ہے۔ کہ اپنے مرکز سے ہٹ کر یہ اجسام کسی دوسری طرف میلان نہیں کر سکتے۔ اور اس اعتبار سے وزن کے بالکل منکر ہیں۔ نہ زمین کے لئے وزن کو اس کیفیت کے لحاظ سے تسلیم کرتے ہیں۔ اور نہ ہوا وغیرہ کے لئے۔ جس طرح کہ فلکیات میں مطلق وزن کا انکار کرتے ہیں۔ اور اپنے انکار کی دلیل یہ قرار دیتے ہیں۔ کہ اصل کرۂ زمین اپنے تمام اجزا کا مرکز ہے۔ اسی طرح اصل کرہ ہوا اپنے تمام انوار کا مرکز ہے۔ اور وزن نام ہے کسی شے کے اپنے مرکز کی طرف مائل ہونے کا۔ اور ظاہر ہے۔ کہ خود کرہ کے واسطے کوئی مرکز نہیں۔ جس کی طرف وہ مائل ہو سکے۔ رہا خود اس کا اپنی طرف مائل ہونا۔ تو یہ بھی محال بتاتے ہیں۔ لہذا اگر مانا جائے۔ کہ زمین کے لئے کوئی وزن ہے۔ تو دو ہی صورتوں سے ہو سکتا ہے۔ یا اس طور پر۔ کہ وہ خود اپنی جانب میل کرے۔ حالانکہ یہ بات بالکل بے معنی ہے۔ یا یہ کہ کسی دوسرے کرہ کی طرف مائل ہو۔ حالانکہ جب دونوں کروں میں حد درجہ کا تباین ہے۔ تو کیونکر ہو سکتا ہے۔ کہ ایک مخالف کرہ دوسرے مخالف کرہ کی طرف مائل ہو سکے + (نتیجہ) یہ نکلا۔ کہ زمین بھی مثل دیگر کرات کے ہے۔ نہ اس میں خفت ہے نہ ثقل۔ کیونکہ نہ اُس میں کوئی وزن ہے اور نہ میل۔ جیسا کہ فلکیات کو ان دونوں سے خالی بتاتے ہیں۔ اور اگر ہم ان باتوں کو تسلیم کر لیں۔ جیسا کہ ہمارے قدماء محققین نے مانا تھا۔ تو لامحالہ ظواہر اقوال شریعت میں تاویل کرنی پڑیگی۔ حالانکہ وہ صاف بتا رہے ہیں۔ کہ کیا سماوات اور کیا ارضین۔ سب ہی میں "وزن" پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ تسبیح مذکورہ بالا میں جو جناب امام زین العابدین علیہ السلام سے مروی ہے معلوم ہوا خصوصاً جبکہ ہم سماوات کی تفسیر و تعبیر افلاک سے کریں یعنی دونوں کو ایک ہی بتائیں جیسا کہ قدماء محققین و علما قائل تھے +

باقی رہے ایک ہزار سنہ ہجری سے بعد والے حکماء۔ تو اُن کے نزدیک "وزن" پیدا ہوتا ہے قوت جذب سے۔ اور ان کی رائے یہ ہے۔ کہ تمام اجسام عالم میں جاذبیۃ پائی جاتی ہے یعنی ہر ایک میں کشش کی قوت ہے۔ خواہ فلکی اجسام ہوں۔ یا عنصری۔ (اور ہر ایک اسی کشش کی قوت سے اپنی اپنی حد میں قائم ہے)۔ لہذا ان لوگوں نے "ثقل" نام رکھا ہے اس بات کا کہ ماتحت کا جسم فوقانی جسم کو اپنی طرف جذب کرتا ہو۔ اور خفت نام رکھا ہے اس امر کا کہ فوقانی جسم تحتانی جسم کو جذب کرتا ہو۔ پس جس طرح فوقیۃ اور تحتیۃ اعتبارات کے اختلاف سے مختلف

ہو جاتی ہے - اُسی طرح خفت و ثقل بھی باختلاف اعتبارات مختلف ہوتی رہتی ہے +

ان متاخرین کا یہ بھی اعتقاد ہے - کہ ہر بڑا جسم اپنے سے چھوٹے جسم کی کشش کرتا ہے۔ خواہ باعتبار حجم کے بڑا ہو - یا باعتبار جوہر ذات کے - یا باعتبار کثافت کے - جب تک کہ کوئی اور قوی جسم اُس کو کشش سے مانع نہ ہو - اسی وجہ سے کل ارضی چیزیں زمین کی طرف کھچتی ہیں - اور اسی وجہ سے اس کی کشش کرۂ قمر کی طرف نہیں ہوتی - اور قمر وغیرہ بھی زمین ہی کی طرف کھچتے ہیں - اور خود زمین کی کشش آفتاب کی طرف ہے - اور علیٰ ہذا القیاس ہر چھوٹے جسم کی کشش بڑے جسم کی طرف ہے پس اگر یہ خیالات (متاخرین کے) صحیح ہوں - تو دعائے مذکور کے ظاہر الفاظ سے بے تاویل و تصرف کے اثبات مطالب میں مدد لی جا سکتی ہے - اور زمین و آسمان و آفتاب و ماہتاب و ہوا کے واسطے وزن کا اثبات آسانی سے کیا جا سکتا ہے - اور یہ بالکل مطابق ہوگا آج کل کی تحقیقات کے - جو باریک باریک آلات اور صحیح افکار کے ذریعے سے حاصل کئے گئے ہیں - یہاں اُن سب کا بیان تو مشکل ہے - مگر میں صرف نیچے والے آسمان کا وزن اُن کی تحقیق کے موافق بیان کرتا ہوں +

یورپین فلاسفروں کا خیال ہے - کہ کرۂ بخاریہ (نیچے والے آسمان) کا وزن (۹۰۸۰۳۷۸۱۰۲۴۹۴۱۱۲۲۲۵۱۱) رطل ہے - جیسا کہ حدائق النجوم میں مذکور ہے - نیز یہ بھی بیان کیا گیا ہے - کہ تمام بخارات جو پانی سے اُٹھ کر فضائے ہوا میں پھیلتے ہیں - اُن کا وزن چھ کھرب بانوے ہزار ملین قنطار ہے - (قنطار چالیس اوقیہ یا ہزار اوقیہ یا بارہ سو اوقیہ ہے - اور بعضے کہتے ہیں - کہ ایک گائے کی کھال بھر کے اشرفی یا درہم کی مقدار قنطار ہے - وغیرہ) - یعنی (۰۰۰۰۰۰۰۰۲۹۶) - اور وہ ہوا جو انسان کے سر کے محاذی سر سے لے کر پینتالیس میل اوپر تک ہے - اُس کا وزن بھی دریافت کر لیا ہے - چنانچہ کتاب آیات بینات میں ہے - کہ انسان کے جسم پر جس قدر ہوا کا بار پڑتا ہے - وہ تقریباً ۶۲۲۴ رطل ہے - اور کتاب نجوم مشرقات میں لکھا ہے - کہ وہ عمود ہوائی جس کا متحمل انسان کا جسم ہوتا ہے - ۳۳ ہزار ۲۰۰ رطل ہے - (اس مقام پر ان دونوں کتابوں کا بیان مختلف ہے - مگر مطلب یہاں صرف وزن کے ثابت کرنے سے ہے - اور وہ حاصل ہے) - اب رہا یہ کہ اس قدر بار کا متحمل انسان کا جسم کیونکر ہوتا ہے - حالانکہ اس وزن کے مقابلہ میں خود انسان کا وزن عشر عشیر بھی نہیں ہے - تو اس کا جواب یہ ہے - کہ ہوا خود ہر طرف

اپنے ہی اجزا سے دبی ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے اُس کا بار تقسیم ہوگیا ہے۔ نیز یہ کہ جسم کے اندر بھی ہوا بھری ہوئی ہے۔ جو اُسے خارج کی طرف دباتی ہے۔ اور اُس کی وجہ سے ہوائے محیط کے وزن کا مقابلہ ہو جاتا ہے۔ یا اس وجہ سے کہ چونکہ ہوا کے اجزا باہم متصل ہیں۔ اور ایک دوسرے کو پکڑے ہوئے ہیں۔ لہذا آدمی کے بدن پر اُس کا بار محسوس نہیں ہوتا۔ جس طرح سے پانی کے اندر مچھلی چلتی ہے۔ حالانکہ اس کے جسم پر منوں پانی کا بار ہوتا ہے۔ پھر بھی اُس پر کچھ اُس کا اثر نہیں پڑتا۔ حاصل کلام یہ ہے۔ کہ کرہ بخاریہ کے واسطے ثقل اور وزن کا ثابت ہونا۔ اور نیز احادیث کی رو سے سماوات کے واسطے وزن کا ثابت ہونا ہماری ترتیب مذکور کے موید ہے۔ یعنی یہ کہ ارضین سبع سے مراد سیارات کواکب کی زمینیں ہیں۔ اور سماوات سبع سے مراد یہی کرات بخاریہ ہیں۔ جو ان زمینوں کو محیط ہیں۔ اور یہ کہ افلاک سے مراد ہرگز وہ افلاک نہیں ہیں۔ جو قدمائے فلاسفہ کی رائے کے مطابق ہوں۔ آئندہ اس سے واضح تر بیان سے ہماری ترتیب کا صحیح ہونا انشاء اللہ ثابت ہوگا۔ جس میں پھر کوئی شبہ ہی باقی نہ رہیگا۔

ساتواں مسئلہ

ترتیب سماوات سبعہ اور ترتیب ارضین سبعہ کے بیان میں

ہم نے جو ترتیب قرار دی ہے۔ اُسی پر شریعت اسلامیہ کے اقوال بھی دلالت کرتے ہیں۔ اور علم ہیئت کو پرنیکی کے بھی موافق ہے۔ رہی پرانی ہیئت (یعنی علم ہیئت قدمائے یونان)۔ تو از بسکہ ہمارے علماء سوائے اس کے اور کسی دوسری ہیئت سے باخبر نہ تھے۔ اس وجہ سے اُن کو ضرورت پڑتی تھی۔ کہ ظواہر احادیث میں تاویلیں کر کے شریعت اور فلسفہ کو مطابق کریں۔ (تاکہ کسی کو یہ کہنے کا حق نہ ہو۔ کہ شریعت اسلامیہ عقل کے مخالف ہے)۔ حالانکہ اس تطبیق کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ (اس قدر یہاں کہدینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہمارے قدماء علماء نے جو یہ کوشش فرمائی تھی۔ کہ جس طرح سے ہو سکے شریعت کے اقوال کو

فلسفہ سے مطابق کر کے دکھلادیں۔ اُس کی وجہ یہی تھی۔ جو آج کل ہمارے روشن خیال علماء کو
پیش آرہی ہے۔ پس چونکہ اُس زمانہ میں علم فلسفہ کے شیوع کی وجہ سے ہر شخص اُسی پر ایمان لایا
ہوا تھا۔ اور شریعت کے اقوال کو غلط بتانے لگا تھا۔ تو متدینین علماء نے یہ سعی کی۔ کہ بہر صورت
ایسے وجوہ کلام شریعت میں پیدا کریں۔ جن سے ثابت ہو۔ کہ شریعت نے ہرگز خلاف عقل باتیں
نہیں بیان کیں۔ اور اس ترکیب سے ان حضرات نے عوام کی زبان بندی طعن فی الشریعۃ
سے کی تھی۔ اب چونکہ جدید فلسفہ کا زور ہے۔ اور ہر شخص اُس پر دل و جان سے ایمان لانیکو
تیار ہے۔ اور اُس کے مقابلے میں اگر کہیں بظاہر قول شرع کو مخالف پاتا ہے۔ تو فوراً تنگدل
ہونے لگتا یا طعن کرنا شروع کرتا ہے۔ اس وجہ سے زمانہ حال کے علماء نے یہ روش اختیار
کی ہے۔ کہ جہاں تک ہو۔ شریعت کو اس فلسفہ سے مطابق کر کے دکھلاویں۔ تاکہ ایمان میں
خلل نہ ہونے پائے۔ پس جس طرح کہ زمانہ حال کے علماء کی سعی مشکور ہے۔ قدماء علماء کی
سعی بھی مشکور ہے۔ اور ہرگز اُن کا یہ فعل قابل طعن و ملامت نہیں ہے۔ بلکہ ہم یقین کے ساتھ
کہتے ہیں۔ کہ ہرگز ہمارے علماء کا ایمان قدیم فلسفہ پر نہ تھا۔ اور اس وجہ سے وہ ہرگز اقوال
شریعت میں تاویل نہ کرتے تھے باوجود باطل سمجھنے اقوال فلاسفہ کے۔ یہ فعل اُن کا محض عوام
کے اعتقادات کی حفاظت اور شریعت اسلامیہ کی حمایت کی غرض سے تھا۔ جیسا کہ ناظرین
کتب علماء پر مخفی نہیں ہے۔ مترجم)۔ کیونکہ ہماری شریعت میں بہت کچھ طعن و تشنیع فلاسفہ قدماء
پر وارد ہوئی ہے۔ اور اُن کی رایوں کو فاسد بتایا گیا ہے۔ اور اقوال شرعیہ بھی برخلاف نظام
بطلیموسی کے نظام سماوات و ارضین کو ثابت کرتے ہیں۔ جیسا کہ جناب صادق علیہ السلام
امام ششم نے ایک شخص کے اس کہنے پر کہ فلاسفہ یونان قائل ہیں۔ "کہ فلک میں اگر تغیر پیدا
ہو تو فنا ہو جائیگا" فرمایا تھا۔ کہ "یہ دہریوں کی باتیں ہیں"۔ اور جیسا کہ جناب امیر المومنین علیہ السلام
نے اپنے ایک مشہور خطبہ میں فرمایا ہے۔ وکیف علقت فی الھواء سماواتک۔ (یعنی خدایا
کیا عجیب تیری صنعت ہے۔ کہ کس حسن سے تو نے ہوا میں اپنے سماوات کو معلق فرمایا ہے)۔
اور نیز جیسا کہ تفسیر قمی میں من افطار السموات کی تفسیر کرتے ہوئے بیان کیا ہے۔ "کہ جب
قیامت کا دن آئیگا۔ تو نیچے والا آسمان زمین کو محیط ہو جائیگا۔ اور دوسرا آسمان سماء دنیا (نیچے
والے آسمان) کو گھیر لیگا۔ اور تیسرا آسمان دوسرے آسمان کو گھیر لیگا۔ اسی طرح ہر آسمان اپنے مابعد
والے آسمان کو محیط ہو جائیگا۔ پھر ایک منادی ندا کریگا۔ کہ اے گروہ جن و انس" الخ۔ اس حدیث سے

صاف ظاہر ہے۔ کہ جس ترتیب سے آسمانوں کو یونانی فلاسفر بیان کرتے ہیں۔ وہ ترتیب اس وقت موجود نہیں ہے۔ بلکہ قیامت میں ہوگی۔ (جس سے یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ہماری شریعت نے ہرگز پرانے فلسفے کی تبعیت نہیں کی ہے۔ اور نہ اُسنے صحیح بنایا ہے)۔ اور وہ نظام بطلیموسی جو سماوات کی نسبت بیان کیا جاتا ہے سبر فرض اس بات کے کہ سماوات و افلاک دونوں ایک ہی چیزیں ہیں۔ اُس کا ظہور و وجود نہ ہوگا۔ مگر اُسی وقت جبکہ یہ دنیا بدل کر آخرت کا زمانہ آئیگا۔ خیر ہمیں ان باتوں سے چنداں سروکار نہیں ہے۔ بلکہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اپنی ترتیب مقدس کو ایک مقدمہ کی تمہید کے بعد بیان کریں (جو شریعت اور نیز جدید فلسفہ کے مطابق ہے)*

مقدمہ متاخرین فلاسفروں کی یہ رائے ہے۔ (اور اس پر وہ اپنی دلیلیں بیان کرتے ہیں) کہ ساتوں سیاروں کی زمینیں (جو نظام شمسی کے اندر داخل ہیں) ایک کرۂ بخار سے گھری ہوئی ہیں۔ جیسے ہماری یہ زمین جس پر ہم آباد ہیں۔ اور زہرہ۔ عطارد۔ مریخ۔ مشتری۔ زحل اور اورانوس۔ کرۂ نبتون اور فالکان کی نسبت کوئی تصریح ان کے کلام میں نہیں ہے کہ آیا اُس کے گرد کوئی کرۂ بخار ہے یا نہیں۔ جیساکہ ہم نے زمینوں کے صرف سات ہی ہونے کے مسئلہ میں بیان کیا ہے۔ اور عنقریب ہم ان متاخرین کے صریح اقوال بیان کرینگے۔ جن سے معلوم ہوگا۔ کہ وہ ہر ایک زمین کے واسطے کرۂ بخار کے محیط ہونے کے قائل ہیں*

یہ بھی ناظرین کے خیال میں رہے۔ کہ ہم نے پہلے بیان کر دیا ہے۔ کہ اوپر والے کروں کو "ارض" سے تعبیر کرنا صحیح ہے۔ اور یہ کہ وہ سات ہیں۔ اور یہ بھی یاد رہے۔ کہ ہم نے بہت سے شواہد و دلائل اس امر پر بیان کرد ئے ہیں۔ کہ ہماری شریعت میں کرۂ بخاریہ ارضیہ کو "سماء" کہا گیا ہے۔ اور یہ کہ ہر جوہر بلند کو سماء کہتے ہیں۔ جب یہ مقدمہ بیان ہو چکا۔ تو اب میں کہتا ہوں۔ کہ میرے خیال و ظن بموجب جو احادیث و اقوال شرع سے مستفاد ہوتا ہے۔

ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کی ترتیب اس طرح ہے۔ (**پہلی زمین**) تو وہ ہے جس پر ہم لوگ سکونت پذیر ہیں۔ اور جس میں ایک روز دفن بھی کئے جائینگے۔ اور ہماری خلقت بھی اسی سے ہے۔ کیونکہ یہ ہمارے لئے قیام گاہ بنائی گئی ہے۔ اور نیز دیگر وجوہ بھی اس کے ہیں۔ (اور **سماء دنیا** نیچے والا آسمان) وہ ہمارا کرۂ بخاریہ ہے۔ جو ہمارے اس زمین کو محیط

ہے۔ (**دوسری زمین**) کرۂ زہرہ ہے مع تمام اُن ہواؤں اور پہاڑوں اور دریاؤں کے جو اُس پر واقع ہیں +

اُسے دوسری زمین کہنے کی وجہ یہ ہے۔ کہ سیارات کے حالات میں سے وہی حالت اور وہی اعتبار پہلے ملحوظ رکھا گیا ہے۔ جس کی روشنی زیادہ محسوس ہوئی۔ اور جس کی رفتار ہمارے سامنے زیادہ معلوم ہوئی۔ اور چونکہ یہ بات زہرہ میں موجود ہے۔ کہ وہ زیادہ ظاہر اور سب سے زیادہ ہماری نگاہوں کے سامنے گردش کرنے والا ہے۔ اس وجہ سے اُس کو دوسرا نمبر دیا گیا۔ اُس کے بعد عطارد کا درجہ ہے۔ پھر مریخ کا۔ اور علیٰ ہذا القیاس +

(اور **دوسرا آسمان**) وہ کرۂ بخاریہ ہے۔ جو زمین کرۂ زہرہ اور اُس کی ہوا کو محیط ہے۔ (**تیسری زمین**) کرۂ عطارد ہے۔ اور (**تیسرا آسمان**) وہ کرۂ بخاریہ ہے جو اُسے محیط ہے۔ (**چوتھی زمین**) کرۂ مریخ ہے۔ مع تمام اُن چیزوں کے جو اُس پر موجود ہیں۔ اور (**چوتھا آسمان**) وہ کرۂ بخار ہے۔ جو اُسے محیط ہے۔ (**پانچویں زمین**) کرۂ مشتری ہے۔ اور (**پانچواں آسمان**) وہ کرۂ بخار ہے۔ جو اُس کے گرداگرد ہے۔ (**چھٹی زمین**) کرۂ زحل ہے مع تمام اُن اشیاء کے جو اُس پر واقع ہیں۔ اور (**چھٹا آسمان**) وہ کرۂ بخار ہے۔ جو اُس کے گرد ہے۔ (**ساتویں زمین**) کرۂ ارانوس ہے۔ اور (**ساتواں آسمان**) وہ کرۂ بخار ہے جو اُسے محیط ہے۔ (دیکھو نقشہ نمبر ۵)۔ اس سے اوپر محض فضا ہی فضا ہے۔ جو ہمارے عالم شمسی کو محیط ہے +

مَیں نے اس بیان میں **نبتون** اور **فلکان** کا ذکر نہ کیا۔ اور تعداد ارضین میں اسے نہ داخل کیا۔ اس کی وجہ اُس مسئلہ میں بیان کر دی ہے۔ جس میں زمین کے صرف سات ہی ہونیکو ثابت کیا ہے +

اس عجیب و غریب ترتیب کی تصریح ہمارے آٹھویں امام علی بن موسےٰ الرضا علیہ السلام نے فرمائی ہے۔ اور میں نے اس حدیث کو اکثر کتب امامیہ میں باسناد قوی پایا ہے۔ منجملہ اُن کے تفسیر قمی رح ہے۔ اور تفسیر عیاشی رح۔ جو کہ تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے علماء میں سے تھے۔ اور نیز تفسیر مجمع البیان کی تفسیر سورۂ طلاق و سورۂ ذاریات میں دیکھا ہے۔ (یہ تفسیر علامہ طبرسی رح متوفی سنہ ۵۴۸ھ کی ہے)۔ نیز تفسیر برہان سید ہاشم بحرانی متوفی سنہ ۱۱۰۷ ہجری میں۔ اور تفسیر نور الثقلین و تفسیر صافی مصنفہ ملا محمد محسن فیض متوفی سنہ ۱۰۹۱ ہجری۔ اور بحار الانوار و انوار نعمانیہ میں

بھی یہ حدیث مذکور ہے۔ اور ہم نے ان میں سے اکثر کتابوں کا معتمد علیہ ہونا اس رسالہ کے مقدمہ اولے میں ثابت و واضح کر دیا ہے *

وہ حدیث بلفظہ اس طور پر وارد ہے۔ ان الحسین بن خالد سئل الرضا علی بن موسیٰ علیہ السلام عن ترتیب السماوات والارضین وقال لہ کیف ذلک جعلت فداک فبسط الرضا علیہ السلام کفہ الیسریٰ ثم وضع الیمنیٰ علیھا فقال ھذہ الارض الدنیا والسماء الدنیا علیھا فوقھا قبۃ والارض الثانیۃ فوق سماء الدنیا والسماء الثانیۃ فوقھا قبۃ والارض الثالثۃ فوق سماء الثانیۃ والسماء الثالثۃ فوقھا قبۃ والارض الرابعۃ فوق السماء الثالثۃ والسماء الرابعۃ فوقھا قبۃ۔ الخ۔ یعنی حسین بن خالد نے جناب امام رضا علیہ السلام سے روایت کیا۔ آسمانوں اور زمینوں کی ترتیب کس طرح واقع ہوئی ہے۔ (آیا اُسی طرح ہے جس طرح کہ یونانی حکماء کہتے ہیں۔ یا اُس کے خلاف)۔ تو آپ نے اپنا بایاں ہاتھ پھیلایا۔ اور اُس پر دایاں ہاتھ رکھا۔ فرمایا یہ تو زمین دنیا ہے۔ اور اس کے اُوپر بطور قبہ کے آسمان دنیا ہے۔ (دنیا کے معنی ہیں۔ نیچے والا)۔ اور دوسری زمین سماء دنیا سے اوپر ہے۔ اور دوسرا آسمان اُس زمین پر بطور قبہ کے ہے۔ اور تیسری زمین دوسرے آسمان کے اوپر واقع ہے۔ اور اُس کا آسمان اُس پر بطور قبہ کے ہے۔ اور چوتھی زمین تیسرے آسمان کے اوپر ہے۔ اور اُس کا آسمان اُس پر بطور قبہ کے بلند ہے۔ پانچویں زمین چوتھے آسمان سے اوپر واقع ہے۔ اور اُس کا آسمان اُس پر مثل قبہ کے بلند ہے۔ چھٹی زمین پانچویں آسمان سے اوپر ہے۔ اور چھٹا آسمان اُس پر مثل قبہ کے ہے۔ ساتویں زمین چھٹے آسمان پر واقع ہے۔ اور ساتواں آسمان اُس پر بطور قبہ کے ہے۔ اور عرش خدا ساتویں آسمان سے بھی اوپر ہے۔" یہی مطلب ہے ارشاد پروردگار عالم کا "سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ"۔ اس کے بعد خالد نے پوچھا "کیا ہم سے نیچے سوائے اس زمین کے اور کوئی زمین نہیں؟" فرمایا "بس ہم سے نیچے یہی ایک زمین ہے۔ باقی چھ زمینیں ہم سے اُوپر کی جانب میں واقع ہیں" *

مَیں کہتا ہوں۔ کہ جو شخص علم اور لغت سے واقف ہوگا۔ وہ ہرگز اس میں شک نہ کریگا۔ کہ یہ حدیث لفظ بلفظ ہماری بیان کی ہوئی سابق کی ترتیب پر منطبق ہے جس طرح کہ لفظ معنی پر منطبق ہوا کرتا ہے۔ اور اسم مسمّی پر یہ کلام بزبان فصیح اس امر کو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ

علم ہیئت جدید ہی صحیح ہے۔ اور قدیم علم ہیئۃ بالکل غلط اور فاسد تھا۔ کیونکہ یہ حدیث صاف لفظوں میں بتارہی ہے۔ کہ اس زمین سے اوپر چھ اور زمینیں ہیں۔ بلکہ وہ زمینیں آسمان سے بھی اوپر کی جانب واقع ہیں۔ جیساکہ حکمائے زمانہ حال قائل ہیں۔ اور یہ بات بالکل فلاسفہ قدیم کے اقوال کے خلاف ہے۔ (کیونکہ اُن کے ہاں آسمان سے اوپر کوئی چیز ممکن ہی نہیں۔ اگر کچھ ہے بھی۔ تو آسمان کے تحت میں ہے۔ نہ اُس سے اوپر کی جانب میں)۔ کیا کوئی عاقل آدمی گذشتہ زمانے میں اس جرأت کے ساتھ اس طرح کی باتیں کہہ سکتا تھا۔ جو بالکل خلاف بیانات حکمائے سابقین ہو۔ (اگر کہتا تو لوگ اس کو احمق بتاتے) مگر چونکہ یہ کلام معصوم کا ہے اور اسکی نسبت ہر شخص کا اعتقاد ہے کہ یہ صحیح ہے۔ لہذا ہمارے علما کو اس حدیث کے سمجھنے میں سخت تشویش اور تردد واقع ہوا ہے۔ اور اسکی شرح میں حیران رہے ہیں۔ (کہ کیا کہیں)۔ علامہ مجلسی رح نے اس حدیث کو نقل کرنیکے بعد فرمایا ہے "چونکہ یہ خبر حس اور مشاہدہ کے خلاف ہے۔ لہذا اسکی تاویل ممکن ہے۔" پھر ایک ایسی تاویل کی ہے۔ جو بالکل نادرست۔ غیر مناسب اور بعید از قیاس ہے۔ مگر علامہ سید نعمۃ اللہ جزائری نے انوار نعمانیہ میں فرمایا ہے "اس حدیث کا اشکال ظاہر ہے۔ اور تاویل بھی اسکی کوئی ایسی ممکن نہیں جس سے دیگر روایات اور آیات اور اقوال حکماء و ریاضیین (یونانی) پر منطبق ہو سکے۔ مگر اس وجہ سے اس حدیث کو رد کر دینا اور غلط کہنا بھی درست نہیں۔ بلکہ واجب ہے۔ کہ اسے مانا جائے۔ اور اس کے بیان کے سامنے سر تسلیم خم کیا جائے۔ اور کہا جائے۔ کہ یہ حدیث بھی منجملہ متشابہات ہے۔ جس کا واقفی علم سوائے معصوم ؑ کے اور کسی کو مشکل سے ہو سکتا ہے"۔ یہانتک سید ؒ کا کلام ہے۔ اور واقعی خواب رہے ہے۔ کہ یہ حدیث یقیناً قدیم حکما کے خیالات کے مخالف ہے۔ لیکن اسقدر آپکو اشتباہ ہو گیا۔ کہ اس حدیث کو روایات اور آیات قرآنیہ کے بھی خلاف بتادیا۔ (حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ جیساکہ ہمارے سابق بیانات سے بخوبی معلوم ہو چکا ہے)۔ اس اشتباہ کی صرف یہ وجہ ہے۔ کہ پوری تحقیق اور غور و فکر و کوشش سے سید رح نے کام نہیں لیا اور نیز یہ کہ اسوقت تک جدید فلسفہ کا کہیں نشان بھی نہ تھا جس سے اُنکو اس حدیث کے واقعی مطلب کے سمجھنے میں مدد ملتی۔ ورنہ وہ بھی اُسی طرح اس مطلب پر کامیاب ہوتے جس طرح بحمد اللہ میں کامیاب ہوا ہوں "وذلك فضل الله يؤتيه من يشاء"۔

اس حدیث شریف اور قول امیر المومنین ؑ کے علاوہ بھی میرے پاس ترتیب مذکور کی قوی دلیل موجود ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ اسلامی اخبار و روایات میں متواتر مذکور ہے۔ کہ ساتوں آسمان ایک دوسرے سے پانچ سو برس کی راہ کی دوری رکھتے ہیں یعنی ہر آسمان کو دوسرے آسمان سے اتنی بڑی مسافت کا فاصلہ ہے۔ اور اسی طرح زمینیں بھی ایک دوسرے سے پانچ سو برس کی راہ کا فاصلہ رکھتی ہیں۔ اور اگر اس مضمون

پرآپ غور کرینگے۔ تو ہماری ہی ترتیب کے مطابق پائینگے۔ (یعنی نظام شمسی کے)۔ کیونکہ "پانچ سو برس کی راہ"
کا مطلب صریح نہیں ہے۔ کہ اس سے کیا مقصود ہے۔ اس لئے کہ رفتار کی کمی بیشی اور حالات واوقات
واشخاص وآلات کے تفرقے سے راہ کی رفتاریں کمی وزیادتی کا ہونا یقین ہے۔ (مثلاً پچاس میل راہ کبھی
کوئی شخص گھوڑے پر سوار ہوکر دو روز میں طے کرسکتا ہے۔ اور کبھی پیدل چل کر چار روز میں۔ اسی مسافت
کو ایک بیمار آدمی ایک مہینے میں طے کریگا۔ اور ایک تندرست آدمی اس سے کم میں۔ گھوڑا بھی اگر بہت تیز
رفتار ہوگا۔ تو مثلاً دو ہی روز میں طے کریگا۔ اور اگر سست رفتار ہوگا۔ تو ممکن ہے کہ دس روز میں
تمام کرے۔ تو اب معلوم نہیں ہوسکتا کہ آئمہؑ اور رسول خداؐ نے پانچسو برس کی راہ سے کیا مراد لی ہے۔
اور کس کی رفتار کے اعتبار سے یہ تعداد مقرر فرمائی ہے۔ کیونکہ ممکن ہے۔ کہ یہ مسافت کسی کے
اعتبار سے پانچسو ہی برس میں طے ہو جائے۔ اور کسی دوسرے کے اعتبار سے ایک ہزار برس
میں۔ اور کسی تیسرے کے اعتبار سے دو ہزار برس یا اس سے کم و بیش میں) لیکن اقلاً اتنا ضرور
سمجھ میں آتا ہے۔ کہ جس قسم کا فاصلہ زمینوں کے درمیان میں ہے۔ اور جو وہاں مقصود ہے۔ وہی
فاصلہ آسمانوں کے درمیان میں بھی ہے۔ اور مطلب یہ ہے۔ کہ ایک زمین سے دوسری زمین تک
ویسا ہی فاصلہ ہے۔ جیسا فاصلہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان کو ہے۔ اور آئندہ اسکی تصریح
بھی دیگر روایات سے معلوم ہوگی +

اس تمہید کے بعد اب میں کہتا ہوں۔ کہ اگر یہ ساتوں زمینیں اپنے اپنے ابعاد معلومہ پر بانتظام
خاص قائم ہوں۔ اور اُن کے سماوات وہی کرۂ بخاریہ مانے جائیں جو اُن زمینوں کو محیط ہیں۔ تو ہر
زمین کو دوسری زمین سے تقریباً وہی فاصلہ ہوگا جو اُس کے آسمان کو دوسرے کے آسمان سے ہے۔
جیسا کہ اکثر روایات سے معلوم ہوا ہے۔ (دیکھو حاشیہ کی شکل کو)۔ اب اگر ہم تحقیقی نظر "پانچ سو
برس کی راہ" پر ڈالیں۔ تو یہ دلیل اور بھی قوی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اگر ہم مثلاً ایک گھوڑا ایسا فرض کریں
جو ایک گھنٹے میں ایک فرسخ (تین میل) راہ طے کرلیتا ہو۔ جیسا معلوم و معمول ہے۔ تو اس فرسخ کا نام مثلاً
ایک گھنٹہ ہوگا۔ (یعنی کہینگے۔ کہ ایک گھنٹے کی راہ۔ جس طرح کہ کہینگے ایک فرسخ کی راہ)۔ اس طور پر مجموعی فنا تک
اس گھوڑے کی ہر سال میں تقریباً نو ہزار فرسخ ہوئی۔ اور اگر اسی طرح پانچ سو برس چلتے رہنا تصور کریں۔
تو سولہ ملین میل سے زیادہ ہی ہوگا۔ (یعنی ایسی رفتار سے یہ گھوڑا پانچسو برس میں سولہ ہزار ملین میل
سے زیادہ طے کرلیگا)۔ اور یہی مقدار قریب قریب اُس تحدید کی ہے۔ جو متاخرین نے بیان کی ہے
اور جو فاصلہ باہمی سیارات کی زمینوں کا ان لوگوں نے لکھا ہے۔ اور علاوہ اس ہیئت جدیدہ کے

کرۂ …

۶ کرۂ زحل

۵ کرۂ مشتری

۴ کرۂ مریخ

۳ کرۂ عطارد

۲ کرۂ …

آسمان

۱ زمین

ہماری زمین

ہر ایک ان میں سے دائرہ ... دائرہ زمین کی صورت ہے۔ اور ... اُس کا آسمان سمجھو
مترجم ۱۲

کسی اور ہیئت سے ہرگز یہ بیان مطابق نہیں ہوسکتا۔ (لہذا معلوم ہوا کہ جو کچھ شریعت میں مذکور ہے۔ وہ بالکل مطابق ہے آج کل کی تحقیق سے۔ جس سے اس کی صحت اور اُس کا کمال علم اور وہبی ہونا۔ اور دین صادق ہونا ثابت ہوتا ہے) +

اس مقام پر ہم چند دلیلیں جو اس مطلب کو ثابت کرتی ہیں۔ ذکر کرتے ہیں۔ (منجملہ اُن کے ایک وہ روایت ہے۔ جسے بحار اور دُرِّ منثور میں تقریباً سات یا اس سے زیادہ کتابوں سے نقل کرکے وارد کیا ہے۔ یہ حدیث طولانی ہے۔ مگر اُس کا ایک ٹکڑہ یہ بھی ہے اِنَّ ما بین کل سمائین مسیرۃ خمسماۃ عام "ہر دو آسمانوں کے درمیان فاصلہ پانچ سو برس کا ہے" (دوسرے) فاضل نیشاپوری نے اپنی تفسیر میں من الارض مثلھن کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ "یہ سب کی سب سات زمینیں ہیں ہر ایک سے دوسرے کو پانچ سو برس کا فاصلہ ہے جیساکہ آسمان کے ذکر میں بیان فرمایا گیا ہے۔ اور ہر زمین میں ایک مخلوق آباد ہے" آگے چل کر کہا ہے۔ کہ "وہ لوگ یعنی اُن زمینوں کے رہنے والے اپنی جانب سے آسمان کو مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور نیر روشنی کو بھی اُسی طرف سے مشاہدہ کرتے ہیں"۔ (مطلب یہ ہے۔ کہ ہر زمین والے اپنے آسمان کو دیکھتے اور اپنے آفتاب کی روشنی سے فائدہ اُٹھاتے ہیں) ان اخیری لفظوں میں ہماری ترتیب پر ایک اور بھی دلیل نکلتی ہے۔ جو صاحبان نظر پر مخفی نہیں ہے۔ (تیسرے) نیز بحار اور درمنثور میں باسانید ابوذرؓ سے مروی ہے" قال کنا جلوسًا مع رسول اللہ صلعم وساق الخبر فی عدد السماوات الی ان قال حتی عدد رسول اللہ صلعم سبع سماوات بین کل سمائین مسیرۃ خمسماۃ عام"۔ پھر روایت کو لکھتے لکھتے اور زمین کے حالات بیان کرتے ہوئے کہا ہے "حتی عدد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سبع ارضین بین کل ارضین مسیرۃ خمسماۃ عام" اس کا مطلب بھی یہی ہے۔ کہ "جس طرح آسمانوں کے درمیان تقریباً سولہ کروڑ ملین میل کا فاصلہ ہے۔ اُسی طرح باہم زمینوں کے درمیان میں بھی ہے" (چوتھے) بحار میں ابن عباس صحابی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے۔ کہ "ہر زمین سے دوسری زمین تک پانچ سو برس کی راہ ہے۔ اور ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک پانچ سو برس کی راہ ہے"۔ (پانچویں) کتاب دائرۃ المعارف کے لغت "السماء" کے ذکر میں ہے۔ عن ابی ھریرۃ قال خرج رسول اللہ صلے اللہ

علیہ وآلہ وسلم علی اصحابہ وھم یتفکرون الخ؎ ابوہریرہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک مرتبہ اپنے اصحاب کے پاس سے ہوکر گذرے۔ دیکھا کہ سب لوگ فکر میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ پوچھا کیا سوچ رہے ہو؟ لوگوں نے عرض کی۔ خدائے تعالےٰ کی بابت فکر کر رہے ہیں۔ فرمایا کہ اُس کی مخلوقات میں فکر کرو۔ خود خالق میں اپنے فکر نہ لڑاؤ۔ کیونکہ اُسے کوئی فکر معلوم نہیں کرسکتی۔ اس بارہ میں غور کرو۔ کہ خدائے تعالےٰ نے سات آسمان پیدا کئے ہیں۔ اور سات زمینیں پیدا کی ہیں۔ کہ ہر زمین کے نیچے پانچ سو برس کا فاصلہ ہے۔ اور زمین وآسمان کے درمیان پانچ سو برس کا فاصلہ ہے۔ اور ہر آسمان کے نیچے پانچ سو برس کا فاصلہ ہے۔ اور ہر دو آسمانوں کے درمیان پانچ سو برس کا فاصلہ ہے۔ (یعنی اتنے دن کی مسافت ہے)۔ اور ساتویں آسمان میں ایک سمندر ہے۔ جس کی گہرائی ان سب کے مجموعے کے برابر ہے۔ اُس میں ایک فرشتہ کھڑا ہوا ہے۔ جس کا طول اس قدر ہے۔ کہ اس قدر پانی اُس کے ٹخنے سے زیادہ نہیں ہے +

(مَیں کہتا ہوں) کہ دنیا میں کوئی نظام اور ترتیب علم ہیئت ایسی نہ ملیگی۔ جس پر یہ ترتیب شرعی منطبق ہوسکے۔ اِلّا وہی ترتیب و نظام شمسی جس کو مَیں نے ذکر کیا ہے۔ (حضرتؐ نے) جو یہ ارشاد فرمایا ہے۔ کہ **ساتویں آسمان میں ایک سمندر ہے۔ جس کی گہرائی اِن سب کے مجموعے کے برابر ہے۔** اس کا مطلب وہی ہے۔ جس کی طرف مَیں نے مسئلہ تعدد زمین میں بیان کیا ہے۔ کہ فضا میں جو مادّہ لطیفہ اثیر یہ بھرا ہوا ہے۔ وہ اُس موج زن سمندر سے بہت ہی مشابہ ہے جس میں چھوٹی بڑی مچھلیاں تیرتی ہوں۔ اُسی سمندر کو اگر باعتبار سبعہ سیارات کے لیجئے۔ کہ اُسی کے اندر سے ہوکر ان کا گذر ہوتا ہے۔ تو سات حصہ ہوکر سات دریا بن جائینگے۔ اور اگر مجموعے کو ایک ہی متصل شے مانئے۔ تو وہ ایک ہی سمندر ہوگا۔ جس کی مسافت ساتوں زمینوں اور ساتوں آسمانوں کے برابر ہوگی۔ اور ممکن ہے۔ کہ اُس فرشتہ سے مراد جسے آپؐ نے اس سمندر میں کھڑا ہوا بتایا ہے وہ جوہر قدسی ہو جو اپنی قوت جذب سے اس نظام شمسی کا محافظ ہے۔ (چھٹے) قتادہ سے سبع

سماوات کی بابت مروی ہے۔ اُس نے کہا بعضھن فوق بعض بین کل سمائین

مسیرۃ خمسماۃ عام"۔ ایک آسمان دوسرے آسمان کے اُوپر ہے۔ اور ہر دو آسمانوں کے بیچ میں پانچ سو برس کی راہ کا فاصلہ ہے۔ (ساتویں) تفسیر ابی السعود بن محمد میں جو نویں صدی ہجری کے فاضلین میں سے ہے۔ من الارض مثلھن کی تفسیر میں لکھا ہے۔ کہ جمہور یعنی اکثر مفسرین اور محدثین کا اس پر اتفاق ہے۔ کہ ان زمینوں کی تعداد سات ہے۔ اور ایک دوسرے سے اُوپر واقع ہے۔ ہر دو زمینوں کے درمیان وہی فاصلہ ہے۔ جو ایک زمین کو آسمان سے فاصلہ ہے۔ اور ہر زمین میں خدا کی مخلوقات آباد ہیں۔ (میں کہتا ہوں) یہ الفاظ بھی صریح طور پر میری ہی رائے کی تائید کرتے ہیں۔ اور سوائے اِس رائے کے کسی اور رائے پر ہرگز منطبق نہیں +

نہایت تعجب ہوتا ہے محققین سے کہ کیونکر وہ اِن واضح اور صاف حدیثوں کے مضامین سے غافل رہے ہے۔ حالانکہ یہ روایتیں بلند آواز سے اور فصیح تقریر سے اُسی مطلب کو بیان کر رہی ہیں۔ جو بعینہٖ ہمارا خیال ہے۔ (آٹھویں) تفسیر قمی میں (سورۂ مریمؑ کی تفسیر میں) مذکور ہے۔ اور نیز بحار میں بسند صحیح امام ششم جناب صادقِ آلِ محمدؐ سے حضرت ادریس علیہ السّلام کی خبر میں مروی ہے۔ کہ اُنہوں نے ملک الموتؑ سے کہا۔ کہ چوتھے آسمان کی ضخامت پانچ سو برس کی راہ ہے۔ اور چوتھے آسمان سے تیسرے آسمان تک کی راہ پانچ سو برس کی راہ ہے۔ اور تیسرے آسمان سے دوسرے آسمان تک پانچ سو برس کی راہ ہے۔ اور ان کے درمیان کی مسافت بھی اسی قدر ہے۔" الخ +

اقول۔ یہ روایت بھی اُسی مطلب کو ظاہر کر رہی ہے جس کے ہم درپے ہیں۔ البتہ چوتھے آسمان کی ضخامت کو جو حضرتؑ نے بیان فرمایا ہے۔ اس کے سمجھنے میں کسی قدر تردّد ہے۔ مگر ممکن ہے کہ حضرتؑ کی مراد چوتھے آسمان سے مشتری کا کرہ بخار ہو۔ کیونکہ وہ بہ نسبت ہماری زمین کے چوتھا آسمان ہے۔ اور وہ بہت ہی غلیظ اور ثخن دار ہے۔ یا سماء سے خود کرہ مشتری مراد ہو کیونکہ ہم نے چند مرتبہ بیان کر دیا ہے۔ کہ کبھی کبھی خود ان سیارات کو بھی سماء کہتے ہیں۔ اور ظاہر ہے۔ کہ کرہ مشتری کا جرم اِس مقدار پر ہونا چاہئے اِس روایت میں بیان کیا گیا ہے کچھ

مستبعد نہیں ہے۔ کیونکہ زمین کا قطر (۸۰۰۰) میل کا ہے۔ اور مشتری کا قطر (۸۶۰۰۰) چھیاسی ہزار میل کا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے۔ کہ حضرت کی مراد مجموعۂ کرہ مشتری اور کرۂ بخار ہو۔ جس کی یہ مسافت و مقدار بیان فرمائی گئی ہے۔ واللہ اعلم +

خلاصہ اس مسئلہ کے نتائج کا یہ ہوا۔ کہ جن جدید رایوں پر اعتماد ہو سکتا ہے۔ وہ سب کے سب اس امر پر متفق ہیں + کہ چند سیارزمینیں اس فضاء خالی میں موجود ہیں۔ اور یہ کہ ہر ایک کے واسطے ایک کرۂ بخاریہ ہے۔ جو اُسے محیط ہے۔ اور ہمارے لئے کوئی شرعی یا عقلی مانع بھی اس وقت موجود نہیں ہے۔ کہ ہم ان ہی کرات کو سماوات و ارضین کہیں۔ مگر صریح دلیلیں مع اضافہ آیات قرآن مجید اور روایات صادقین اس امر پر دال ہیں۔ کہ اس عالم شمسی میں سات زمینین ہیں۔ اور ایک دوسرے سے منفصل اور ایک دوسرے سے اس قدر فاصلہ پر واقع ہیں کہ پانچ سو برس کی راہ کی دوری ان کے درمیان میں پائی جاتی ہے۔ اور یہ کہ سبع سماوات سے مراد یہی پانی کے بخارات ہیں۔ جو کرۂ ہوا اور زمین کو محیط ہیں۔ اور یہ کہ ساتوں آسمان اپنی اپنی زمینوں کے گرداگرد محیط ہیں۔ جیسا کہ علم ہیئت جدید میں ثابت ہوا ہے۔ تو آخر ہم کو کون مانع ہے اس امر سے کہ اس رائے کو اختیار کریں۔ اور ظواہر شرعیہ کو اس پر محمول کریں۔ باوجودیکہ اس میں اور بھی فوائد ہیں۔ مثلاً مشکل مشکل حدیثوں کا اس سے حل ہو جانا۔ اور متشابہ و دشوار آیتوں کا مطلب اس سے واضح ہونا۔ اور اس امر کا ثابت ہو جانا کہ ہرگز ہمارے نبی اُمّی حضرت محمد مصطفٰے احمد مجتبےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم قدیم فلاسفروں کی رائے کے ترجمان نہیں تھے۔ بلکہ اُن کے عقائد اور علوم میں بالکل اُن سے مخالف تھے۔ اُن کی تصدیق کرنے سے اپنی اُمّت کے لوگوں کو منع فرماتے تھے +

اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہے۔ کہ اس رائے کو اختیار کرنے میں شریعت اسلامیہ کی سچائی ظاہر ہوتی ہے۔ اور یہ کہ اس شریعت نے ان یورپین فلاسفروں سے بہت پہلے ایسے ایسے مخفی حقائق اور اسرار مکنونہ کو جن کے حاصل کرنے اور سمجھنے سے دیدہ ہائے سر اور دیدہ ہائے قلب دونوں ہی عاجز تھے۔ اور عقول و ادراکات

بالکل قاصر تھے۔ اپنے وہبی اور الٰہی علم کے ذریعہ سے بیان فرما دیا ہے۔ جنہیں ہزاروں کوششوں کے بعد ان فلاسفروں نے سمجھا ہے +

اب افسوس ہوتا ہے۔ کہ کس طرح بہت سے آثار اسلامیہ گمنام ہو گئے۔ اور بہت سے اقوال ہمارے حجج کرام اور ائمہ عظام کے ہمارے ہاتھوں سے جاتے رہے۔ کیونکہ حفاظ و ناقلین روایات نے بہت سی حدیثیں جو ان مضامین میں وارد تھیں۔ اپنی عقلوں سے دور اور اپنے ادراک سے باہر سمجھ کر اور اہل زمانہ کی ان مضامین سے نفرت دیکھ کر نقل ہی نہ کیا۔ بلکہ اکثر راویوں نے اس قسم کی حدیثوں کو اس خوف سے چھپا دیا۔ کہ مبادا جاہل لوگ ان ناقلین اور قائلین پر استہزاء نہ کریں۔ مگر الحمدللہ کہ بااینہمہ بھی ان احادیث و روایات کے اس قدر رشحات فیض جاری ہوئے۔ جن سے علوم کے کثیر باغ سیراب ہو گئے۔ والمنتہ للہ ولاولیائہ۔ پہلا حصہ اس کتاب کا تمام ہوا +

مصنف نے اس رسالہ کے پہلے حصہ کو ربیع الاول ۱۳۲۸ھ ہجری میں تمام کیا۔ اور مترجم حقیر کے ہاتھ پر یہ حصہ ۲۶ تاریخ ماہ شعبان ۱۳۲۹ھ ہجری کو خدائے تعالے و جل مجدہ کی مدد سے مترجم ہو کر اتمام کو پہنچا۔ والحمد للہ اولاً و آخراً و ظاہراً و باطناً والشکر لہ ابد الدھر +

عبداللہ الکریم محمد ہارون عفی عنہ
مقام حسین آباد شیخپورہ ضلع مونگیر

ترجمۂ کتاب

الهیئۃ والاسلام

حصۂ دوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

الحمد للہ علی احسانہ والصلوٰۃ علی نبیہ محمدؐ والہ واعوانہ + امابعد

یہ دُوسرا حصہ ترجمہ کتاب "الهیئۃ والاسلام" کا ہے۔ جو بفرمائش جلیل المأثر جمیل المفاخر حائز المناقب کابراً عن کابر الفاضل الخبیر والبارع النحریر مولوی فاضل و منشی فاضل جناب مولانا مولوی سید محمد سبطین صاحب دام فضلہ مدیر رسالہ البرہان کے اتمام کو پہنچایا گیا ہے خدا تعالےٰ مومنین اور طالبان حق کو اس سے منتفع فرمائے۔ اور نیازکیش مترجم کو جس کی غرض صرف حمایت مذہب حق اور صیانت حوزۂ اسلام اور اشاعت ملّت طاہرہ ہے۔ اس کے صلہ میں حسنِ خیر اور قرب ائمہ طاہرینؑ مرحمت کرے۔ وبہ نستعین وعلیہ نتوکل فی کل حین +

اتنا گزارش کرنا اور بھی ضروری ہے کہ اس حصّہ کے ترجمے میں اکثر مقامات پر حذف زوائد سے بھی کام لیا گیا ہے۔ کیونکہ مصنف علّامہ نے اپنی کتاب میں بسبب شدّت جوش کے اکثر مقام پر تطویل غیر مفید بھی کر دی ہے۔ اور بہت سی باتوں کو مکرر سہ کرر لکھا ہے۔ اور ایک

بات کو کئی کئی بار دُہرایا ہے۔ میں نے کئی مقام پر اُن زوائد کا ترجمہ چھوڑ دیا ہے۔ اگرچہ اب بھی بہت زیادہ طول ہے۔ اور تکرارات موجود ہیں۔ مگر اُن سب کا حذف کرنا اصل کتاب کو مبہم کر دیتا تھا اس وجہ سے رہنے دیا۔ نیز یہ کہ ترجمہ میں اوّل حصّہ کے اور نیز اس دُوسرے حصّہ کے لفظی ترجمہ کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ بلکہ محصّل مطالب کو بیشتر مقام پر درج کیا ہے۔ اور جہاں تک ہوسکا ہے مطالب کو واضح کیا ہے۔ ناظرین اس وجہ سے کہ اس کتاب میں ترجمہ لفظاً لفظاً نہ ملے۔ مترجم پر معترض نہ ہوں۔ نیز یہ بھی کہ مترجم اس کتاب کے تمام مضامین اور برائیوں کا ذمہ وار نہیں ہے۔ اہل نظر کو اصل کتاب کے مطالب سے بحث کرنی چاہئے۔ نہ مترجم سے۔ والسّلام +

(محمد ہارون عفر اللہ لہ)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آٹھواں مسئلہ

کیا آفتاب تمام حرکات اجرام فلکیہ کا مرکز ہے؟

کوپرنیکی علم ہیئت کے مطابق (جو سنہ ۱۵۴۳ء عیسوی سے بہت متاخر ہے) ثابت ہو گیا ہے۔ کہ آفتاب ایک مقام پر قائم ہے۔ اور باقی کواکب اُس کے گرد حرکت کرتے ہیں۔ اور اسی ذریعہ سے اُس کے تمام مجذوب سیّارات کی حرکتوں کا انتظام درست ہوتا ہے۔ اس صورت میں آفتاب مثل مرکز کے قرار پاتا ہے۔ اور ان تمام حرکات کا وسط ٹھیرتا ہے +

اب بتائیے۔ کہ آپ کی اسلامی شریعت کے مطابق جو بظاہر حرکت آفتاب کو بیان کرتی ہے یہ بیان کہاں تک صحیح سمجھے جانے کے قابل ہے؟

جواب

اس میں شک نہیں۔ کہ حکیم (کوپرنیک) اور اس سے متاخر حکمائے نے تمام متقدمین فلاسفروں سے اس معاملہ میں اختلاف رائے کیا ہے۔ اور اس بات کے قائل ہو گئے ہیں۔ کہ آفتاب ایک مقام پر مثل مرکز کے قائم ہے۔ اور دیگر کرات اس کے گرد حرکت کرتے ہیں۔ گویا آفتاب کی مثل ایسی ہے۔ جیسے بلا تشبیہ خانہ کعبہ جس کے گرد حجاج احرام سفیدی دائرے پر طواف کر رہے ہیں۔ اور قرص آفتاب کسی ایک گھن میں واقع ہوتا ہے (دیکھو نقشہ نمبر ۲)+

مگر یہ امر بھی معلوم رہنا چاہئے کہ ان متاخرین کی رائے اس باب میں صرف اسی قدر ہے۔ کہ آفتاب حرکت مکانی نہیں کرتا۔ اور گرد زمین کے نہیں پھرتا۔ باقی رہی حرکت وضعی یعنی اپنے محور کے گرد حرکت کرنی۔ اس کی مخالفت ان لوگوں نے نہیں کی ہے۔ بلکہ صاف کہتے ہیں۔ کہ آفتاب بحرکت وضعیہ اپنے مرکز کے گرد متحرک ہے۔ اور اس کی ایک حرکت انتقالیہ بھی ہے۔ لیکن نہ اس طرح۔ کہ گرد زمین کے چوبیس گھنٹے میں گردش کر جائے۔ باوجود اس کے تمام اجرام اس کے گرد گھومتے ہیں جس طرح زمین۔ کہ اس کے گرد چاند کی گردش ہوتی ہے۔ باایں ہمہ کہ زمین اپنے مرکز کے گرد بھی گھومتی ہے۔ اور آفتاب کے گرد بھی مع چاند کے گردش کرتی ہے۔ پس جس طرح کہ مثلاً چاند کی سطح پر رہنے والا شخص زمین کی سالانہ حرکت کو محسوس نہیں کر سکتا جب تک کسی دوسرے کرہ پر جا کر اسے محسوس نہ کرے۔ اسی طرح جو شخص کہ خود کرۂ آفتاب پر یا اس کے کسی منجذب کرے پر (جسے وہ اپنی طرف بقوۂ جاذبیہ کھینچ رہا ہے) ہو۔ وہ آفتاب کی انتقالی حرکت کو محسوس نہیں کر سکیگا۔ اس وجہ سے کہ اس وقت جاذب اور مجذوب یعنی آفتاب اور اس کے گرد پھرنے والے سیارے بحرکت واحدہ متحرک ہیں۔ ہاں اگر دیکھنے والا اس نظام شمسی سے الگ ہو کر کسی اور کرہ پر چلا جائے۔ تو اسے البتہ آسانی سے آفتاب کی حرکت انتقالیہ محسوس ہو سکیگی+

اچھا آئیے۔ اب ہم اپنے اصلی مقصد کی طرف آتے ہیں۔ متاخرین حکماء نے جو

ایک ہزار سنہ ہجری کے بعد ہوئے ہیں۔ آفتاب کے واسطے دو حرکتیں ثابت کی ہیں۔ (باوجودیکہ اس بات کے بھی قائل ہیں۔ کہ آفتاب دیگر سیارات کی حرکت کا مرکز ہے) - ایک حرکت اس کی تو حرکت وضعیہ ہے۔ جو خود اُس کے محور پر اپنے مرکز کے گرد ساڑھے پچیس روز میں تقریباً تمام ہوتی ہے۔ جیسے ان لوگوں نے ۱۶۱۰ء میں دریافت کیا ہے۔ اور آج کل سب کا اس پر اتفاق ہے *

اس حرکت کو اُن علامات ونشان وحرکت فلکیہ سے استنباط کیا گیا ہے۔ جو ایک ہی طریقے سے آفتاب میں پائی جاتی ہے۔ اور مدت مقررہ میں یہ حرکت مغرب سے مشرق کی طرف ہوتی ہے دوسری حرکت انتقالیہ ہے۔ جو اس فضائے وسیع میں مع تمام سیارات کے جو اس کے نظام کے اندر واقع ہیں ہوتی ہے۔ اس حرکت کی مثال بجنسہ ایسی ہے۔ جیسے کوئی ماں آگے آگے چلتی ہو۔ اور پیچھے پیچھے اُس کے بچے چلے جاتے ہوں۔ مگر کہیں اُن کے ٹھیرنے کو جگہ نہ ملتی ہو۔ (کیونکہ یہ حرکت کسی وقت ختم نہیں ہوتی) لیکن اب بحث یہ واقع ہے۔ کہ آیا یہ حرکت انتقالیہ مستطیل ہے یا مستدیر ہے؟ اور اس حرکت کا مرکز کیا ہے؟ اور کس جہت میں یہ حرکت واقع ہوتی ہے؟ جس کے ساتھ ساتھ دیگر سیارات گردش کرتے ہیں۔ (حدایق النجوم) میں لکھتے ہیں "ہمارا عالم شمسی ایک ستارے کی طرف چڑھ رہا ہے۔ جو دائیں ران میں جاثی علی رکبتہ (ایک شکل کا نام ہے۔ جو چند ستاروں سے مرکب ہے۔ جیسے اسد۔ ثور وغیرہ) کے واقع ہے۔ اور جو سطح معدل النہار (معدل النہار وہ دائرہ فلکیہ ہے۔ جو جنوباً وشمالاً آسمان کو دو حصّوں پر تقسیم کرتا ہے) میں پایا جاتا ہے۔ کتاب **مشہد الکائنات** میں قاموس القمامیس سے نقل کیا ہے۔ جو پیرس دار السلطنت فرانس میں طبع ہوئی ہے۔ کہ آفتاب کو ایک حرکت برابر افق میں ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ مجموعہ ستارہ ہر کل جارہ کی طرف مائل ہے۔ اور اُس کی ایک حرکت اپنے مرکز کے گرد بھی ہے۔ جیسے وہ (۲۵) دن (۵) گھڑی میں مشرق سے مغرب کی طرف ایک عمودی محور کے گرد جو فلک البروج میں ہے تمام کرتا ہے *

آیات بینات میں ہے۔ کہ آفتاب باتفاق جملہ علمائے ہیئت حال مع اپنے تمام توابع سیارات کے ایک نقطہ کی طرف جو جاثی میں واقع ہے بقدر ...۲۲ ہم میل کے فی روز حرکت کرتا ہے۔ بعضوں کا یہ بھی خیال ہے۔ کہ آفتاب مع اپنے پورے نظام کے ثریا کے ایک روشن ستارے کے گرد حرکت کرتا ہے۔ جسے اہل فرنگ (کیونی) کہتے ہیں۔ اور عرب اُسے عقد ثریا کے نام سے نامزد کرتے ہیں **مصری اخبار الہلال** کے صفحہ ۱۲۴ جلد ۱۱ میں ہے

کہ (استاد کمبل) مدیر رصد خانہ لیک واقع امریکا کا یہ خیال ہے کہ زمین آفتاب کے گرد حرکت کرتی ہے جیساکہ ہیئۃ کوبرنیک کا بیان ہے۔ مگر آفتاب ہمیشہ جنوب سے شمال کی طرف جارہا ہے۔ اور اُس کا سارا نظام اُس کی تبعیت میں چلا جاتا ہے۔ اس کی اس رفتار میں مدارات نہیں پیدا ہوتے۔ بلکہ منحنی خط مثل چلتے ہوئے سانپ کے پیدا ہوتا ہے۔ {دیکھو نقشہ نمبر ۲۔ اس میں (۱) آفتاب ہے۔ (۲) زمین ہے۔ (۳) خط رفتار آفتاب ہے۔ اور (۴) خط رفتار زمین ہے} +

استاد کمبل کا بیان ہے"۔ کہ اکثر اذہان میں یہ بات ہے۔ کہ آفتاب ایک خط منحنی پر چلا جارہا ہے۔ مگر ایک زمانہ کے بعد پھر اُسی مقام پر پہنچ جائیگا۔ جہاں سے چلا ہے۔ لیکن ممکن ہے۔ کہ خط مستقیم پر جارہا ہو جس طرح تُوپ کا گولہ جاتا ہے" +

جب یہ بات معلوم ہوگئی۔ کہ محققین حکمائے حال کی رائے یہ ہے۔ کہ آفتاب کی دو حرکتیں ہیں۔ ایک وضعیہ۔ دوسری انتقالیہ۔ تو ہم آپ سے یہ کہتے ہیں۔ کہ **شریعت اسلامیہ** صرف حرکتِ آفتاب کو بتاتی ہے۔ وضعیہ اور انتقالیہ کی تصریح نہیں کرتی۔ جس سے دونوں مطلب نکل سکتے ہیں۔ ممکن ہے۔ کہ اس حرکت سے حرکتِ یومیہ اُس کی مراد ہو۔ اور ممکن ہے۔ کہ حرکتِ سالانہ مراد ہو۔ جیساکہ متقدمین کا قول تھا۔ یا وہ حرکت وضعیہ و انتقالیہ مراد ہو۔ جسے متاخرین نے اختیار کیا ہے۔ بلکہ اگر آپ غور کرینگے۔ تو ہماری شریعت کے اقوال میں وہ باتیں ملینگی۔ جو آراء جدیدہ ہی سے موافقت رکھتی ہونگی +

منجملہ اُن ظواہر اقوال شریعت کے قرآن مجید کے سورۂ یٰسین کا یہ بیان ہے۔ کہ "کُلٌّ فِی فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ"۔ یہ ارشاد بعد ذکر کرنے آفتاب اور چاند۔ منازل اور زمین کے ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے۔ کہ "ہر ایک ان میں سے ایک فلک میں تیرتے ہیں"۔ (یعنی ایک ایک مدار پر متحرک ہیں)۔ ہم نے کئی جگہ پہلے لکھا ہے۔ کہ یہ آیت کسی طرح فلسفہ قدیمہ پر منطبق نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے کہ آیت تو یہ بتاتی ہے۔ کہ یہ کواکب فلک کے اندر حرکت کرتے ہیں۔ اور قدماء فلسفہ بالکل اس کے منکر تھے۔ کہ نفس فلک میں ان کی حرکت ہوسکتی ہے۔ کیونکہ وہ تو مرکوز ہونے کے قائل تھے جس کے لئے تحرک محال ہے۔ اسی وجہ سے قدماء علماء نے ظاہر الفاظ آیت کو مجاز کی طرف پھیرا ہے۔ اور کہا ہے۔ کہ اگرچہ اس آیت سے تحرک شمس و قمر وغیرہ سمجھ میں آتا ہے۔ مگر مراد اس سے فلک شمس و قمر کا متحرک ہونا ہے۔ نہ خود ان کا۔ جس طرح کہتے ہیں۔ کہ فلاں شخص کشتی میں جاتا ہے۔ حالانکہ جانے والی

گشتی ہے نہ کہ آدمی۔ مگر مجازاً سوار ہوتا ہے ایسے کو چاند ہوا لا بتاتے ہیں +

لیکن ہم متاخرین کو اس مجاز کے ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور نہ کسی تاویل کی حاجت ہے۔ بلکہ ظاہر آیت کو ہم ٹھیک سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ آیت نے اُسی مطلب کو بیان کیا ہے۔ جسے آج کل کی ہیئت نے بیان کیا ہے۔ کہ خود آفتاب و ماہتاب و منازل و ارض متحرک ہیں۔ اور بحرکت انتقالیہ اپنے اپنے فلک مخصوص میں حرکت کرتے ہیں۔ غایۃ الامر یہ ہے۔ کہ ابھی فلک کا مرکز اعلیٰ معلوم نہیں ہے۔ مگر باقی افلاک آفتاب کو محیط ہیں +

(دوسری) سورۂ یٰسین میں ہے۔ "والشمس تجری لمستقر لھا ذالک تقدیر العزیز العلیم" یعنی آفتاب اپنی مستقر پر یا اپنی مستقر کی طرف حرکت کر رہا ہے۔ یوں ہی خدائے عزیز علیم نے اُس کے واسطے معین کیا ہے۔ قدماء نے تو اس حرکت سے اُس کی طلوعی اور غروبی حرکت مراد لی ہے۔ اور اُسے چوبیس گھنٹے میں گرد زمین کے پھرنے والا بتایا ہے۔ مگر (المستقر) کی تفسیر میں گھبرا گئے ہیں۔ کبھی تو لام کو الیٰ کے معنی میں لیا ہے۔ اور مستقر کی تعبیر بروج سے کی ہے۔ یعنی آفتاب جس برج سے چلتا ہے۔ اُسی برج کی طرف پھر پلٹ کر آجاتا ہے۔ اور کبھی لام کو فی کے معنی میں لیا ہے۔ اور مستقر سے مراد اُس کا فلک لیا ہے۔ لیکن میرے نزدیک دونو تفسیریں قابل نظر ہیں +

(پہلی تفسیر) میں تو اس وجہ سے نظر ہے۔ کہ اگر (مستقر) سے مراد برج ہو۔ جس کی طرف وہ واپس آتا ہے۔ اور لام بمعنی الیٰ ہو۔ تو لازم آتا ہے۔ کہ آفتاب جب وہاں پہنچ لے۔ تو ساکن ہو جائے۔ حالانکہ یہ بات لغو ہے۔ اور ناممکن ہے۔ سبب لزوم یہ ہے۔ کہ جب آفتاب ایک جگہ سے چلا۔ اور بتایا گیا۔ کہ فلاں جگہ تک جائیگا۔ اس کے معنی یہی ہیں۔ کہ وہاں تک اس کی مسافت ختم ہو جائیگی۔ جس کے بعد اُسے سکون ہوگا۔ کیونکہ اُس کے بعد کا حال بیان نہیں کیا گیا۔ اور قرآن نے یہ نہیں کہا۔ کہ مستقر پر پہنچنے کے بعد پھر بھی دوبارہ حرکت شروع کریگا۔ لہٰذا معلوم ہوا۔ کہ چاہئے۔ کہ برج حمل سے چل کر جب پھر برج حمل میں آجائے۔ تو دوبارہ حرکت نہ کرے۔ حالانکہ آپ ایسے نہیں مانتے +

(دوسری تفسیر) میں اس وجہ سے نظر ہے۔ کہ اگر (مستقر) سے مراد فلک ہو۔ اور لام بمعنی فی ہو۔ تو یہ معنی ہونگے۔ کہ آفتاب آسمان میں چلتا ہے۔ حالانکہ یہ بھی آپ کی رائے کے بموجب ناممکن ہے۔ کیونکہ آسمان آپ کے نزدیک ایک دبیز جسم ہے۔ جس

ہیں کوئی رستہ نہیں بنا ہے مگر آفتاب اُن میں سے چلے۔ نیز یہ کہ آفتاب کو آپ اُس میں جڑا ہوا بتاتے ہیں +

اور اگر ہم فلسفہ جدیدہ کے مطابق اس آیت کو کہیں۔ تو کوئی بھی اعتراض لازم نہیں آتا۔ اور نہ کوئی خرابی۔ اس لئے کہ ہم نے کوئی آسمان ایسا نہیں مانا ہے۔ جو جڑا ہوا ہو جس کے اندر کسی دوسرے جسم کا چلنا ناممکن ہو۔ بلکہ ہمارے نزدیک آفتاب فضا میں اپنے مرکز پر ہے۔ اور فضا ہی میں حرکت انتقالیہ کرتا ہے۔ مستقر کے معنی اس وقت میں زمانہ استقرار کے ہونگے۔ یعنی ایک وقت مقرر تک یوں ہی آفتاب چلتا رہیگا جب تک حکم خدا اس کے سکون کی بابت نہ ہوگا۔ اور قیامت نہ آئیگی +

علامہ سید محمد حسین شہرستانی کربلائی نے مستقر کے معنی محل قرار کے بتلائے ہیں۔ اور لام کو بمعنی فی بتایا ہے۔ اس سے وہ آفتاب کی حرکت وضعیہ کو ثابت کرتے ہیں۔ یعنی آیت کے یہ معنی ہیں۔ کہ آفتاب اپنے محل پر حرکت وضعیہ کرتا ہے۔ اور ذلک تقدیر العزیز العلیم سے اشارہ اس باب کی طرف بتاتے ہیں۔ کہ یہ صنعت خدائے تعالےٰ عزیز و علیم کی ایسی لطیف ہے۔ جیسے اُس کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ بہر صورت ان دونوں خیال سے آیت مذکورہ کا انطباق جدید فلسفہ پر ہوتا ہے نہ کہ قدیم فلسفہ پر۔ یہ تو اُس صورت میں ہے جب کہ متداول و مشہور قرأت کی بنا پر اس آیت کو پڑھیں یعنی عاصم اور حفص کی قرأت کی مطابقت کریں۔ لیکن اگر اسے آل محمد کے ائمہ طاہرین اور نواب رسول خدا کی قرأت کے مطابق پڑھیں۔ تو پھر کوئی تامل رہتا ہی نہیں۔ ہمارے معصومین علیہم السلام نے اس کو یوں پڑھا ہے۔ والشمس تجری لا مستقر لہا یعنی آفتاب برابر چلا جاتا ہے کبھی ٹھیرتا ہی نہیں۔ جس سے صاف حرکت انتقالیہ آفتاب کی ثابت ہوگی۔ جو مطابق ہے فلسفہ جدیدہ ہے۔ اس قرأت کو مفسرین نے امیر المومنین علیؑ بن ابی طالبؑ سے اور اُن کے پوتے امام زین العابدین علیہ السلام سے نیز امام محمد باقر علیہ السلام جعفر صادق علیہ السلام ابن عباس عکرمہ اور عطا وغیرہ سے روایت کیا ہے۔ (دیکھو کتب تفاسیر) +

(تیسری) سورۂ ابراہیم میں ہے۔ وسخر لکم الشمس والقمر دائبین "تمہارے واسطے خدا نے آفتاب و ماہتاب کو مسخر کیا۔ جو برابر چل رہے ہیں"۔ اس آیت میں بھی خود آفتاب و ماہتاب کے چلنے کو بتایا ہے۔ نہ کہ اُن کے افلاک کے چلنے کو۔ اور اس بات کا قائل فلسفہ

جدیدہ ہی ہے نہ قدیمہ۔ اسی وجہ سے قدما اس آیت کی تاویل کرتے تھے کہ مراد اس سے فلک الشمس وفلک القمر ہے۔ حالانکہ جب ایک بات بلاتاویل صحیح ہو۔ توتاویل کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ اگر یہ امر ثابت نہ ہوتا۔ کہ آفتاب خود ہی انتقالیہ اور وضعیہ حرکت کرتا ہے۔ تو البتہ اس تاویل کی گنجائش تھی۔ اب کہ ثابت ہے۔ تو ہم آیت کو اس معنی کا سمجھانے والا کیوں نہ لیں۔ اور کیوں نہ کہیں۔ کہ اس آج کے سبق کو تیرہ سو برس پہلے خدائے تعالےٰ نے ہم کو پڑھایا تھا۔ مگر اس وقت ہم بسبب کم معرفت ہونے کے سمجھے نہیں۔ آج جو کسی قدر معرفت زیادہ ہوئی۔ تو سمجھے۔ کہ ہمارا معبود کیا فرماتا ہے۔ اس آیت میں اگرچہ دونوں حرکتوں کا احتمال ہے۔ لیکن حرکت وضعیہ زیادہ قرین قیاس ہے۔ کیونکہ تسخیر کا لفظ پورے طور پر اسی وقت صادق آئیگا۔

اگر یہاں آپ یہ اعتراض کریں ۔کہ آیت مذکورہ تو خدائے تعالےٰ کی نعمتوں کو بیان کررہی ہے۔ چاہئے کہ اس میں کسی نعمت کا ذکر ہو۔ اور نعمت ہونا آفتاب کی حرکت کا اسی وقت سمجھ میں آئیگا۔ جبکہ اس کی حرکت یومیہ غروبی اور طلوعی مراد لی جائے۔ کیونکہ اسی سے شب وروز بنتے ہیں۔ اسی سے سال وماہ کی ترکیب ہوتی ہے۔ اسی سے اور بہت سے فوائد خلق اللہ کو پہنچتے ہیں۔ اور اگر حرکت وضعیہ یا انتقالیہ مراد ہوگی جیساکہ تم کہتے ہو۔ تو اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اور آیت بےمعنی ہو جائیگی۔

تو ہم اس کا جواب یہ دینگے ۔کہ آپ جدید فلاسفروں کی کتابوں کو پڑھیں تو معلوم ہو سکے۔ کہ اپنے مرکز کے گرد آفتاب کے گردش کرنے سے کس قدر فوائد پیدا ہوتے ہیں۔ چونکہ کرۂ شمس کے سطوح یکساں نہیں ہیں۔ بلکہ مختلف حالتیں رکھتی ہیں۔ بعض سطحوں پر کلف ہے۔ بعض پر سیاہ دھبے ہیں۔ جن میں سے بعض بعض کا قطر پچاس ہزار فرسخ کا ہے۔ بعض سطحوں میں بڑے بڑے مشعل رنگین رنگین اور آگ کے شعلے ہیں۔ اور چنگاریاں ہیں جو اس کے مگنشیائی اجزاء کے جلنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ جیسے ان حکماء نے اس کے مختلف دوروں میں دیکھا ہے۔ جبکہ وہ رخ زمین کی طرف ہوا ہے۔ تو اس کی تاثیریں بھی عجیب غریب پائی ہیں۔ مثلاً کبھی شفق پر ان کا اثر دیکھا ہے۔ اور کبھی فضاء پر کبھی ظواہر کہربائیہ پر۔ اور کبھی مقناطیسی سوئیوں پر۔ جو ایسے وقت میں مضطرب الحرکت ہوجاتی اور قطب سے سمت منحرف اور یہ اختلاف وانحراف بسبب اختلاف کلف آفتابی کے ہوتا ہے۔ بلکہ اکثر مینہ کا برسنا

اُسی وقت ہوتا ہے۔ جبکہ کوئی رُخ آفتاب کا کلف دار اس طرف کو ہوتا ہے۔ اور جب کوئی چھوٹے کلف والا رُخ اس طرف ہوتا ہے۔ تو کم بارش ہوتی ہے جیسا کہ (مسٹر فاندیک) نے اس کی تصریح کی ہے۔ اور مِس (الیزا افرٹ) نے اپنی کتاب مختصر الہیئۃ میں ہرشل سے اس بات کو نقل کیا ہے۔ کہ آفتابی کلف زمین کی فصلوں میں بہت مؤثر ہیں۔ کبھی قحط اور کبھی ارزانی اسی وجہ سے ہُوا کرتی ہے۔ اس کے بعد مِس مذکورہ نے لکھا ہے۔ کہ "ہم نے جہاں تک ابھی سمجھا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب کبھی زیادہ کلف والا رُخ آفتاب کا زمین کی طرف ہوتا ہے۔ تو اُن اقالیم میں جو خط استوا سے قریب ہیں بارش زیادہ ہوتی ہے۔" (میں کہتا ہوں)۔ اس کے علاوہ بھی تاثیرات اس حرکت وضعیہ کی ہیں۔ مثلاً حرارت یا برودت کا بڑھ جانا خصوصاً استوائی اقلیموں میں۔ پس ممکن ہے۔ کہ پروردگار عالم نے تسخیرِ آفتاب اس رفتار وضعی پر ان ہی فوائد کی نظر سے کی ہو +

اسی رائے سے ایک رائے کا مجھے بھی موقع ملا ہے۔ اور وہ یہ کہ دیگر زمینوں کی حرکات مغرب سے مشرق کی طرف جو ہوتی ہیں۔ اُن کا سبب بھی آفتاب کی حرکت وضعیہ ہے یعنی چونکہ وہ بھی بحرکت وضعیہ مغرب سے مشرق کی طرف متحرک ہے۔ اس وجہ سے اُس کی نباتات تابعہ بھی اُسی رُخ پر متحرک ہیں۔ یہاں اس مطلب کی تفصیل مقصود نہیں ہے۔ بلکہ صرف اسقدر بتاتا ہے کہ آفتاب کی حرکت وضعیہ کا یہ بھی اثر ہے۔ کہ زمینوں کی حرکتیں بھی اسی پر مبنی ہیں۔ جس سے ماہ و سال اور فصول پیدا ہوتے ہیں۔ پھر جو فائدے آپ بیان کرتے تھے۔ وہی اس صورت میں بھی حاصل ہیں۔ اب اعتراض کیا رہا +

(**چوتھے**) امیر المومنین علیہ السلام کا قول حضرتؑ کے ایک خطبے میں "والجو المکفوف الذی جعلتہ مغیضا للیل والنھار و مجری للشمس والقمر" اس کلام میں مجری شمس و قمر جو یعنی فضا کو بتایا ہے۔ جس سے خود آفتاب و ماہتاب کی حرکت معلوم ہوتی ہے۔ نہ کہ اُس کے فلک کی۔ اس کلام کا شروع یعنی مغیضا اللیل والنہار بھی بتاتا ہے۔ کہ رات اور دن کا ظہور ظلمت اور نور کے تحرک سے ہوتا ہے۔ کیونکہ "رات" ظل زمین کا نام ہے۔ جو زمین کی حرکت من المشرق الی المغرب کی وجہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور دن حقیقت میں اس آفتابی روشنی کو کہتے ہیں۔ جو مشرق زمین سے نکلتا اور مغرب زمین میں غائب ہو جاتا ہے۔ الجو مغیضہما کے معنی یہ ہیں۔ کہ وہ نور اور وہ ظل دونوں ہی اس فضا میں غائب ہو جاتے ہیں۔

اس غیبت کو ظلمت اور ظہور کو نور کی طرف جو حضرت ؑ نے نسبت دی ہے۔ اس سے اس بات کو ظاہر کیا ہے۔ کہ لیل و نہار کی حرکت ظلمت اور نور کی وجہ سے ہے جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آفتاب کا ایک جگہ پر قائم رہنا اس کے لئے مضر نہیں ہے۔ کیونکہ ظلمت اور نور کا وجود حرکت زمین سے ہو جاتا ہے۔ پس گویا معصوم ؑ نے پہلے کلام سے اس مطلب کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ آفتاب کو رات اور دن کے پیدا کرنے میں کوئی دخل نہیں ہے۔ پھر آفتاب کی حرکت کو مستقلاً ظاہر فرمایا کہ وہ اس فضائے وسیع میں اپنی تیز رفتار سے متحرک ہے۔ (دیکھو چودھویں دلیل مسئلہ حقیقت فلک میں) +

قرآن مجید میں اور کئی آیتیں ہیں جن سے آفتاب کا سیارات کے لئے مرکز ہونا سمجھ میں آتا ہے۔ (اول) سورۂ والشمس میں خدائے تعالے فرماتا ہے "والشمس وضحٰها والقمر اذا تلٰها۔" اس آیت میں خدائے تعالےٰ نے بتایا ہے۔ کہ ماہتاب اپنی حرکت میں آفتاب کا تابع ہے۔ اور آفتاب کی حرکت کو بالکل نہ کہا جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ماہتاب تو گردش کرتا ہے مگر وہ (آفتاب) اس کے گرد متحرک نہیں ہے۔ اور صرف آفتاب کی بڑی صفت بیان کر دی۔ یعنی اس کی شعاع۔ پس اگر آفتاب کی یہ حرکت جو فلسفہ قدیمہ میں بتائی جاتی ہے اظہر اوصاف میں سے اس کے ہوتی۔ تو چاہئے تھا کہ خدائے تعالےٰ نے جس طرح ضحٰی یعنی اس کی روشنی کو جو اس کے اظہر اوصاف میں سے تھی بیان کیا۔ اس کے تحرک کو بیان کرتا لیکن بجائے اس کے چاند کی حرکت کو بیان فرمایا جس سے معلوم ہوا کہ آفتاب اس اعتبار سے ساکن ہے۔ اور چاند اس کے گرد گردش کرتا ہے +

دوسرے سورۂ یٰسین میں فرمایا ہے "لا الشمس ینبغی لها ان تدرک القمر" آفتاب سے ممکن نہیں ہے۔ کہ وہ چاند کو پالے"۔ **علامہ محمد حسین شہرستانی مرعشی** رحمہ اللہ نے اس آیت کا اور تیسری آیت کا انطباق نظام شمسی پر کیا ہے۔ اور دکھایا ہے۔ کہ آیت بتاتی ہے۔ کہ آفتاب مرکز حرکات ہے۔ اور وہ خود ان کے گرد متحرک نہیں ہے۔ اور چاند چونکہ اس کے گرد حرکت کرتا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ کلام صحیح ہے کہ "لا الشمس ینبغی لها ان تدرک القمر" کیونکہ آفتاب ٹھیرا ہوا ہے ایک مرکز پر۔ کیونکر چاند کو پا سکتا ہے۔ (میں کہتا ہوں) کہ جب ادراک کے معنی آگے گئی ہوئی چیز کو پا لینے اور چھو لینے کے ہیں۔ اور آفتاب اپنی سیر انتقالی میں مع تمام سیارات کے (۱۴) میل فی سکنڈ حرکت کرتا ہے۔

اور قمر اپنی سیر انتقالیہ میں زمین کے ساتھ ہیں میل فی سکنڈ حرکت کرتا ہے تو فلسفہ جدیدہ کی رُو سے بھی آفتاب کبھی چاند کو نہیں پا سکتا۔ کیونکہ اُس کی حرکت تیز ہے۔ اور اس کی شست ہ

(مؤلف ہبۃ الدین کہتا ہے) میری رائے یہ ہے۔ کہ اس آیت سے آفتاب کی حرکت انتقالیہ ثابت ہوتی ہے۔ اور آیۂ والشمس تجری لمستقر لھا سے حرکت وضعیہ۔ پس سورۂ یٰسین دونوں ہی حرکتوں کو بتا رہا ہے۔ وھو المطلوب ہ

تیسری آیت - سورۂ یونس میں خدائے تعالےٰ نے فرمایا ہے۔ ھو الذی جعل الشمس ضیاءً و القمر نوراً و قدرہ منازل ۔ "وہ ایسا معبود ہے جس نے آفتاب کو ضیا بنایا۔ اور قمر کو نور۔ اور اس کے واسطے منزلیں قرار دیں" پہلے تو پروردگار عالم نے شمس کے واسطے ضو ثابت کی۔ پھر چاند کے واسطے نور۔ اس کے بعد چاند کا منزل بمنزل حرکت کرنا بتایا۔ آفتاب کی حرکت کا کچھ ذکر نہ کیا۔ اب میں کہتا ہوں کہ اگر آفتاب بھی برج در برج حرکت کرتا پھرتا۔ جیسا کہ قدماء فلاسفہ کی رائے ہے۔ تو چاہئے تھا۔ کہ پروردگار عالم اسے بھی ضرور ذکر فرماتا۔ کیونکہ اس کے بعد جو سنین اور حساب کے معلوم ہونے کا اس کو سبب بتایا ہے۔ وہ اس کے زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ بنا بریان قدیم حرکت آفتاب سے روز و شب اور سال و ماہ کا حساب درست ہوتا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ آفتاب اُس حرکت سے متحرک ہی نہیں ہے پس خدائے تعالےٰ فرماتا کیسے اور بیان کیا کرتا؟

اس مقام پر بعض اُن دلائل سے بھی تعرض ضروری ہے۔ جن سے نظام قدیم کی صحت پر استدلال کیا جاتا ہے۔ (منجملہ اُس کے روضہ کافی اور وافی تفسیر قمی اور بحار الانوار میں بسند ہائے قوی اصبغ بن نباتہ سے مروی ہے۔ کہ امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے فرمایا "آفتاب کے تین سو ساٹھ برج ہیں۔ ہر برج ان میں سے مثل ایک جزیرہ کے ہے جزائر عرب سے ہر روز آفتاب ایک برج پر اُترتا ہے"۔

اس حدیث کو مجمع البحرین میں رسول اللہ صلعم سے بھی روایت کیا ہے۔ اور ہمارے قدماء علماء نے اس کی تفسیر و شرح بنا بر فلسفہ قدیمہ کے کی ہے۔ کہ برج سے مراد دائرۂ آسمان کا ایک درجہ ہے۔ نہ برج بمعنی اصطلاحی یعنی بارھواں حصہ آسمان کا۔ اور جب یہ معنی ہونگے۔ تو حدیث کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ آفتاب ہر روز اُس دائرہ کا ایک درجہ تین سو ساٹھ درجوں میں سے

طے کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آفتاب متحرک ہے۔ اور زمین ساکن ہے (اس کا جواب) یہ ہے۔ کہ اسی حدیث میں چند شواہد موجود ہیں جن سے یہ تفسیر غلط ثابت ہوتی ہے۔ (اولاً) یہ کہ آفتاب کے دائرہ کا ایک درجہ خواہ باعتبار فلک البروج کے لو یا باعتبار فلک شمس کے قدماء کی رائے بموجب تو خود زمین کے کرہ سے کئی گنا بڑا ہے۔ چہ جائیکہ عرب کا جزیرہ جو کرہ زمین کے ہزارویں حصے کے برابر بھی نہ ہوگا۔ پھر کیونکر معصوم کا یہ ارشاد صحیح ہوگا کہ ہر برج اس کا مثل عرب کے ایک جزیرے کے ہے۔ کیونکہ جزیرۂ عرب تو کل زمین کے مقابلے میں نہایت قلیل غیر محسوس جزو ہے۔ اور اُس دائرہ کا ایک درجہ لاکھوں درجہ اُس سے بڑا ہے۔ تو مثل کیونکر ہُوا +

(ثانیاً) یہ کہ آفتاب ہمیشہ ایک ہی درجہ پر اس دائرہ کے نہیں واقع ہوتا۔ بلکہ اس کا وقوع نہایت مختلف ہے۔ کبھی ایک درجے سے کم طے کرتا ہے۔ اور کبھی ایک درجے سے زیادہ۔ جیساکہ آپ کا فلسفہ بتاتا ہے۔ تو کیونکر حضرتؑ کا یہ ارشاد صحیح ہوگا کہ ہر درجہ میں ایک روز آفتاب آتا ہے +

(ثالثاً) یہ کہ شمسی سال تین سو ساٹھ دن سے کئی دن زیادہ بھی ہوتا ہے۔ حالانکہ اگر حضرتؑ کے کلام کا مقصود اسی کا بیان کرنا ہوتا تو چاہئے تھا کہ سال کے دن ہمیشہ تین سو ساٹھ ہی دن کے ہوتے۔ نہ کم نہ بیش۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ نیز یہ کہ بعض روایات بحار وغیرہ میں ابن عباسؓ سے یہ بھی مروی ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ آفتاب کے واسطے (۱۸۰) منزلیں ہیں۔ (۱۸۰) دن میں اُن سب کو تمام کرتا ہے۔ پھر دوبارہ ایک ایک کرکے اُن سب میں عود کرتا ہے۔ اور اسی کے مجموعے کا نام سال ہے۔ اس حدیث کا ظاہر اور حدیث سابق کا ظاہر دونوں ہی ایک انداز پر واقع ہوئے ہیں۔ اور ایک ہی مضمون کو بیان کر رہی ہیں۔ کیونکہ منزل یا برج دونوں ہی سے ایک مراد ہے۔ مگر فلسفہ قدیم پر اس حدیث کو محمول کرنے سے پہلی حدیث سے بھی زیادہ اشکالات پیدا ہونگے۔ مثلاً یہ کہ آفتاب کی منزلیں سال بھر میں دو مرتبہ متکرر ہوتی ہیں۔ حالانکہ سوائے ایک مرتبہ کے دوسری مرتبہ اندر سال کے ایک منزل میں آفتاب دوبار نہیں آتا۔ اگر آتا ہے۔ تو (۳۶۰) دن کے بعد۔ نہ (۱۸۰) دن کے بعد۔ نیز پہلی حدیث بتاتی ہے۔ کہ ہر منزل میں ایک روز قیام کرتا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سال میں دو روز

ایک منزل میں اُس کا قیام ہوتا ہے۔

لہٰذا ہر اس حدیث اور نیز حدیث سابق کا انطباق فلسفہ جدیدہ پر ہوتا ہے۔ جبکہ زمین کی حرکت میلیہ کو صحیح مان لیا جائے۔ جیسا کہ آج کل مسلم ہے۔ اور وہ یوں کہ زمین اپنے محور استوائی کے میل کی جہت سے اپنی سالانہ حرکت میں جنوب سے شمال کی طرف (۱۸۰) دن میں جاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اور پھر (۱۸۰) ہی دن میں شمال سے جنوب کی طرف اس کے صفحات پلٹتے ہیں۔ جس کا مجموعہ (۳۶۰) دن ہوتا ہے۔ لیکن اس بنا پر برج اور منزل کے وہ معنی مصطلح مراد نہیں ہونگے۔ جو قدماء نے مانے ہیں۔ بلکہ مطلق محل اور موقع مراد ہوگا یعنی زمین کے کچھ قطع دائرے نصف النہار سے ایسے ہونگے۔ جن پر ہر روز آفتاب پڑتا ہے۔ اور جس کی وجہ سے ایک دن شمار ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ بروج بروج فلکیہ نہ ہونگے۔ بلکہ سطح ارض کے حصص مراد ہونگے۔ جن پر آفتاب کی روشنی پڑتی ہے۔ اور یہ بات معلوم ہے۔ کہ اتنی مقدار سطح زمین کی جس پر آفتاب کی روشنی اپنے میل جنوبی و شمالی میں پڑتی ہے۔ وہ تقریباً (۴۷) درجہ اصطلاحیہ کے بقدر ہے۔ اور ایک درجہ بیس فرسخ سے زیادہ قدماء کی رائے میں ہے۔ اور قریب اٹھارہ فرسخ کے متاخرین کے نزدیک۔ لہٰذا دونوں میل جنوبی و شمالی کے مجموعے کے درمیان کی مسافت بہر تقدیر (۸۰۰) فرسخ سے زیادہ ہوگی پس جبکہ ہم ان منازل آفتاب کو جو ہر روز مقابل آفتاب واقع ہوتی ہیں۔ اُس خط پر فرض کریں۔ جو دونوں میلوں کے درمیان ہے۔ اور اُس کا عدد (۱۸۰) فرض کرلیں۔ جیسا کہ حدیث نے تصریح کی ہے۔ تو ہمیں لازم ہوگا۔ کہ (۸۰۰) کے عدد کو (۱۸۰) قطعے پر تقسیم کریں۔ تو ہر قطعہ زمین کا حصہ جس پر آفتاب نزول کرتا ہے۔ یعنی اُس کی روشنی پڑتی ہے۔ ایک دن میں تقریباً پانچ فرسخ ہوگا۔ اس بنا پر پہلا اشکال تو رفع ہو جائیگا۔ **وکل برج منها مثل جزیرة** پر پڑا۔ اور اس تحدید پر منطبق ہو جائیگا۔ کیونکہ زمانہ گذشتہ کے جزائر عرب جو **جزیرہ العرب** کے اندر واقع تھے قطعاً اُن کی نگاہوں میں بہت بڑے نہ تھے۔ اس وجہ سے کہ قدماء کی نگاہیں قاصر تھیں۔ اور پوری پیمائش اُن کی نظر میں نہ تھی بہ خلاف متاخرین کے کہ ان کی نظر میں زمین کا مجمل و مفصل حال سب واضح ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہے۔ کہ جزیرہ کا لفظ وہ لوگ اُس زمانے میں اُسی حصہ پر بولتے تھے۔ جو پانی سے گھرا ہوا ہوتا تھا جس کا طول ایک جریب سے لیکر دس فرسخ تک ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے ہماری یہ تحدید بالکل درست ہو جائیگی۔ اور وہ دو

دوسرے اشکال بھی اس بنا پر مرتفع ہو جائینگے +

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب کے لئے اُس کے میل کی حالت میں (۱۸۰) منزلیں زمین کی پڑتی ہیں۔ اس اعتبار سے کہ اُس کا نور اتنے حصوں پر زمین کے واقع ہوتا ہے۔ تو اس بنا پر آفتاب کا نور ہر روز زمین کے ایک خاص قطعہ پر جو تقریبًا پانچ فرسخ کا ہوتا ہے پڑتا ہے۔ جو عرب کے جزائر میں سے ایک جزیرہ کے برابر ہو سکتا ہے۔ اور علیٰ ہٰذا القیاس نصف سال تک اسی طرح کا مقابلہ واقع ہوتا رہتا ہے پھر آفتاب اُنھیں منازل کی طرف جنھیں وہ قطع کر چکا ہے۔ ایک ایک کر کے عود کرتا ہے۔ یہاں تک کہ تین سو ساٹھ دن اور تین سو ساٹھ منزلیں ہو جاتی ہیں۔ اس تحقیق کی رُو سے دونوں حدیثوں کا منظر یکساں رہیگا۔ پہلی حدیث تو پورے سال کو بتلانے والی سمجھی جائیگی مع دونوں منازل آمد و رفت کے۔ اور دوسری حدیث بھی اُس کو بتانے والی رہیگی۔ مگر آمد و رفت کو الگ الگ کر کے +

اگر تامل سے اس حدیث کو دیکھا جائیگا۔ تو بغیر تاویل کے فلسفہ جدیدہ پر منطبق ملیگی۔ البتہ ایک لفظ میں تاویل کرنی پڑیگی۔ اور وہ **آفتاب کا اُترنا ہے**۔ اس سے ہم اُس کی شعاعوں کا پڑنا مراد لے لینگے۔ پھر کوئی اشکال نہ رہیگا بخلاف باقی تفاسیر کے کہ اُن میں اس سے زیادہ تاویل کرنے کی ضرورت پڑیگی۔ (اب بھی ایک اعتراض سال کے تین سو ساٹھ دن پورے ہونے کا رہ گیا۔ مترجم) +

بالجملہ اس حدیث کے الفاظ میں کچھ خاص ایسے شواہد بھی ہیں۔ جو جدید ہی فلسفہ پر منطبق ہیں +

(۱) **مثلاً حضرت کا یہ ارشاد کہ آفتاب ہر روز ایک برج پر اُترتا ہے** "پر" کا لفظ بتاتا ہے۔ کہ اُن بروج سے مراد سطوح زمین ہیں۔ جن پر آفتاب پڑتا یعنی اُسکی شعاع پڑتی ہے۔ اور اگر بروج سے مراد آسمانی بروج ہوتے۔ تو "میں" کہنا چاہئے تھا یعنی برج میں اُترتا ہے +

(۲) حضرت کا تعبیر کرنا آفتاب کے چلنے کو نزول یعنی اُترنے سے خصوصًا بلحاظ لفظ علیٰ بمعنی "پر" کے۔ کیونکہ اس سے بھی شعاعوں کا پڑنا زمین پر سمجھ میں آتا ہے +

مَیں نے اس مقام پر زیادہ طول اس وجہ سے دیا ہے کہ اس حدیث کی شرح

قدماء علماء نے جو فرمائی ہے۔ وہ کسی نظام صحیح پر منطبق نہ ہوتی تھی۔ اس وجہ سے میں نے فلسفہ جدیدہ پر منطبق ہونا اس کا ظاہر کیا ہے +

(**دوسرے وہ کلمات**) جس سے سیر آفتاب پر استدلال کیا جاتا ہے۔
شریعت کے وہ کلمات ہیں۔ جن سے آفتاب کا طلوع و غروب بیان کیا گیا ہے۔ یعنی آفتاب ہی طالع ہوتا اور غروب کرتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آفتاب ہی متحرک ہے۔ اور زمین ساکن۔ مگر جواب اس کا بھی چند طرح سے ہو سکتا ہے۔ (پہلے) اس طرح کہ ہم اس کلام کو عرف کی نظر کے مطابق مانیں۔ یعنی چونکہ عرف عام میں بھی مشہور تھا۔ کہ آفتاب ہی طلوع و غروب کرتا ہے۔ اور ظاہر نظر میں دکھائی بھی ایسا ہی دیتا ہے۔ اس وجہ سے مطابقۃً للعرف یہ کلمات وارد ہوئے ہیں + (دوسرے) اس طرح کہ طلوع سے مطلق ظہور آفتاب مراد ہو۔ اور غروب سے مطلق غیبت۔ تو اس بنا پر فلسفہ قدیمہ اور جدیدہ دونوں ہی پر وہ کلمات منطبق ہونگے۔ اور کوئی اشکال نہ رہیگا خصوصاً اس لحاظ سے کہ اُن کلمات میں سے بعض ایسے بھی ہیں۔ جو خود خدائے تعالےٰ کا حکم نہیں ہیں۔ بلکہ کسی دیکھنے والے کے قول کی حکایت ہیں مثلاً ایک مقام پر پروردگار عالم ذوالقرنین کے سمجھنے اور اُن کے دیکھنے کی حکایت کرتا ہے۔ کہ وجدھا تطلع علیٰ قوم۔ ذوالقرنین نے ایسا سمجھا۔ کہ آفتاب ایک قوم پر طلوع کر رہا ہے۔ اور یہ کہ وجدھا تغرب فی عین حمیۃ۔ اور ایسا سمجھے۔ کہ ایک کیچڑ والے چشمے میں غروب کر رہا ہے۔ خود پروردگار نے اپنی طرف سے نہیں ارشاد فرمایا ہے۔ کہ آفتاب فی الواقع طلوع کرتا یا غروب کرتا ہے۔ بلکہ یہ ارشاد فرمایا کہ ذوالقرنین نے ایسا سمجھا۔ تو اس سے استدلال اُس مطلب پر ہرگز نہیں ہو سکتا +

جب یہ بات ختم ہو چکی۔ اور بحث اس مسئلہ میں تمام ہو گئی۔ تو ہم چند اشکالات کے جواب بھی جو اس آیت مذکورہ پر بظاہر پڑتے ہیں دے کر اس مسئلہ کو ختم کرتے ہیں +

(**پہلا اعتراض**) یہ ہے کہ جب زمین گول ہے۔ تو ظاہر ہے۔ کہ اُس کا کوئی مشرق اور کوئی مغرب معین نہیں ہوگا۔ بلکہ ہر جگہ کا مغرب و مشرق الگ الگ ہوگا۔ پھر خدائے تعالےٰ کا یہ ارشاد کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ جو فرمایا ہے۔ کہ حتی بلغ مطلع الشمس یا مغرب الشمس۔ یعنی ذوالقرنین مطلع شمس یا مغرب شمس میں پہنچے +

(**دوسرا اعتراض**) یہ ہے۔ کہ آفتاب تو زمین سے بہت بڑا ہے۔ قدماء نے

بھی اس کو زمین سے بڑا مانا ہے۔ اور متاخرین نے بھی۔ تو خدائے تعالےٰ نے یہ کیا فرمایا۔ کہ وجدھا تغرب فی عین حمئۃ۔ ایک چشمے میں آفتاب کیونکر غروب کر سکتا ہے؟

جواب اس کا یہ ہے ۔کہ قدماء کے نزدیک زمین کے کھلے ہوئے قطعات جن پر آبادی ہے۔ صرف ایشیا۔ افریقہ اور یورپ تھے۔ اور ہمیں یہ نہیں معلوم کہ ذوالقرنین کہاں تک گئے تھے۔ اور کیونکر گئے تھے۔ لیکن مشہور اس قدر ہے۔ کہ شرق و غرب بعد و بحر سب کی سیر کی۔ ممکن ہے۔ کہ وہ سواحل غربیہ افریقیا تک پہنچے ہوں۔ جہاں کے لوگ چاند کو پوجتے تھے۔ اور جو حیوانات وحشیہ سے بھی زیادہ وحشی تھے۔ پھر اُن سے بحر اوقیانوس اٹلانٹک کا عبور ممکن نہ ہوا ہو۔ تو اپنے خیال میں یہی سمجھے ہوں۔ کہ آفتاب اس سمندر میں غروب کر رہا ہے۔ اور یہ کہ اس کے بعد کہیں زمین نہیں ہے۔ اور اگر یہ بات نہ مانی جائے۔ تب بھی ہم کہینگے۔ کہ خدائے تعالےٰ اپنی طرف سے تو فرماتا نہیں۔ بلکہ ذوالقرنین کی سمجھ کو بیان کرتا ہے۔ کہ وہ ایسا سمجھے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا۔ کہ حقیقت میں آفتاب ایک چشمے میں غروب کرتا ہے +

نیز یہ کہ عین کے معنی جو چشمے کے سمجھے جاتے ہیں۔ یہ کیا لازم ہے عین کے تو بہت سے معنی ہیں۔ منجملہ اُن کے پانی بہنے کی جگہ کو بھی عین کہتے ہیں۔ آب کثیر کو بھی کہتے ہیں۔ پس ممکن ہے۔ کہ اسی بحر اوقیانوس کو **عین** سے تعبیر فرمایا ہو۔ کیونکہ اُسے عین بمعنی آب کثیر کہنا بھی درست ہے۔ اور عین بمعنی پانی بہنے کی جگہ بھی کہنا ٹھیک ہے۔ کیونکہ دریاؤں میں اسی سے پانی بہ کر آتا ہے +

باقی رہا خدائے تعالےٰ کا یہ ارشاد کہ "فی عین حمئۃ" کیچڑ والے عین یعنی سمندر میں۔ یا فی عین حامیۃ گرم سمندر میں۔ تو یہ بات بحر اسود پر منطبق ہو سکتی ہے۔ جو ایشیا کے مغرب میں واقع ہے۔ اور بحر اٹلانٹک پر منطبق ہو سکتی ہے۔ جو افریقہ کے مغرب میں واقع ہے۔ کیونکہ اول کی نسبت تو یہ مشہور ہے۔ کہ وہ زیادہ گرم اور سیاہ پانی ہے۔ اور دوسرے کی نسبت یہ کہ بہت گرم ہے۔ خصوصاً جو حصہ اُس کا خط استواء کے قریب واقع ہوا ہے۔ لہذا معلوم ہوا کہ آیت کے معنی بالکل صحیح ہیں۔ ذرا بھی اس میں اعتراض کی گنجائش نہیں ہے +

رہا پروردگار عالم کا یہ ارشاد کہ وجدھا تطلع علی قوم لم نجعل لھم من دونہا سترا تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ممکن ہے۔ کہ وہ لوگ اقصائے مشرق کے باشندے ہوں۔ جو نہایت وحشی اور برہنہ پھرنے والے تھے۔ مثل سائبیریا یا جاپان۔ اور مابعد ہندوستان والے۔ اور جو بحر اعظم سے قریب ہیں۔ جن میں اکثر سوائے جاپانیوں کے اب تک وحشی قومیں ہیں۔ اس بنا پر حاصل اس کلام قرآنی کا صرف بیان کرنا اس بات کا ہوگا۔ کہ ذوالقرنین آبادی کے مشرقی حصے میں بھی گئے۔ جہاں کے لوگ نہایت وحشی اور برہنہ تھے۔ جن پر سوائے آفتاب کی شعاعوں کی چادر کے کوئی چادر یا کپڑا ستر کیواسطے نہ تھا۔ یا یہ کہ اُن کے جسم پر مشرقی سردی سے بچانے کا کوئی لباس نہ تھا۔ سوا آفتاب کی دھوپ کے۔ کیونکہ اُن کے پاس کوئی مکان تھا۔ نہ چھت۔ نہ خیمہ نہ اور کچھ۔ یا یہ کہ اُن کے جسموں کو چھپانے والی نگاہوں سے کوئی شے سوائے آفتاب کی دھوپ کے نہ تھی۔ گویا اس سے اُن لوگوں کا نہایت وحشی ہونا بیان کیا ہے۔ والعلم عند اللہ۔

نواں مسئلہ

جرم آفتاب کی صفات خمسہ کی تحقیق

سوال۔ بہت دنوں سے ہم اس امر کو مان رہے تھے کہ جو کچھ حکماء قدماء نے آفتاب کے اوصاف کے متعلق بیان کیا ہے۔ وہ بالکل صحیح ہے۔ مثلاً آفتاب کا ابدی الوجود ہونا۔ تولید حرارت نہ کرنا۔ وزنی نہ ہونا۔ ایک جسم جسیم ٹھوس ہونا وغیرہ۔ اور ہم اپنے اعتقاد میں یہ بھی سمجھ رہے تھے۔ کہ شریعت نے بھی ایسا ہی کچھ بیان فرمایا ہے۔ مگر اس زمانہ میں جب کہ جدید علم ہیئت نے ترقی کی۔ اور اس کے اصول معلوم کئے۔ تو دریافت ہوا۔ کہ یہ صفات آفتاب کے متعلق بیان کرنے محض غلط ہیں۔ کیونکہ ہم حس سے اُس کے برخلاف پاتے ہیں۔ اب یہ بتائیے۔ کہ آیا شریعت اور فلسفہ جدید ایک دوسرے سے مطابق ہے۔ یا شریعت اور فلسفہ قدیم۔ (حالانکہ فلسفہ قدیمہ کی غلطی ثابت ہو چکی) پس اگر شریعت اُس سے

مطابق ہے۔ تو وہ بھی غلط ہوگی۔ بینوا توجروا +

جواب

ہر نقاد و ماہر جسے علم حقیقی سے کچھ بھی حصہ ملا ہے جانتا ہے۔ کہ علوم عقلیہ خصوصاً علوم ریاضیہ کے بیان کی ذمہ وار عقل ہے۔ نہ شریعت۔ یعنی کہ شریعت کا فرض منصبی یہ نہیں ہے۔ کہ علوم ریاضیہ کی تفصیل بیان کرے۔ بلکہ اُس کا کام تو صرف احکام و اخلاق کی تعلیم ہے۔ اور اگر کسی موقع پر کچھ اُس کے متعلق بھی بیان فرمائے۔ تو یہ صرف اُس کا تفضل ہے۔ چنانچہ ہماری شریعت نے ایسا ہی کیا ہے۔ کہ علاوہ اخلاق و تمدن کی تعلیم کے علوم ریاضیہ و فلسفیہ کو بھی بہت کچھ بیان کر دیا ہے۔ کیونکہ یہ شریعت آخری شریعت تھی اور دیگر شرائع سابقہ سے مکمل بھی۔ اس وجہ سے اُس نے اپنے لئے یہ فضل بھی حاصل کر لیا۔ حالانکہ اس سے پہلے کی شریعتیں مثلاً شریعت مسیحی نے سوائے اخلاق کے اور کچھ تعلیم نہیں کیا۔ اور ہمارے رسولؐ نے بڑے بڑے دقیق مطالب فلسفیہ و طبعیہ کو بھی عامہ خلائق کے انتفاع کی غرض سے ارشاد فرما دیا ہے۔ اور بہت سے ابواب حکمت بذریعہ اپنے اوصیائے کرام کے جو آپ کے بعد ہوئے مفتوح فرما کر نکات حکمت کو ظاہر فرما دیا ہے۔ تاکہ ہر زمانے اور ہر شہر کے آدمی اُس سے فائدہ اُٹھا سکیں +

مَیں سچ کہتا ہوں۔ کہ ہماری شریعت کے بیانات اس درجہ جدیدہ فلسفہ کے معلومات سے موافقت رکھتے ہیں۔ کہ اگر ہم کو یقین نہ ہوتا۔ کہ فلاسفران حال نے اپنی کوشش اور جدیدہ آلات کے ذریعے سے ان باتوں کو دریافت کیا ہے۔ تو کہ سکتے تھے۔ کہ انہوں نے ہماری شریعت ہی سے ان مطالب کو حاصل کیا ہے۔ کیونکہ جس قدر ہم اس شریعت کے اقوال کو تلاش سے پاتے جاتے ہیں۔ اُسی قدر ہمارے اس خیال کی تصدیق اور بھی زیادہ ہوتی جاتی ہے +

اب مَیں سوال کے پانچ مطلبوں کو آئندہ پانچ بحثوں میں بیان کرتا ہوں۔ جس سے ثابت ہو۔ کہ شریعت کی رائے ان کی بابت بالکل وہی ہے جو فلسفہ جدیدہ کی رائے ہے +

پہلی بحث

اِس بیان میں کہ آفتاب میں حرارت ذاتی ہے۔ جس طرح اس کا نورانی ہونا ذاتی

ہے۔ جیسا کہ فلسفہ جدیدہ میں ثابت ہوا ہے۔ یا یہ کہ آفتاب سے صرف روشنی پیدا ہوتی ہے۔ اور خود اس میں نہ حرارت ہے۔ اور نہ اجزاے ناریہ پائے جاتے ہیں جیسا کہ فلسفہ قدیمہ کا بیان ہے +

یونانی حکماء کا تو ضرور یہ دعوے ہے۔ کہ آفتاب خود نہ تو گرم ہے نہ سرد۔ نہ تر ہے نہ خشک۔ کیونکہ چاروں صفتیں اجسام عنصریہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور اجرام علویہ بالکل عنصریات سے مبرا و منزہ ہیں۔ رہی یہ حرارت جو آفتاب سے محسوس ہوتی ہے۔ یا خشکی کی کیفیت۔ وہ اُن کے نزدیک نور آفتاب کی خاصیت سے پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کی رائے یہ ہے کہ آفتاب کے نور میں یہ خاصیت ہے۔ کہ جب وہ کسی سطح پر واقع ہو۔ اور وہاں سے منعکس ہو کر روشنی اوپر کو جائے۔ تب حرارت یا یبوست پیدا کرے لہذا اس حرارت یا یبوست کو آفتاب سے کچھ نسبت نہیں ہے۔ بلکہ اُس سطح سے تعلق ہے۔ جہاں سے روشنی منعکس ہو کر اوپر جاتی ہے۔ آفتاب صرف ایک سبب ہے۔ جس سے زمین سے حرارت پیدا ہو جاتی ہے +

مگر متاخرین حکماء کے نزدیک آفتاب مثل چراغ کے ہے۔ جس میں نور اور نار دونو ہی پائے جاتے ہیں۔ (قدماء اس کے مخالف ہیں)۔ علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے رکود آفتاب کے مسئلہ میں منجمین کا قول یوں نقل کیا ہے۔ کہ "آفتاب کی حرارت باعتبار اُس جرم کے نہیں ہے۔ جس سے یہ کہا جائے۔ کہ مشرکین کو اگر اُس سے قریب کر دیا جائیگا۔ تو اُن پر عذاب ہو جائیگا۔ بلکہ یہ حرارت شعاعوں کے منعکس ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے جو شے زمین سے جتنی دور واقع ہوگی۔ اُسی قدر اُس میں حرارت کا اثر کم پہنچیگا۔ (مثلاً چھت پر حرارت زیادہ معلوم ہوگی۔ پہاڑ کی چوٹی پر چلے جانے سے اُس سے کم اثر معلوم ہوگا۔ اگر اُس سے بھی اوپر کوئی چلا جائے۔ تو اور بھی حرارت کا اثر کم محسوس ہوگا)" +

نیز مجلسی علیہ الرحمہ نے مسئلہ محو قمر میں منجمین کی رائے بیان کی ہے۔ کہ "کُل اجرام فلکیہ سخونت (گرمی) کو قبول نہیں کرتے۔ اور یہ امر منجمین سابقین کے مسلمات میں سے ہے +

فلسفہ جدیدہ کہتا ہے۔ کہ آفتاب سے نور بھی پیدا ہوتا ہے۔ اور ناریہ بھی پیدا ہوتی ہے۔ ان دونوں ہی کو آفتاب اپنی شعاعوں کے ذریعے سے زمین کی طرف بھیجتا ہے۔ نیز یہ کہ کرۂ آفتاب مرکب ہے نار اور بخار سے۔ جس کی ناریۃ ہمیشہ جوش زن اور مشتعل رہتی

ہے جسے یہ لوگ آگ کے عظیم الشان دریا سے تشبیہ دیتے ہیں جس کے شعلے ہر وقت موج زن اور مشتعل رہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ اس کے شعلوں کی لپیٹ ہواؤں کے تھپیڑے سے پچاس پچاس ہزار فرسخ تک جاتی ہے۔ اگر ناظرین اس لپیٹ اور شعلے کو دوربین کے ذریعہ سے دیکھ لیں۔ تو اُس وقت کیفیت کُ ئے۔ کہ میگنیشی اجزا کس طرح شعلہ ور ہوتے ہیں +

اس وقت تک حکمائے حال نے جو کچھ دریافت کیا ہے ۱۴ جو وُہ مادہ سے زیادہ آفتاب میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً تانبا۔ لوہا وغیرہ۔ جیسے آپ اُن کی کتابوں سے دریافت کر سکتے ہیں۔ یہاں صرف اس قدر بیان کرنا مقصود ہے۔ کہ آفتاب سے ناریۃ خود بخود پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ ناریت اُس کے ماتحت تمام سیارات تک پہنچتی ہے۔ اگرچہ بہت بڑا حصّہ اس کی ناریت کا آتے آتے رستہ ہی میں فنا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ حال کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آفتاب کی حرارت کا حصہ جو زمین تک پہنچتا ہے۔ وہ دو ہزار تین سو اکاسی ملین میں سے ایک جزو ہے۔ اور باقی ذرات حرارت یا تو راہ میں تلف ہو جاتے ہیں۔ یا دیگر سیارات و اقمار و شہب اور دمدار ستاروں تک چلے جاتے ہیں + **باقی رہی شریعت اسلامیہ**۔ تو جہاں تک اس کے اقوال کو تلاش کیا جائیگا۔ کوئی قول بھی فلسفہ قدیمہ کے موافق اس باب میں نہ ملیگا۔ بلکہ بہت سے اقوال فلسفہ جدیدہ کی تائید کرتے ہیں +

پہلا قول۔ سورۂ نوحؑ میں پروردگار عالم فرماتا ہے۔ **وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا** "آفتاب کو خدا نے چراغ بنایا ہے" جس سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے۔ کہ آفتاب مثل چراغ کے روشنی اور حرارت دونوں ہی کا منبع ہے۔ جیسا کہ یورپین حکما کی رائے ہے۔ یہ بھی واضح ہے۔ کہ قرآن مجید آفتاب کو چراغ بتاتا ہے۔ اور چاند کو صرف نور۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ شعاعیں جو آفتاب میں پائی جاتی ہیں۔ اُس کی ذاتی ہیں۔ اور چاند میں ذاتی نہیں ہیں +

دوسرا قول۔ سورۂ نبا میں **وجعلنا سراجًا وھاجًا** "ہم نے دہکتا ہوا چراغ پیدا کیا"۔ مفسرین کا اتفاق ہے۔ کہ اس آیت میں چراغ سے مراد آفتاب ہے۔ ثعلبی مفسر نے لفظ سراج کو آفتاب سے تفسیر کرنے کے بعد وھاج کے معنی

حارّ و قادّ (گرم دہکنے والا) بتایا ہے۔ مقاتل مفسر نے لکھا ہے۔ وہج کے معنی مجمع نور و حرارت کے ہیں۔ قاموس میں لکھا ہے "وہج النار تقدت" بہرحال یہ آیت بکمال وضوح بتاتی ہے۔ کہ آفتاب میں آگ کی طرح اشتعال ہے۔ اور یہی رائے حکمائے حال کی ہے +

تیسرا قول۔ روضہ کافی خصال علل الشرائع۔ بحار وغیرہ میں باسناد قوی محمد بن مسلم سے مروی ہے۔ کہ امام خامس محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا۔ نیز تفسیر نور الثقلین۔ مجمع البحرین۔ تفسیر قمی اور بحار میں دوسری سند سے انہیں حضرت ؑ سے مروی ہے۔ سلام بن مستنیر کہتا ہے۔ میں نے ابو جعفر امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا۔ کہ یا حضرت آفتاب بہ نسبت چاند کے گرم کیوں ہے؟ آپ نے فرمایا کہ خدائے تعالے نے آفتاب کو آگ کے نور سے پیدا کیا۔ اور صاف پانی سے۔ ایک تہ اس کی وہ اور ایک تہ اس کی یہاں تک کہ سات طبق ہوئے۔ پھر اس کے اوپر سے آگ کا لباس اسے پہنایا۔ اسی وجہ سے آفتاب بہ نسبت چاند کے گرم ہے۔ اس روایت کا بقیہ حصہ آئندہ بیان کیا جائیگا +

اس کلام سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سائل کو اس قدر ضرور معلوم تھا کہ آفتاب بذاتہ منبع حرارت ہے۔ مگر اسے لِم اس کی نہ معلوم تھی۔ اس لم کو حضرت ؑ سے دریافت کیا۔ جسے حضرت نے اس طرح واضح فرما دیا۔ کہ اس کا جیالوجی اور جغرافیۂ طبعی بھی معلوم ہو جائے۔ اس حدیث سے ہم کو کئی جدید معلومات کا پتہ چلا۔ ایک تو یہ کہ جرم آفتاب کئی تہوں اور طبقوں سے مرکب ہے۔ جیسا کہ حکمائے حال کی رائے ہے۔ اور ہرگز ویسا نہیں ہے۔ جیسا کہ حکمائے سابق اس کی نسبت کہا کرتے تھے کہ آفتاب بسیط ہے۔ دوسرے یہ کہ آفتاب بھی مثل دیگر اجرام ارضیہ کے عنصریات اور مادیات سے یعنی پانی اور ہوا اور بخارات سے مرکب ہے۔ یہ بھی حکمائے حال کے اقوال کے مطابق اور قدیم فلسفہ کے مخالف ہے۔ تیسرے یہ کہ آفتاب بذاتہ حرارت و ناریت کا منبع ہے + چوتھے یہ کہ جرم قمر میں بھی حرارت پائی جاتی ہے۔ مگر بہ نسبت آفتاب کے کم ہے۔ جیسا کہ ہم آئندہ بتفصیل بیان کرینگے + پانچویں یہ کہ آفتاب کے اس رخ کی حرارت کا یہ سبب ہے۔ کہ خدائے تعالے نے اسے آگ کا لباس پہنایا ہے۔ جو اس کے تمام طبقات پر محیط ہے۔ یہی رائے حکمائے حال کی بھی

ہے +

دیکھئے ۔کرنیل کوس فانڈیک اپنی رایوں میں کیا ظاہر کرتا ہے ۔اُس کا خیال ہے ۔کہ
"آفتابوں کی شعاعوں کی قوت ایک روشن مادے کے غلاف میں منحصر ہے ۔جو جرم آفتاب
کو محیط ہے ۔اور اس مادہ کا نام فوٹوسفر ہے ۔اور ساری قوت جوہر آفتاب کی اس امر پہ
صرف ہوتی ہے ۔کہ اس کرہ کا جو فعل ہے ۔یعنی حرارت اور نور وہ باقی رہے ۔پس کسی جرم
کا ایسا ہونا کہ اُسے کوئی دوسرا کرہ روشن اور شعاعوں والا محیط ہو ۔اُس کے آفتاب ہونے
کے لئے نہایت ضروری ہے ۔(یعنی کسی جسم کروی کو آفتاب اُس وقت تک نہ کہینگے ۔جب
تک اُسے کوئی دوسرا کرہ نورانی شعاعوں والا محیط نہ ہو) ۔اور یہ کرہ محیط مرکب ہے ۔ایک
مشتعل مادہ سے ۔جو اس نور میں مُؤثر ہے ۔جو جوہر آفتاب سے نکلتا ہے ۔اور اگر اس
مسئلہ کو پورا حل کرنا چاہو ۔تو سپکٹر سکوپ کے ذریعے سے حل کرو ۔جو آفتاب کے اصلی
رنگوں کو ظاہر کردیگا" +

مَیں کہتا ہوں ۔کہ جو چیز ایسی ہو ۔کہ سوائے سپکٹر اسکوپ کے حل نہ ہو سکتی ہو ۔کیوں کر
ممکن تھا ۔کہ صاحب شریعت یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم اور اُن کے اوصیاء
علیہم السلام اس سے زیادہ اپنے اہل زمانہ کے سامنے بیان کرسکتے ۔بلکہ بسا تعجب ہے
کہ کیونکر وہ اس بات کو کہ سکے ۔اور سائل اور سامعین اُس کے متحمل ہو سکے ۔اور کس طرح
اُس کی تصدیق کرنے پر مجبور ہوئے ۔حالانکہ نہ اُس وقت کوئی رائے ان حضرات ؑ کے کلام کی
معین تھی ۔اور نہ کوئی آلہ موجود تھا جس سے اُن کے قول کی تصدیق ہو سکتی ۔مَیں سچ کہتا
ہوں ۔کہ اُس زمانہ کے لوگ جو ہمارے حاملان شریعت کی تصدیق کرنے پر مجبور رہتے ۔اُس کا
سبب یہ تھا ۔کہ بار بار اُن کی سچائی اور اُن کی علمی اور عملی امتیازات کو دیکھ چکے تھے ۔
جن سے اُن کو پورا بھروسہ ہوگیا تھا ۔کہ جو کچھ یہ فرماتے ہیں ۔وہ بالکل ٹھیک اور واقع کے
مطابق ہے ۔بلکہ ان سب باتوں سے زیادہ عجیب یہ ہے ۔کہ اُس زمانہ کے آدمی ایسے
باریک مطالب اور علمی دقائق کو سمجھ ہی کیونکر جاتے تھے ۔حالانکہ نہ کوئی علمی اور عملی
ذریعہ اُن کے پاس موجود تھا ۔اور نہ کوئی آلہ ۔سوائے اس خاندان رسالت اور ان حاملان
وحی کے جو موجودات عالم کے واقعی حالات کو بغیر کسی آلہ کی مدد کے محض اپنی وحی اور الہام
کی قوت سے بیان فرماتے تھے ۔خدا کی قسم ہے ۔کہ جب مَیں ان اقوال پر اپنے ائمہ طاہرین ؑ

کے مطلع ہوا ہوں۔ تو ایک ایسی دہشت اور حیرت طاری ہوئی ہے۔ جو شاید اُس دہشت اور حیرت سے کم نہ ہوگی۔ جو اُن لوگوں پر طاری ہوتی تھی۔ جن کی حضوری میں صاحب شریعت اپنے ان حکمی اقوال کو بیان فرماتے تھے۔

چوتھا قول۔ روضہ کافی اور کتاب بحار میں باسناد قوی اصبغ ابن نباتہ مصاحب خاص جناب علی بن ابی طالب علیہ السلام سے مروی ہے کہ جناب امیر المومنین علیؑ ابن ابیطالب نے ذیل میں ایک طولانی حدیث کے ارشاد فرمایا۔ کہ آفتاب کا رُخ اگر زمین والوں کی طرف ہوتا۔ تو خود زمین اور اُس کے باشندے اور موجودات شدت حرارت آفتاب کی وجہ سے فنا ہو جاتے۔ الخ۔ اس کلام کا ظاہر ہوتا رہا ہے اس بات کو۔ کہ آفتاب میں خود ذاتی حرارت شدیدہ ہے جو انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔

اب یہاں اگر آپ یہ کہیں۔ کہ آفتاب تو ایک جسم کروی ہے۔ اور اپنے مرکز پر گردش کرتا ہے۔ اُس کے لئے چہرہ اور پشت یا ایک رُخ اور دو رُخ کہنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اور بالفرض ہم اسے مان بھی لیں۔ تو آفتاب اپنی گردش میں ہر رُخ زمین کی طرف پھیر دیتا ہے۔ تو کونسا وہ رُخ باقی رہ گیا۔ جسے امام نے فرمایا۔ کہ اگر زمین کی طرف ہوتا۔ تو اہل زمین فنا ہو جاتے۔ **تو میں اس کا جواب** یہ دونگا۔ کہ فلاسفران حال نے اپنے رصد جدید میں یہ دعوے کیا ہے۔ (دیکھو تقویم ۱۳۲۳ھ کی جو نجم الملک طرانی کی تالیف سے ہے)۔ کہ آفتاب کے بعض رُخ بعض کے بہ نسبت زیادہ گرم ہیں۔ اور اُس کے استوائی صفحے اگر کلف سے خالی ہوں۔ تو بہ نسبت اُن اطراف کے جو تیس درجے کے عرض کے بعد ۱۷:۱۶ کی نسبت سے پڑتے ہیں زیادہ گرم ہیں۔ لہٰذا آپکا یہ شبہ رفع ہو گیا۔ کہ آفتاب کا ایک رُخ دوسرے رُخ سے زیادہ کیونکر گرم ہو سکتا ہے۔ نیز ان کا دعوے ہے۔ جیساکہ تقویم مذکور میں لکھا ہے۔ کہ آفتاب کا شمالی صفحہ جنوبی صفحہ سے زیادہ گرم ہے۔ اوران سب سے پہلے حکیم اُستاد ہرشل نے دعوے کیا ہے۔ کہ نصف کرہ آفتاب بہ نسبت دوسرے نصف کے زیادہ گرم ہے۔ پس جبکہ صفحہ شمالی بہ نسبت صفحہ جنوبی کے زیادہ گرم ہؤا۔ تو آپ کا شبہ رفع ہو گیا۔ اور اگر مان بھی لیا جائے۔ کہ آفتاب اپنی گردش میں اپنے تمام صفحوں کو ہماری طرف پھیرتا رہتا ہے۔ تب بھی ہم کہینگے۔ کہ اُس کے قطبی دونو رُخ یعنی جنوبی اور شمالی تو ہماری زمین کی طرف کبھی واقع ہو ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ زمین کی گردش

آفتاب کے گرد اُس کے استوائی صفحات کے مقابل میں ہوتی ہے۔ نہ اُس کے دونو قطبوں کے مقابل۔ پس جو شخص کہ زمین پر ہوگا۔ اگرچہ آفتاب کے قطب کو بالفرض دیکھ سکے۔ لیکن پھر بھی آفتاب کا قطب اس کے مقابل نہ ہوگا۔ اور نہ اُس کی شعاعیں اُس پر پڑینگی پس حضرتؑ کا یہ ارشاد بالکل ٹھیک ہے۔ کہ آفتاب کا وہ رُخ اگر زمین کی طرف ہوتا۔ الخ۔ کیونکہ بہت اچھی طرح ممکن ہے۔ کہ حضرتؑ کی مراد اس کلام سے اُس کا شمالی رُخ ہو جس کے اس طرف ہونے سے آپ نے اہل زمین کے فنا ہونے کو بیان فرمایا ہے۔ اور اس میں ہرگز شک نہیں ہے۔ کہ اُس کا شمالی رُخ اگر زمین کی طرف ہوتا۔ تو اہل زمین کو بیشک جلا دیتا۔ کیونکہ وہ بہت زیادہ گرم ہے۔ جیساکہ حال کے رصد والوں نے بیان کیا ہے۔ نیز ہم اس کا جواب یوں بھی دے سکتے ہیں۔ کہ وجہ کے معنی توجہ کے بھی ہوتے ہیں۔ پس اس بنا پر حضرتؑ کے کلام کا یہ مطلب ہوگا۔ کہ آفتاب کی پوری توجہ زمین کی طرف ہوتی۔ یعنی اُس کی تمام شعاعیں زمین کی طرف پڑتیں۔ تو یقیناً زمین اور اہل زمین کو جلا دیتا۔ اور یہ بالکل صحیح ہے جیساکہ متاخرین حکماء کی رائے ہے۔ کیونکہ ان میں سے بعض فلاسفروں نے بیان کیا ہے۔ کہ ایک دن میں جس قدر آفتاب کی حرارت فنا ہو جاتی ہے۔ وہ سب اگر جمع ہو کر زمین پر پڑتی۔ تو وہ اس تمام کرۂ بخاری کے جلا دینے کو کافی ہوتی۔ حالانکہ یہ کرۂ بخاری زمین سے گیارہ میل اوپر تک کو چھپائے ہوئے ہے۔ نیز مسٹر فانڈیک نے بیان کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ آفتاب کی حرارت جس قدر سال بھر کی مدت میں زمین پر پڑتی ہے۔ اگر وہ دفعتاً ایک مرتبہ واقع ہوتی۔ درآنحالیکہ زمین کرۂ بخاری سے جس کا قطر پچاس ذراع کا ہے گھیری ہوئی ہے۔ تو یہ کرہ بخاری تمام اُسی وقت پگھل جاتا۔ اور جب ایک سال کا یہ حال ہے۔ تو کئی سال آفتاب کے پڑنے سے کیا حال ہوتا۔ کیا یہ حرارت زمین کے سخت سے سخت معدن کو جلا نہ دیتی۔ اور اُس کے موجودات کو دھواں بنا کر اُڑا نہ دیتی۔ جیساکہ اس حدیث شریف کا بیان ہے؟

پانچواں قول۔ تفسیر قمی اور مجمع البحرین۔ نیز بحار الانوار اور نور الثقلین سے منقول ہے۔ کہ امام رضا علیہ السلام (آٹھویں امام) نے فرمایا۔ الشمس والقمر آیتان یعنی آفتاب و ماہتاب دونوں ہی خدائے تعالےٰ کے قدرت و وجود کی نشانیاں ہیں۔ پھر فرمایا۔ وضوءھما من نور عرشہ وحرھما من نار جہنم۔ ان دونوں کی روشنی تو عرش خدا کی روشنی سے ماخوذ ہے۔

اوسان کی حرارت جہنم کی آگ سے۔ جب قیامت ہوگی۔ توان دونوں کی روشنی عرش کی طرف واپس جائیگی۔ اُس وقت آفتاب باقی رہیگا نہ ماہتاب"+

اس حدیث سے چند باتیں معلوم ہوئیں۔ (۱) یہ کہ جرم آفتاب میں خود حرارت ہے۔ (۲) یہ کہ قمر کی روشنی بھی ذاتی ہے۔ نہ کہ آفتاب کی روشنی سے روشن ہے جیساکہ آئندہ ہم بیان کرینگے۔ (دیکھو مسئلہ احوال قمر آئندہ)۔ (۳) یہ کہ جرم قمر میں بھی حرارت ہے۔ اسے بھی ہم آئندہ احوال قمر میں بیان کرینگے۔ (۴) یہ کہ کسی شئے کا فنا ہو جانا اُس کی صورت کے فنا ہو جانے اور مادے کے منتشر ہو جانے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ کچھ ضرورت اس کی نہیں ہے کہ اصل مادہ بھی فنا ہو جائے۔ اس نکتہ کا فائدہ آئندہ معلوم ہوگا+

چھٹا قول۔ کافی اور بحار میں نیز دیگر کتب احادیث میں جابر بن عبداللہ سے مروی ہے۔ پانچویں امام جناب محمد بن علی الباقر علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ آفتاب پر ایک فرشتہ موکل ہے۔ جو اُس پر پانی چھڑکتا رہتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا۔ تو زمین اُس کی حرار   سے جل اٹھتی۔ اس کلام سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ آفتاب میں بذاتہ حرارت اور ناریت ہے۔ جیساکہ حکمائے حال کا خیال ہے۔ **البتہ** اُس پانی میں کسی قدر بحث ہو سکتی ہے جس کی بابت معصوم ؑ نے فرمایا ہے۔ کہ فرشتہ آفتاب پر چھڑکتا رہتا ہے۔ مَیں اس کے متعلق تین وجہیں بیان کر سکتا ہوں+

پہلی یہ کہ جس طرح ہماری شریعت مطہرہ کے بہت سے اقوال حکمت آمیز کے اسرار آج تیرہ سو برس بعد کھُلے۔ جبکہ جدید فلسفہ نے ترقی کی۔ حالانکہ اس وقت تک اُن اسرار کو کوئی بھی نہ سمجھ سکا تھا۔ اُسی طرح ممکن ہے۔ کہ اگرچہ اسوقت تک حکمائے حال نے اس امر کو دریافت نہیں کیا ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ آئندہ کسی آلہ اور رصد کے ذریعے سے ثابت ہو جائے۔ کہ آفتاب کی حرارت پانی کے ذریعے سے کم کی جاتی ہے+

دُوسری یہ کہ اس حدیث کا مطلب ممکن ہے۔ کہ یہ ہو۔ کہ خدائے تعالےٰ پانی کے ذرات اور رطوبات لطیفہ رقیقہ کو برابر کرۂ ہوا میں پھیلاتا رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے آفتاب کی پوری حرارت کا اثر زمین پر نہیں پڑ سکتا۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ ہر زمانے میں فضائے آسمان میں رطوبات اور پانی کا وجود ضرور رہتا ہے۔ خواہ اس قسم کی رطوبت ہو۔ جو سمندروں کے بخارات کے ذریعے سے فضا تک جاتی ہے۔ خواہ وہ رطوبت ہو۔ جو مینہ برسنے سے ہوا میں رہتی ہے۔

اور اگر یہ رطوبت نہ رہتی۔ تو یقیناً زمین کو آفتاب کی اصلی حرارت کا تحمل نہ ہو سکتا +

تیسری یہ بھی محتمل ہے کہ اس پانی سے مراد وہ بارش ہو۔ جو کرۂ آفتاب پر ہوا کرتی ہے۔ جس کا دعوےٰ اس زمانے کے حکماء نے کیا ہے۔ کہ جس طرح زمین پر مینہ برستا ہے۔ اسی طرح کرۂ آفتاب پر بھی بارش ہوتی ہے۔ جیسا کہ منجم جلیل نجم الملک طہرانی نے جنتری ۱۳۱۶ھ میں لکھا ہے۔ جس کا خلاصہ مطلب یہ ہے۔ کہ "من جملہ حوادث شمسیہ کے اُس کی بارش بھی ہے۔ چنانچہ آفتاب کے مغربی حصے میں بمقدار تیس درجے کے ایک چیز ابر سے مشابہ پائی جاتی ہے۔ جس کی اوپر والی قوسیں ایک دوسرے سے مختلط ہیں۔ اور جو قوسیں کہ کرو مسفر کی طرف پائی جاتی ہیں۔ بعض اُن میں سے تیر اور شعلے کی صورت کی ہیں۔ جن میں ابر کے روشن ٹکڑے دکھائی دیتے ہیں۔ نیز آفتاب کی شمالی جانب میں کچھ باریک باریک ڈورے اور خطوط محسوس ہوتے ہیں۔ جیسے گویا مینہ برس رہا ہے۔ نیز مرکز قرص آفتاب میں ایک کثیف ابر چمکدار ہے۔ جو نیچے تک ممتد ہے۔ جیسے بہت سی جڑیں لٹک رہی ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ مینہ برس رہا ہے۔ نیز قرص آفتاب کی طرف بہت سے ڈورے بارش کے خطوط کی طرح محسوس ہوتے ہیں۔ اور وہ ہوا کی وجہ سے ادھر اُدھر مائل دکھائی دیتے ہیں۔ نیز حکماء حال نے جو حساب کیا ہے۔ تو اُس بارش کا اُوپر سے نیچے کی طرف آنا ہر سکنڈ میں ایک سو پچاس میل پایا ہے۔ اتفاق سے اسی تاریخ میں جبکہ اس کا حساب ہو رہا تھا یورپ میں ایک شفق نمودار ہوا۔ جس کے بعد لوگوں نے بہت سی آفتابی بارش کا مشاہدہ کیا۔ اور دو مہینے بعد آفتاب پر ایک گہرا ابر دکھائی دیا جس کے نیچے خطوط اور ڈورے مثل منحنی خطوط کے نظر آئے۔ جسے اچھی طرح بارش کہ سکتے ہیں۔ انتہی" +

حکمائے حال نے ان خطوط کو بارش سمجھا ہے۔ مگر ابھی تک یقینی طور پر یہ حکم نہیں لگا سکے ہیں۔ کہ فی الحقیقت یہ بارش ہی ہے۔ یا کوئی اور چیز۔ لیکن اس قدر ضرور ہے۔ کہ اگر ان کی رائے صحیح ہو۔ تو حدیث مذکور کا ظاہر بیان بالکل مطابق واقع ثابت ہو جائیگا۔ کیونکہ حضرتؑ اس حدیث میں فرماتے ہیں۔ کہ آفتاب پر ایک فرشتہ مؤکل ہے۔ جو اُس پر پانی چھڑکتا ہے۔ یعنی آفتاب کی حرارت کم کرنے کے لئے خدائے تعالیٰ نے بارش مقرر فرمائی ہے۔ اس وجہ سے کہ پانی اور رطوبت یقیناً حرارت کو گھٹا دیتی ہے۔ خواہ وہ بارش اُن بخارات کی وجہ سے مانی جائے۔ جو خود کرۂ آفتاب سے بلند ہوتے ہیں۔ یا کسی خارجی

ذرائع سے ✦

اب بحمداللہ ان اقوال شریعت سے اچھی طرح ثابت ہوگیا کہ ہمارے رسولؐ اور اُن کے سچے اوصیاؑ نے ان آرائے جدیدہ سے پہلے ہی ان مطالب کو بیان فرما دیا ہے۔ لہٰذا مَیں سفارش کرتا ہوں کہ ناظرین ہمارے ان ہادیان برحق کے اقوال پر غور کی نظر ڈالیں تاکہ انہیں معلوم ہو کہ یہ کیسے حکیم اور عالم ربّانی تھے۔ اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اسلامی شریعت کا حق ہونا معلوم ہو جائیگا ✦

دُوسری بحث

اِس بیان میں کہ آفتاب کا قُطر کتنا بڑا ہے اور اُس کی جسامت کتنی ہے؟

قدمائے حکما نے اس معاملہ میں اختلاف کیا ہے۔ (ہیرقلس) کا خیال ہے۔ کہ جرم آفتاب دراصل بھی اُتنا ہی بڑا ہے۔ جتنا بڑا ہم کو یہاں سے دکھائی دیتا ہے۔ (انکسفوراس) کا خیال ہے "کہ آفتاب بلاد مورہ سے بھی زیادہ بڑا ہے" جیسا کہ کتاب مشہد الکائنات کے حاشیہ صفحہ ۵۳ میں لکھا ہے نیز مشہد الکائنات میں ہے۔ کہ "(طالیس) حکیم کی رائے یہ ہے۔ کہ آفتاب کا جرم بنفسہٖ روشن ہے۔ اور مقدار جسامت اُس کی ماہتاب سے اکیس درجہ زیادہ ہے" حالانکہ ہر عاقل ریاضی دان سمجھ سکتا ہے۔ کہ آفتاب کی مقدار زمین سے بھی کہیں زیادہ بڑی ہے۔ اب رہا یہ امر کہ واقعی اس کا طول و عرض کتنا ہے۔ اس کی تحقیق ذرا مشکل ہے۔ جس طرح اور سیارات کی پیمایش ابھی صدیقین کو نہیں پہنچی ہے۔ آفتاب کی پیمایش بھی ہنوز یقینی نہیں ہے۔ لیکن بطلیموس کی رائے یہ ہے۔ کہ آفتاب کا جرم زمین کی نسبت ایک سو ساٹھ درجہ بڑا ہے۔ اور غیاث الدین کاشانی کی رائے ہے۔ کہ زمین کی نسبت تین سو درجہ بڑا ہے ✦

رہی زمین کی پیمایش۔ وہ معلوم اور محقق ہے۔ جس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔

اب حکمائے حال کو سُنئے۔ کہ ان لوگوں نے آفتاب کی مقدار زمین سے بیحد بڑی بتائی ہے۔ کئی لاکھ درجے کا فرق ان کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ بعضوں نے تصریح کی ہے۔ کہ آفتاب (۱۴۰۴۹۰۰) گنا زمین سے بڑا ہے۔ یہ فرق ایسا ہی ہے۔ جیسے ہم لوگ کہتے ہیں۔ فلاں فلاں چیز میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جتنا فرق کہ ہرقلس اور بطلیموس کی رائے میں نظر آتا ہے۔ اُتنا ہی فرق اس رائے میں اور بطلیموس کی رائے میں ہے۔ بہرحال شریعت اسلامیہ کی طرف ذرا توجہ فرمائیے۔ کہ اگرچہ اس کا ظہور ایسے زمانے اور ایسے ملک میں ہوا تھا۔ جہاں علم کی روشنی کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ اور نہ کوئی آلہ ہی اُن کے ہاتھ میں تھا۔ باوجود اس کے آفتاب کی نسبت وہ رائے ظاہر فرمائی ہے۔ جو بالکل متاخرین حکما کی رائے سے موافق معلوم ہوتی ہے۔ دیکھئے ہمارے نبیؐ عربی کے وصی جناب امیر المومنین علیؑ بن ابی طالب علیہ السلام سے جب کسی شامی نے سوال کیا ہے۔ کہ آفتاب کا طول و عرض کتنا ہے۔ تو آپ نے فرمایا (تسعماۃ فرسخ فی تسعماۃ فرسخ) یعنی" نوسو فرسخ مضروب نوسو فرسخ"۔ یعنی نوسو فرسخ کو نوسو فرسخ میں ضرب دینے سے جو حاصل ضرب پیدا ہوگا۔ وہی مقدار اُس کے طول و عرض کی ہے۔ اس حدیث کو بہت سے کملائے محدثین نے بیان فرمایا ہے۔ مثلاً شیخ صدوق رحؒ نے کتاب عیون الاخبار میں۔ علامہ مجلسی رحؒ نے کتاب بحار میں۔ نیز سید باقر داماد نے بھی اپنی کتاب میں اسے نقل فرمایا ہے +

یہ بھی معلوم رہنا چاہئے۔ کہ آفتاب کا طول بہ نسبت عرض کے کچھ زیادہ نہیں ہے کیونکہ اُس کا محیط ہر طرف سے مساوی ہے۔ لہٰذا اس حدیث میں طول و عرض سے مراد اُس کا محیط ہے۔ یعنی آفتاب کا محیط نوسو مضروب نوسو فرسخ ہے +

اس کلام سے صراحتاً یہ بات معلوم ہوتی ہے۔ کہ آفتاب کا محیط اس مقدار پر ہے۔ جو ابھی بیان ہوا۔ اور التزاماً یہ بھی اس سے سمجھ میں آتا ہے۔ آفتاب گول ہے۔ مثل دیگر سیارات کے نہیں ہے۔ کہ قطبین کی طرف سے مسطح ہو۔ اور یہ بات یوں سمجھ میں آتی ہے۔ کہ حضرتؑ نے اُس کے طول و عرض کو مساوی فرمایا ہے +

یہی دونوں باتیں جو اس روایت سے سمجھ میں آئیں۔ جدید فلاسفروں کی رائے سے موافق ہیں۔ دوسری بات کے متعلق تو مسٹر فانڈیک اپنی کتاب النقش فی الحجر میں آفتاب کے کرہ تام ہونے کے بیان میں لکھتے ہیں۔ کوئی دلیل اس بات پر نہیں ہے۔ کہ آفتاب کے

دونوں قطبی سرے مسطح ہوں"+

رہی دوسری بات ۔یعنی آفتاب کا (۹۰۰×۹۰۰ فرسخ) ہونا۔ تو اس کی نسبت بھی مسٹر فاندیک وغیرہ نے لکھا ہے کہ آفتاب کا محیط (۲۷۸۴۵۰) میل انگریزی ہے۔ اور یہ مقدار (۹۲۸۴۷۰) فرسخ ہے یعنی نو لاکھ اٹھائیس ہزار چار سو ستر فرسخ ہے انگریزی فرسخ کے اعتبار سے۔ اور یہ مطلب حدیث کے بیان سے بہت مطابق ہے۔ کیونکہ امام علیہ السلام نے مقدار محیط آفتاب کو (۹۰۰ فرسخ مضروب ۹۰۰ فرسخ) بتایا ہے اور حاصل ضرب (۸۱۰۰۰۰) ہوتا ہے یعنی آٹھ لاکھ دس ہزار فرسخ۔ جو زمانہ حال کی تحدید سے ایک لاکھ اور کچھ اوپر کم ہے۔ مگر سبب اس تفرقہ کا یہ ہے۔ کہ انگریزی میل اور فرسخ نسبت شرعی میل اور فرسخ کے چھوٹا ہے۔ کیونکہ انگریزی میل (۱۷۶۰) گز ہے۔ اور شرعی میل (۲۰۰۰) گز ہے۔ لہٰذا ہم اس زیادتی کو ہر میل کے انگریزی میل پر بڑھا دیں۔ تو تقریباً وہی مقدار اس سے پیدا ہوگی۔ جو مسٹر فاندیک نے بیان کی ہے۔ اور اگر پھر بھی کسی قدر فرق معلوم ہو۔ تو یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ مسٹر فاندیک کی طرف سے واقعی پیمائش میں تسامح ہوا۔ کیونکہ ابھی تک ان لوگوں کو اس پیمائش کا پورا یقین نہیں ہے +

میں سچ کہتا ہوں ۔ کہ اگر صرف یہی تحدید مقدار جسامت آفتاب صحیح ثابت ہو جائے۔ تو لوگوں کو ہمارے اس امام پر ایمان لانا چاہئے۔ اور ہرگز آئندہ کو عذر قابل سماعت نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ ایسے عالم اور حکیم کو چھوڑ کر دوسری طرف جانا کیا معنی۔ جس نے آج سے ایک ہزار برس بلکہ اس سے زیادہ قبل جبکہ کوئی ہئیتی یا حدسی طریقہ ایسا موجود نہ تھا جس سے آفتاب کی جسامت کی مقدار معلوم کی جا سکتی۔ اسے بیان فرما دیا۔ کیا یہ بات بغیر وحی و الہام کے یا بغیر اس کے کہ حضرت کی روح مقدس کو مبادی علویہ سے ارتباط تام حاصل تھا معلوم ہو سکتی ہے؟ اور اگر کسی کو ان کتابوں کی روایتوں میں شک ہو۔ تو وہ ہمارے بیان کئے ہوئے مطالب کو جو پہلے مقدمے میں اس کتاب کے درج کئے ہیں دیکھے۔ تاکہ اسے یقین ہو کہ ہمارا بیان مطابق ارشاد حدیث کے ہے یا نہیں +

اس مقام پر اگر کوئی معترض یہ کہے کہ سائل نے آفتاب و ماہتاب دونوں ہی کے طول و عرض سے سوال کیا ہے۔ اور معصوم علیہ السلام نے دونوں کو ملا کر ایک ہی جواب میں فرما دیا۔ کہ ۹۰۰×۹۰۰ فرسخ۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب و ماہتاب کی مقدار برابر ہے۔

حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ آفتاب کہیں ماہتاب سے بڑا ہے۔ تو کس طرح یہ بیان حضرت کا صحیح سمجھا جائے۔ (**میں اس کا جواب**) یہ دونگا۔ کہ اوّل تو بعض نسخوں میں احادیث کے صرف آفتاب کا ذکر ہے۔ یعنی سائل نے صرف آفتاب کی مساحت دریافت کی ہے۔ اور اگر فی الواقع ایسا ہی ہو۔ تو پھر اعتراض کا کوئی موقع نہیں ہے۔ **لیکن** اگر بالفرض مان لیا جائے۔ کہ سائل نے دونوں ہی کی مساحت دریافت کی ہے۔ اور حضرتؑ نے دونوں ہی کو ملاکر ایک جواب میں ارشاد کیا ہے۔ تب بھی ہم بنا بر جدید فلسفہ کے جواب دے سکتے ہیں۔ **اور وہ یہ ہے**۔ کہ کرہ میں طول و عرض سے مراد اُس کا محیط ہی ہوتا ہے۔ (کیونکہ کرہ میں حقیقی طول و عرض کا وجود ہی نہیں)۔ پس اس صورت میں حضرتؑ کے ارشاد کا یہ مطلب ہوگا۔ کہ شمس و قمر دونوں ہی کا محیط ۹۰۰×۹۰۰ فرسخ ہے۔ باقی رہا لفظ "**محیط**"۔ یہ دو چیزوں پر اطلاق ہوتا ہے۔ ایک دائرہ۔ دوسری سطح۔ اور لفظ محیط ان دونوں سے عام ہے۔ پس ہو سکتا ہے۔ کہ حضرتؑ نے اس مقام پر اس لفظ کو بطور عموم مجاز کے استعمال فرمایا ہو۔ یعنی دونوں معنی مراد لئے ہوں۔ ایک کو آفتاب کے لئے خاص کیا ہو۔ اور دوسرے کو ماہتاب کے لئے۔ بایں معنی کہ محیط آفتاب سے تو اُس کا دائرۂ محیط مراد ہو۔ اور ماہتاب کے واسطے سطح محیط مراد ہو۔ اور اس لحاظ سے مطلب بالکل درست ہو جائیگا۔ اور جدید فلسفہ سے بھی مطابق ہو جائیگا۔

محیط آفتاب کا بقدر حاصل ضرب (۹۰۰) فی نفسہ کے ہونا تو سابق میں معلوم ہو چکا۔ رہا چاند کا محیط بمعنی سطح کے ہونا۔ اور پھر اس کا بھی اسی قدر ہونا۔ تو اس وجہ سے ہے۔ کہ چاند کا قطر بنا بر تحقیق زمانہ حال دو ہزار میل ہے۔ پس لامحالہ وہ دائرہ جو اُسے محیط ہوگا۔ اُس کی مقدار چھ ہزار دو سو میل ہوگی۔ کیونکہ ثابت ہو چکا ہے۔ کہ قطر اور محیط کی نسبت سات اور بائیس کی ہوا کرتی ہے۔ اور جبکہ ہر کرہ کی مساحت کا حاصل ربع قطر کو دائرہ محیط میں ضرب دینے کا حاصل ضرب ہے۔ تو لامحالہ چاند کی سطح (۳۱۰۰۰۰۰) میل ہوگی۔ یعنی گیارہ ہزار فرسخ اور کچھ کسر انگریزی فرسخ کے اعتبار سے۔ اور مقدار (۹۰۰×۹۰۰) کے حاصل ضرب سے تین ہزار فرسخ سے کم ہوگی۔ اور جب آپ انگریزی اور شرعی میلوں اور فرسخوں کا تفاوت مٹالینگے۔ یعنی اُدھر کی زیادتی کو اس طرف کی کمی پر بڑھا لینگے۔ تو دونوں ہی عدد قریب قریب اور ایک دوسرے پر منطبق ہو جائینگے۔ اور کوئی بڑا فرق نہ رہیگا۔ ذرا اس مقام

پر اچھے غور سے کام لیجئے۔ کیونکہ مطلب مشکل ہے +

یہاں ایک سوال یہ بھی ہوتا ہے۔ کہ کتاب بحار تفسیر نور الثقلین۔ تفسیر قمی اور نسخہ فقیہ ابو اللیث سمرقندی میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ کسی نے جناب امیر المومنین علیہ السلام سے پوچھا کہ چاند کی مساحت کیا ہے۔ تو آپ نے فرمایا۔ (۴۰ فرسخ × ۴۰ فرسخ)۔ حالانکہ بیان سابق سے معلوم ہوا کہ (۹۰۰ فرسخ × ۹۰۰ فرسخ) ہے۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے۔ کہ جب کہ محیط کا لفظ دونوں ہی معنوں میں بولا جاتا ہے۔ دائرہ کو بھی محیط کہتے ہیں۔ اور سطح محیط کو بھی محیط کہتے ہیں۔ تو ہو سکتا ہے۔ کہ حدیث اوّل میں محیط سے مراد سطح محیط ہو جس کی مقدار ۹۰۰×۹۰۰ فرسخ بیان کی گئی ہے۔ اور اس حدیث میں محیط سے مراد دائرہ محیط ہو جس کی مقدار ۴۰×۴۰ بتائی گئی ہے۔ اور یہ دونوں ہی بجائے خود صحیح اور فلسفہ جدیدہ کے مطابق ہیں +

امر اول کو تو ہم نے بیان کر دیا۔ رہا امر ثانی یعنی دائرہ محیط قمر کی مساحت ۴۰×۴۰ فرسخ ہے۔ تو اس کی تفصیل یہ ہے۔ کہ ۴۰×۴۰ کا حاصل ضرب ۱۶۰۰ فرسخ ہوتا ہے۔ اور جدید فلسفہ کے بیان بموجب چاند کا دائرہ محیط قریب دو ہزار فرسخ انگریزی جو تقریباً ایک ہزار چھ سو فرسخ شرعی کے برابر ہی ہوتا ہے۔ وھو المطلوب +

تیسری بحث

جرم آفتاب کے وزن کے بیان میں

ہم نے اس سے پہلے حکمائے متقدمین اور متاخرین کا اختلاف اس بارے میں بیان کیا ہے۔ کہ آیا فلکی کُروں کے واسطے کوئی وزن ہے یا نہیں ہے۔ اور قدماء کی دلیلوں کی شرح بھی مفصل بیان کر دی ہے۔ جو انہوں نے عدم وزن کے متعلق بیان کی ہیں۔ (دیکھو مسئلہ حقیقت سماوات کی دسویں قسم کی اخبار کو)۔ اب یہاں دوبارہ بیان کرنیکی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن محصل اس کا یہ ہے کہ تمام قدماء حکماء کا اس پر اتفاق ہے۔ کہ وزن خواہ خفت ہو۔ یا ثقل۔ دونوں ہی اجرام فلکیہ میں نہیں پایا جا سکتا۔ یعنی فلک و شمس و قمر اور دیگر نجوم کو نہ خفیف کہا جا سکتا ہے۔ نہ ثقیل۔ نہ حار کہا جا سکتا ہے۔

نہ بارد۔ نیز ان لوگوں کے نزدیک کرات عناصر میں بھی وزن نہیں پایا جاتا۔ یعنی مثلاً خود کرۂ ہوا یا کرۂ ارض کو نہ خفیف کہ سکتے ہیں۔ نہ ثقیل۔ البتہ ان چاروں کروں کے اجزاء خفت اور ثقل کو قبول کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے کہ وہ اپنے مرکز کی طرف میل کرتے ہیں۔ لیکن باقی رہا اصل کرہ اور اُس کے مجموعہ اجزا تو نہ اُن میں میل ہے نہ وزن۔ جیساکہ مشروحاً بیان کیا گیا ہے۔

حکماء متاخرین جو ایک ہزار سنہ ہجری کے بعد ہوئے ہیں۔ اُن کا یہ دعوے ہے۔ جیساکہ حکیم کیلر جرمن نے جو علم ہیئت جدید کا رکن اعظم ہے سنہ ۱۶۰۷ عیسوی میں تحقیق کی ہے۔ کہ ان تمام کواکب اور فلکیات میں باعتبار زیادتی جذب اور کمی جذب کے ثقل اور خفت پائی جاتی ہے جس کا جذب قوی ہے وہ ثقیل ہے۔ اور جس کا جذب کم ہے وہ خفیف ہے۔ پس پتھر مثلاً پانی کی بنسبت کثیف ہے۔ اور زمین سے من حیث الاجزاء زیادہ مشابہ ہے۔ لہذا زمین کا پتھر کو اپنی طرف جذب کرنا زیادہ قوی و شدید ہوگا۔ اسی طرح پانی بنسبت ہوا کے زمین سے زیادہ مشابہ اور کثیف ہے۔ لہذا زمین کا جذب کرنا پانی کو زیادہ قوی ہے۔ اس لحاظ سے پانی بنسبت ہوا کے ثقیل ٹھیریگا۔ علے ہذا القیاس ہر جسم جب کسی دوسرے جسم کو اپنی طرف جذب کریگا۔ تو وہ ثقیل ہوگا۔ اور دوسرا خفیف۔ معلوم ہوا کہ منشا ثقل اور خفت کا قوت جذب اور ضعف جذب ہے۔ رہا جذب خود کیوں پیدا ہوتا ہے۔ کبھی تو جسم جاذب کا بنسبت جسم مجذوب کے بڑا ہونا۔ اور کبھی کثیف ہونا۔ اور کبھی اُس کے جوہر ذاتی کا قوی ہونا۔ وغیرہ امور ہیں۔ اسی قاعدہ کی بنیاد پر حکماء حال نے کرۂ ہوا اور کرۂ ارض اور کرۂ آب اور دیگر کرات ثوابت و سیار کے لئے ثقل و خفت ثابت کی ہے۔ جیساکہ ہم نے مسئلہ حقیقت سماوات میں کرۂ بخار کا ثقیل ہونا بیان کیا ہے۔ نیز جنتری الموید ۱۳۱۹ھ میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ اُس ہوا کا وزن جو زمین کو محیط ہے۔ زمین کے ایک ملین جز میں سے ایک جز کے بقدر ہے۔"

آفتاب کے وزن کی نسبت نجم الملک طہرانی نے سنہ ۱۳۲۰ ہجری کی جنتری میں لکھا ہے۔ کہ جوہر آفتاب (۳۲۵۰۰۰) درجہ سے زیادہ وزن رکھتا ہے۔ اور اگر ہم کوئی ایسا ہی کوئلے کا کرہ فرض کریں۔ جو حجم کے اعتبار سے آفتاب کے برابر ہو۔ تو وہ یقیناً آفتاب کی بنسبت وزن میں کم ہوگا۔ اور اگر فارسی خروار کے اعتبار سے ہم اس کا وزن دریافت کرنا چاہیں۔ تو آفتاب کا وزن (۲۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰) خروار

ہو گا۔ نیز رسالہ الہلال مصری کی ستر ھویں جلد کے چار سو اٹھتر صفحہ میں بیان کیا گیا ہے کہ آفتاب کا وزن (۳۵۴۹۳۶) گنا زمین کے وزن سے زیادہ ہے۔ اور ان لوگوں نے بعنوان مطالبہ کے بیان اور ان امور کی تحقیق میں مواد اور اوزان بنائے ہیں۔ عجب نہیں کہ وہ صحیح ہوں۔ اب آئیے **شریعت اسلامیہ کو دیکھئے۔ اس کا بیان** بھی آپ کو حکماء متاخرین کی رائے کے مطابق ہی ملیگا۔ کیونکہ یہ شریعت تمام اجسام کے واسطے وزن اور مقدار خاص کو بیان کرتی ہے۔ کیا زمین اور کیا آسمان۔ کیا ستارے اور ہوا۔ کیا آفتاب و ماہتاب بلکہ اس نے تو اُن چیزوں کے بھی اوزان بیان کردئے ہیں۔ جن کو ابھی حکماء حال نے بالکل بھی تحقیق نہیں کیا ہے۔ جیسے نور۔ سایہ اور **ظلمت** وغیرہ۔ جنہیں یہ لوگ ابھی محض عدم اور غیر قابل وزن سمجھتے ہیں۔ اور **کچھ تعجب نہیں ہے**۔ کہ آئندہ ان کا وجودی ور قابل الوزن ہونا موافق ظواہر شریعت کے ثابت ہوجائے۔ کیونکہ اس شریعت نے ہم کو ایسے ایسے عجیب امور تعلیم کردئے ہیں جن تک بڑے بڑے عقلا کی عقلیں بھی نہیں پہنچ سکی ہیں۔ دیکھئے علماء قدماء اور متاخرین دونوں ہی قرآن مجید میں ھو الذی خلق الموت و الحیوۃ کی تلاوت کرتے تھے۔ اور ہمیشہ یہی سمجھتے رہے۔ کہ موت ایک امر عدمی ہے کیونکر ممکن ہے۔ کہ اس سے خلق کا تعلق ہوسکے۔ حالانکہ اب جدید فلسفہ اس کی طرف مائل ہے کہ موت بھی مثل حیوۃ کے ایک وجودی صفت ہے جیسا کہ قرآن مجید کا بیان ہے۔ اور اس پر انھوں نے دلیلیں اور تحقیقیں بیان کی ہیں۔ یہاں پر ہم صرف چوتھے امام علیؑ بن الحسینؑ کا ایک قول اوزان کے متعلق پیش کرتے ہیں۔ جو ہمارے مدعا کے ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ حضرتؑ اپنی تسبیح میں فرماتے ہیں۔ سبحانک تعلم وزن السمٰوات سبحانک تعلم وزن الارضین سبحانک تعلم وزن الشمس والقمر سبحانک تعلم وزن الظلمۃ والنور سبحانک تعلم وزن الفیٔ والھوآء سبحانک تعلم وزن الریح کم ھی من مثقال ذرۃ۔ اور یہ دعا جہاں جہاں سے نقل ہوئی ہے۔ اُن سب کا پتہ ہم نے مسئلۂ حقیقت سماوات میں بیان کردیا ہے۔ واللہ اعلم بما خلق وھو اللطیف الخبیر۔

چوتھی بحث

آیا آفتاب ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والی چیز ہے۔ یا اسے فنا و زوال بھی ہوگا؟
اس بارے میں بھی حکمائے سابقین اور حال مختلف الرائے ہیں +
حکمائے متقدمین کی رائے یہ ہے۔ کہ افلاک مع اُن تمام چیزوں کے جو اُن کے ماتحت ہیں۔ خواہ وہ اجرام ہوں یا غیر اجرام ہمیشہ باقی رہنے والے ہیں۔ جن کے واسطے کبھی فنا نہیں متحرک ہیں۔ کبھی ان کو سستی اور سکون نہ عارض ہوگا۔ ہم ان کے اقوال کو اس مقام پر پیش کرنا نہیں چاہتے۔ کیونکہ اُن سے سوائے طول عمل کے کچھ حاصل نہیں ہے۔ اس سے پہلے ہم نے شیخ رئیس بو علی بن سینا کا قول مسئلہ فلک کے بیان میں نقل کر دیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ "مطلق فلک نہ قابل خرق و التیام ہے۔ اور نہ قابل کون و فساد۔ اور نہ قابل عدم و زوال۔ نہ اُس کی کوئی صفت متغیر ہوگی۔ اور نہ کبھی وہ اپنی حیز سے علیحدہ ہو سکیگا علٰے ہذا القیاس دیگر کواکب سیارہ و ثوابت بھی مثل شمس و قمر و نجوم کے جو اجسام کروی ہیں۔ اور جوہر فلک سے ان کی ترکیب ہے۔ لا زوال اور لا متغیر ہیں" نیز شیخ نے شفا کی چوتھی فصل میں لکھا ہے۔ کہ "حکماء کا اتفاق ہے۔ کہ عنصر فلک دیگر اجسام حادثہ کے عنصر سے بالکل الگ ہے۔" ان ہی حکماء یونانین کے اتباع میں بہت سے حکمائے اسلام بھی اسی امر کے قائل ہو گئے ہیں۔ چنانچہ شیخ رئیس کے قول کو آپ نے ابھی ملاحظہ فرمایا۔ جس کی وجہ سے اُس وقت سے ایکر اسوقت تک مسلمان علما اور مسلمان حکما میں برابر بحث و نزاع ہوتی رہی۔ وہ کہتے رہے۔ کہ تمام عالم خواہ فلکی ہوں یا عنصری سب زوال پذیر ہیں۔ اور یہ اُس کی بخلاف رائے پر قائم رہے +

رہے حکمائے مغرب یعنی یورپین فلاسفر۔ تو از بسکہ ان لوگوں نے تقلید کی رسّی اپنی گردنوں سے نکال ڈالی ہے۔ اور بذات خود تحقیق کرنا بہتر سمجھتے ہیں۔ اس وجہ سے بعد تحقیقات اس امر کو طے کر دیا ہے۔ کہ تمام اجرام عالم خواہ آفتاب ہو یا چاند۔ ستارہ ہو یا زمین۔ یا اس کے علاوہ سب کے سب حادث بالذات اور حادث بالزمان ہیں۔ اور کون و فساد کو قبول کرنے والے یعنی یہ کہ ایک وقت نہ تھے۔ پھر پیدا ہوئے۔ اور پھر فنا بھی ہو جائینگے

نہ آفتاب باقی رہیگا نہ ماہتاب - نہ زمین رہیگی نہ آسمان - نہ ستارے رہینگے اور نہ افلاک -
اگر آپ کو اس کی تحقیق زیادہ مقصود ہو تو باب مبدء خلقت میں ان کے اقوال و آراء کو
ملاحظہ فرمایئے معلوم ہوگا - کہ اگرچہ ان میں باہم مبدء خلقت کے معاملہ میں اختلاف ہے -
لیکن اصل حدوث میں ان اجرام کے بالکل بحث نہیں ہے بلکہ متفق اللفظ سب کی
یہی رائے ہے - کہ یہ تمام اجسام و اجرام عدم سے وجود میں آ گئے ہیں - اور پھر ایک وقت
میں معدوم بھی ہو جائینگے جس پر شاہد وہ عجیب و غریب چیزیں ہیں - جو ان لوگوں نے مختلف
وقتوں میں زمین کے نیچے سے نکالی ہیں - مثلاً تصویریں عمارتوں کے نقشے - آثار حکماء
قدماء وغیرہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں کس زمانے میں تھیں - کن لوگوں نے
ان کو بنایا تھا - کب وہ فنا ہو گئے - اور یہ بھی پتہ چلتا ہے - کہ فلاں فلاں حصے زمین
کے کب کب معمور رہے - اور کب ویران ہوئے - پہاڑوں کی کتنی عمر ہے - اور کیا کیا حالات
ان پر طاری ہوتے ہیں - نباتات کب سے پیدا ہوئے - اور کیا کیا تغیرات اُن پر طاری
ہوتے ہیں حیوانات کب سے پیدا ہوئے ہیں - اور انسان کا تولد و تکون کب سے ہوا -
(اگر ان امور کی تحقیق و تفصیل معلوم کرنی ہو - تو علم جیالوجی اور بیالوجی کی کتابیں مطالعہ
کیجئے) - نیز حرارت اور نور کے اوزان - اور آفتاب کی حرارت - اور اُس کے نور کا مختلف
زمانوں میں کم و بیش ہونا - اور آفتاب کے حالات - اور یہ کہ کب اس کی آگ بالکل بجھ جائیگی -
جس کے بعد یہ آفتاب آفتاب نہ رہیگا سب کچھ معلوم کر لیا ہے - اگرچہ ان امور کے دریافت
کرنے میں ذہن انسانی بشرطیکہ صحیح اور کامل ہو - کافی ہو سکتا ہے - لیکن اگر شواہد ظاہرہ
بھی اُس کے موید مل جائیں - تو بالکل وجدانی ہو جاتا ہے - چنانچہ آج کل کے شواہد کے
دیکھنے کے بعد پھر کسی کو موقع انکار کا باقی نہیں رہتا +

اب آیئے شریعت اسلامیہ کے اقوال کی سیر کیجئے - جس کی
آوازے نے چاردانگ عالم کو گھیر لیا ہے - وہ بھی صریح طور پر عالم کے حدوث کی قائل ہے -
اور یہ کہ اُس کے تمام اجزاء عدم سے وجود میں آئے ہیں - نہ یہ کہ یہ سب قدیم اور ازلی ہوں -
بلکہ دراصل شریعت اسلامیہ کا مدار ہی اس پر ہے کہ سوائے باری تعالےٰ کے جو کچھ بھی ہے -
فانی و باطل ہے - پس ذات خدائے احد صمد قدیم و ازلی اور ابدی سرمدی ہے - کل شیء
ھالک الا وجھہ - کل من علیھا فان ویبقی وجہ ربک ذو الجلال والاکرام -

جس سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہماری شریعت کی تعلیم بالکل مخالف ہے تعلیم حکماء سابقین سے اور مطابق ہے اُن تحقیقات کے جو یورپین حکماء نے کی ہیں۔ دیکھئے خدا ے تعالےٰ احوال و قیامت کے بارے میں قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے۔ (سورۂ ۸۱) اذا الشمس کوّرت "جبکہ آفتاب کا نور اور اُس کی حرارت بالکل زائل ہو جائیگی"۔ واذا النجوم انکدرت واذا الجبال سُیّرت واذا السماء کشطت "جبکہ ستارے دھندلے ہو جائینگے۔ اور پہاڑ اپنی جگہ پر باقی نہ رہینگے۔ آسمان کی کھال کھینچی جائیگی" (یعنی معدوم کردئے جائینگے)۔ پھر (سورۂ ۸۲) میں فرمایا ہے۔ واذا السماء انفطرت واذا الکواکب انتثرت واذا البحار فجرت واذا القبور بعثرت علمت نفس ما قدمت واخرت۔ "جبکہ آسمان پھٹ جائیگا۔ ستارے بکھر جائینگے۔ دریا شگافتہ ہو جائینگے۔ قبروں سے مُردے نکالے جائینگے۔ اُس وقت معلوم ہوگا۔ کہ انسان نے دنیا میں کیسے اعمال کئے تھے۔ اور اُس کا نتیجہ کیا ملیگا"۔ نیز (سورۂ ۸۴) میں فرمایا ہے۔ واذا الارض مُدّت والقت ما فیہا وتخلت "جبکہ زمین کھینچی جائیگی۔ اور جو کچھ اُس کے اندر ہے۔ اُسے نکال باہر کردیگی"۔ (سورۂ قارعہ) میں فرمایا ہے۔ وتکون الجبال کالعھن المنفوش "پہاڑ مثل دھنکی ہوئی رُوئی کے ہو جائینگے"۔ علےٰ ہذا القیاس اور بہت سے اقوال شریعت ہیں۔ جو بآواز بلند فنا و زوال عالم کی خبر دے رہے ہیں۔ نیز جو کچھ بانی شریعت اسلامیہ یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُن کے اوصیاء کرام علیہم السلام اور نواب ذوی الاحترام نے اس باب میں ارشاد فرمایا ہے۔ اور بتواتر ہم تک پہنچی ہے۔ اُس کا حاصل بھی یہی ہے۔ کہ تمام عالم اور اُس کے اجزاء خواہ وہ آفتاب ہو یا ماہتاب ستارے ہوں یا پتھر عدم سے وجود میں آئے ہیں۔ اور ہرگز قدیم نہیں ہیں۔ البتہ ذات پروردگار عالم قدیم ہے۔ اور وہی سب سے متقدم ہے +

دیکھئے کتنی حدیثیں بآواز بلند کہہ رہی ہیں۔ کہ خدا ے تعالےٰ جل مجدہ نے فلاں شئے کو اُس وقت پیدا کیا۔ جب کہ آفتاب تھا نہ ماہتاب۔ آسمان تھا نہ زمین۔ نہ کذا نہ کذا۔ اور کیا کچھ نہیں ہماری شریعت نے حالات قیامت اور روز معاد کے متعلق ارشاد فرمایا ہے۔ جسے ان امور کی تفصیل مقصود ہو۔ وہ کتاب بحار یا اصول کافی یا نہج البلاغہ یا کسی اور حدیث کی کتاب کو دیکھے۔ معلوم ہوگا۔ کہ ہمارے حکیم شریعت اور ہمارے برحق حکماے دین نے واقعی مطالب کو کس طرح اور کن کن پیرایوں میں بیان فرمایا ہے +

کہیں آپ کو یہ خیال نہ گزرے۔ کہ یہ حالات فنا و زوال و تغیر و حدوث صرف آسمان و زمین۔
انجم و شمس و قمر ہی پر طاری ہوئے یا ہونگے۔ بلکہ کل سیاروں پر واقع ہوتے اور ہونگے۔ خواہ
وہ سیارے ہوں یا ثابت۔ کیونکہ بالعموم پروردگار عالم فرماتا ہے "واذا النجوم انکدرت واذا الکواکب
انتثرت" اور (سورۂ ۷۷) میں فرماتا ہے "فاذا النجوم طمست" اور یہ بالکل مطابق جدید تحقیقات
سے ہے۔ چنانچہ مسٹر فانڈیک امریکی نے کتاب النقش فی الحجر کے باب سدام میں لکھا ہے۔
کہ ہر جرم روشن کی حرارت اور اُس کا نور ایک نہ ایک روز ضرور فنا ہو جائیگا۔ خواہ وہ کوئلے
کی آگ ہو یا آفتاب کی حرارت۔ یا کسی اور ستارے کا نور و حرارت جو قبہ سما میں ہے۔" نیز
کتاب ارواء الظما میں لکھتے ہیں "جب کہ کسی ستارہ کی روشنی گھٹ جائے۔ اس طور پر
کہ اُس کے گرد منفصل شعاعیں دکھائی دینے لگیں۔ یعنی اُن شعاعوں کے درمیان مختلف
رنگ محسوس ہوں۔ تو اُس وقت سمجھ لینا چاہئے۔ کہ اب اس ستارہ کا دور ختم ہوا۔ اس وقت
اُسے مثلاً آفتاب نہ کہینگے۔ اور اکثر ایسا ہوگا۔ کہ اُس وقت سدیم بن جائیگا۔

یہ جتنے ستارے دکھائی دیتے ہیں سب ایک قوت کے نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے درجات
متفاوت ہیں۔ بعض کی حرارت اور نور زائد ہی ہے۔ بعض کا نور اور اُس کی حرارت کم ہے۔
بعضے ایسے ہیں۔ جن میں برودت شروع ہو گئی ہے۔ اور بعضے سن شیخوخت اور پیری میں
پہنچ گئے ہیں۔ پھر اس کے بعد فانڈیک نے اُس قسم کے ستاروں کے ذکر کے بعد جو
قسم اول میں داخل ہیں۔ جیسے ستارہ شعری یمانیہ لکھا ہے۔ دوسری قسم کے وہ ستارے
ہیں۔ جو ہمارے آفتاب سے مشابہ ہیں۔ جو اپنی عمر کا معتد بہ حصہ تمام کر چکے۔ اور انحطاط و
شیخوخت کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ جیسے عیّوق اور دب اکبر وغیرہ۔ اور بعض ابھی دونوں
قسموں کے درمیان درمیان ہیں۔ مثلاً شعری شامیہ اور نسر طائر اور ستارہ قطب وغیرہ۔

اس کلام سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہمارے اس آفتاب کا زمانہ شباب ختم ہو چکا ہے۔
اور اس کے زوال کا زمانہ قریب آگیا ہے۔ یعنی عنقریب قیامت قایم ہونے والی اور
نظام عالم مختل ہو جانے والا ہے۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ واقترب الوعد
الحق فاذا ھی شاخصۃ ابصار الذین کفروا یا ویلنا قد کنا فی غفلۃ من ھذا
بل کنا ظالمین۔ یعنی "وعدۂ حق نزدیک آگیا۔ (قیامت قریب آگئی ہے)۔ تو ناگاہ آنکھیں اُن
لوگوں کی جو کافر ہو گئے ہیں۔ اوپر کو اُٹھی رہ جائینگی۔ اور کہینگے۔ کہ افسوس ہم اس سے بالکل

غافل تھے۔ بلکہ اپنے نفسوں پر ظلم کر رہے تھے۔" اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت حدوث و زوال اشیاء عالم کا ہو سکتا ہے۔ جن میں آفتاب و ماہتاب سب ہی داخل ہیں +

پانچویں بحث

آفتاب ایک ہی ہے یا کئی ہیں؟

ہبتہ الدین مؤلف کتاب ہذا عرض کرتا ہے۔ کہ قدماء فلسفین عام طور پر قائل رہے ہیں۔ کہ آفتاب صرف ایک ہی ہے۔ دوسرا کوئی آفتاب سوائے اس آفتاب کے عالم وجود میں نہ تھا۔ نہ ہے۔ اور نہ ہوگا۔ بلکہ کلی منحصر فی فرد واحد کی طرح یہ بھی ایک ہی فرد میں منحصر ہے۔ یہاں تک کہ جب کبھی کسی منحصر فی فرد واحد کی مثال دینا چاہتے تھے تو آفتاب ہی کو بالخصوص ذکر کرتے تھے۔ ہم نے اس وقت تک کسی کو نہیں دیکھا۔ کہ ایک سے زیادہ آفتاب کا قائل رہا ہو۔ کیونکہ اُن کے حس و عقل نے اس سے زائد کا پتہ ہی نہ دیا تھا +

حس کا نہ محسوس کرنا تو واضح ہے۔ کہ آج تک سوائے ایک آفتاب اور چند روشن ستاروں کے آنکھ سے دکھائی ہی نہ دیتے تھے۔ اور اُس میں بھی یہ تفرقہ نہ معلوم ہو سکا تھا۔ کہ کس کا نور اصلی اور ذاتی اور کس کا نور اکتسابی ہے۔ اور نہ یہ محسوس ہو سکا تھا کہ کون ستارہ کس کرہ کے گرد حرکت کرتا ہے۔ اور نہ کوئی نظام علیحدہ اس نظام قدیم سے معلوم ہوا تھا +

رہی عقل۔ تو اُس کی طرف سے کوئی خاص داعی اس امر کا موجود نہ تھا۔ جس کی وجہ سے کسی دوسرے آفتاب کے وجود کے قائل ہوتے۔ بلکہ جو دلیلیں اُن کے سامنے موجود تھیں۔ اُن سے نفی دوسرے آفتاب کی ہوتی تھی۔ کیونکہ اُن کی رائے میں عالم ایک کلی حیز تھا۔ جو منحصر تھا انہیں افراد مشہودہ و معروفہ میں جو محسوس و مرصود ہو چکے تھے جس کا مرکز مقعر زمین تھا۔ اور محیط اُس کا محدب فلک الافلاک +

غایۃ الامر یہ تھی۔ کہ ان لوگوں نے عالم کے کروں کو تیرہ کروں پر تقسیم کیا تھا جو تبۃ

مثل پیاز کے چھلکوں کے تھے۔ جن میں سے چار تو عناصر اربعہ کے کرے تھے۔ اور باقی نو افلاک تسعہ کے۔ جیسا کہ ہم نے صدر مقدمہ ششم میں اس کتاب کے بیان کر دیا ہے۔

اُن کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ کل ثوابت سیارے ہمارے ہی عالم اور ہمارے ہی نظام شمسی میں داخل اور ہمارے ہی زمین کے گرد گھومنے والے ہیں۔ جو چوبیس گھنٹہ میں اپنا دورہ تمام کرتے ہیں۔ جس طرح ماہتاب ہر مہینے میں ایک دورہ زمین کے گرد پورا کر لیتا ہے +

ان لوگوں کا یہ بھی اعتقاد ہے۔ کہ فلک الافلاک تمام افلاک ثوابت کو محیط ہے۔ اور وہی ان سب کو حرکت دیتا ہے۔ جو ایک شب و روز میں تمام ہوتی ہے۔ اور یہ کہ شخن فلک الافلاک تمام عالم وجود کو محیط ہے۔ اور یہ کہ اُس کے بعد دُوسرا کوئی عالم ہی نہیں ہے +

خلاصہ یہ کہ حکمائے سابقین کی رائے کے بموجب نہ دُوسرا کوئی عالم ہے۔ اور نہ دُوسرا کوئی آفتاب۔ اور نہ دُوسرا کوئی چاند۔ بلکہ دیگر سیارات و ثوابت بھی تقریباً آفتاب ہی کے نور سے اکتساب ضیا کرتے ہیں۔ البتہ شیخ رئیس نے لکھا ہے۔ کہ ثوابت سیارے بنفسہٖ روشن ہیں۔ لیکن نہ اس طور پر کہ وہ بجائے خود آفتاب ہیں کسی اور عالم کے۔ کیونکہ محض اُن کا بذاتہ روشن ہونا اُن کا آفتاب ہونا ثابت نہیں کرتا۔ بلکہ اُن کے آفتاب ہونے کے لئے یہ درکار ہے۔ کہ اُن کے لئے کوئی عالم اور علاوہ اس عالم کے ہو۔ اور اُن کا نظام بھی اس نظام سے الگ ہو۔ اور وہ معلوم نہیں +

شیخ رئیس کا یہ بھی خیال ہے۔ کہ تمام ثوابت آٹھویں آسمان کے شخن میں جڑے ہوئے ہیں۔ جن کا کوئی خاص نظام علیحدہ نہیں ہے۔ بلکہ اسی عالم کے نظام کے وہ بھی تابع ہیں۔ اس کی رائے میں بھی آفتاب ایک ہی ہے +

ہاں اس زمانے کے حکمائے نے البتہ بہت سے آفتاب بیان کئے ہیں۔ اور اس پر دلائل قویہ قائم کر کے دکھلا دیا ہے۔ کہ قدماء حکماء کی رائے اس باب میں بالکل غلط تھی۔ علاوہ اس کے ستارہائے ثوابت کی روشنی کے درجات کی تحقیق بھی کی ہے۔ اور یہ کہ اُن میں کون کون سے عنصر پائے جاتے ہیں۔ اور اُن کی مساحت اور اُن کا بُعد کس

قدر ہے +

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ ثوابت ستارے بجائے خود ایک ایک آفتاب ہیں۔ جو فضا میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ مگر بسبب دوری کے ہمیں اُن کی گردش محسوس نہیں ہوتی۔ اور یہ کہ ان کو ہمارے اس نظام شمسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ ان سب کے نظام علیحدہ علیحدہ ہیں۔ ان کی زمین الگ ہے۔ ان کا آسمان علیحدہ۔ ان کے چاند الگ ہیں۔ اور ان کے ستارے جداگانہ +

اب اگر شریعت اسلامیہ پر نظر ڈالیں۔ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان مغربی حکماء سے کئی صدی پیشتر اس محترم رائے کو ظاہر فرما دیا ہے۔ اور بہت سے موقعوں پر تصریح سے فرما دیا ہے۔ کہ کئی آفتاب اس عالم میں موجود ہیں۔ اور چاند بھی متعدد ہیں۔ لیکن چونکہ حامیان شریعت اور حاملان اسرار الٰہیہ نے صرف بیان کر دینے ہی پر اکتفا فرمائی تھی۔ کوئی دلیل اُس کے ساتھ متضمن نہ کی تھی۔ اس وجہ سے پرانے فلسفے کے ماننے والے علما ان اقوال کی تاویلیں کیا کرتے تھے۔ اور لوگوں سے کہا کرتے تھے۔ کہ بھائی اگرچہ ان احادیث کا بیان اس طور پر ہے۔ لیکن دراصل اس سے کسی اور خفی مطلب کی طرف اشارہ ہے۔ ہم خدا کا ہزار شکر کرتے ہیں۔ کہ اس زمانے میں اُس نے ہمیں اُن احادیث کے حقیقی اور واقعی مطلب کے سمجھنے کا موقع دیا۔ ملاحظہ ہو کتاب بصائر الدرجات تالیف جناب شیخ صفار متوفی سنہ ۲۹۰ ہجری اور کتاب منتخب البصائر۔ کتاب روضۃ الوافی۔ ساتویں اور چودھویں جلد بحار الانوار مجلسیؒ متوفی سنہ ۱۱۱۰ ہجری جن میں چھٹے امام جناب ابوعبداللہ الصادق جعفر بن محمد علیہم السلام سے مروی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ کہ "تمہارے اس آفتاب کے علاوہ چالیس آفتاب اور بھی ہیں۔ جن میں بہت سی خلقت خدا کی بود و باش ہے۔ اور تمہارے اس چاند کے علاوہ بھی چالیس چاند (یعنی بہت سے) ہیں۔ جن میں بہت سی مخلوق خدا آباد ہے۔ اور جنہیں یہ بھی خبر نہیں کہ آدم پیدا ہوئے یا نہیں +

✱ ان من وراء عین شمسکم هذه اربعین عین شمس فیها خلق کثیر و ان من وراء قمرکم هذا اربعین قمرا فیها خلق کثیر لا یدرون ان اللّٰہ خلق آدم ام لم یخلقه ✱

اس حدیث شریف میں صراحتہً کئی آفتابوں کا ہونا بیان فرمایا گیا ہے۔ جو ہمارے نظام شمسی سے الگ ہیں۔ جیسا کہ متاخرین حکماء نے اس زمانے میں دعوے کیا ہے۔ مگر تعجب ہے۔ کہ باوجود اس صراحت کے ہمارے علماء سابقین کیونکر ان احادیث کی تاویلیں غیر معانی حقیقیہ کی طرف کرتے تھے۔ باوجودیکہ امام علیہ السلام نے اپنے کلام کو ایسی تاکید سے

موکد فرمایا ہے جس میں تاویل کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی۔ کبھی لفظ ھذا فرما کر اور کبھی عینین کو مکرر کرکے۔ مگر ہم اس بارے میں اپنے علماء کو معذور سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے پاس کوئی آلہ ایسا نہیں تھا جس سے وہ اس کلام پاک کی تصدیق کر سکتے۔ کیونکہ زیادہ سے زیادہ اُن کے ہاتھ میں صرف فلسفہ قدیمہ تھا جو ایسے کلام کے تسلیم کرنے سے بالکل روکتا تھا +

باقی رہا یہ امر کہ حضرت ؑ نے فرمایا ہے۔ (تمہارے اس آفتاب کے علاوہ چالیس آفتاب اور ہیں)۔ اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ عربی زبان میں چار۔ چالیس۔ سات۔ ستر۔ سو اور پانچ سو وغیرہ الفاظ محض کثرت کے اظہار کے موقع پر استعمال کرتے ہیں۔ پس ممکن ہے۔ کہ معصوم ؑ نے چالیس کا لفظ محض بمعنیٰ "بہت سے" کے استعمال فرمایا ہو یعنی بہت سے آفتاب ہیں جس کے ماتحت دس بیس پچاس سب داخل ہو سکتے ہیں۔ بلکہ ہزاروں کو بھی یہ لفظ شامل ہوگا +

دوسرے یہ بھی ممکن ہے۔ کہ اُس وقت جو لوگ سُننے والے تھے۔ اس سے زیادہ کا تحمل اُن کو نہ تھا۔ اس وجہ سے اسی قدر کی تعداد پر حضرت ؑ نے اکتفا فرمائی۔ بظاہر اسی وجہ سے ایک اور روایت میں صرف بارہ ہے۔ اور ایک اور تیسری روایت میں بغیر بیان عدد کے تعدد ظاہر فرمایا ہے۔ جس کا منشا صرف یہی ہو سکتا ہے۔ کہ سامعین کو چونکہ ایک ہی آفتاب نظر آتا تھا۔ اور اس سے زیادہ کا یقین اُن کے لئے نہایت دشوار تھا۔ اس وجہ سے معصوم ؑ نے آہستہ آہستہ اپنے بیان میں ترقی کی۔ پہلے مطلقاً تعدد کو بیان کیا۔ جب اُسے مان گئے۔ تو بارہ تک ارشاد فرمایا جب اُسے بھی تسلیم کر چکے۔ تو چالیس کو ارشاد کیا +

تیسرے یہ کہ یہ جتنے آفتاب آج کل محسوس کئے گئے ہیں۔ ان سب کی بابت حکماء حال کا خیال ہے کہ اول اول یہ مثل ایک مٹی کے بڑے ٹیلے اور گرم گیسوں کے تھے۔ پھر ان میں بسبب برودت کے انقباض اور تقلص (سمٹنا) اور بسبب شعاعوں کے انبساط اور تمدد (پھیلنا) پیدا ہوتا۔ ان دو باتوں کی وجہ سے حرکت دوری ان میں شروع ہوئی۔ اور وہ زمانہ بزمانہ بڑھتی رہی یہاں تک کہ یہ بڑا ٹیلہ اپنے دوران وضعی کے سبب کرہ بن گیا۔ پھر چند دنوں بعد برودت کے اثر سے اُن پر ایک کھال پیدا ہو گئی۔ جو برابر سخت ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک زمانے میں وہ کھال اُس پر سے اکھڑ گئی۔ اور جو جلد اُس سے علیحدہ

ہوتی ہے۔ وہ بھی اُس اصلی کرے کے ساتھ وعدے میں شریک ہے۔ اور جو حالات اُس پر طاری ہوتے ہیں۔ وہی اس پر بھی طاری ہوتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اس پر مختلف حالات مختلف زمانوں میں طاری ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ اُن میں اس بات کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ کہ ذی حیات اُن میں رہ کر زندگی بسر کر سکیں۔ اور جمادات و نباتات پیدا ہو سکیں۔ اُس وقت وہ ٹیلہ آفتاب بنتا ہے۔ جس کا نظام بھی علیحدہ ہوتا ہے۔ اُس کے عالم اور حیوانات اور کائنات بھی جداگانہ ہوتے ہیں۔ اس بنا پر ممکن ہے۔ کہ جس وقت معصوم علیہ السلام نے فرمایا تھا۔ کہ چالیس آفتاب ہیں اُس وقت ان ثوابت میں وہ قابلیت نہ پیدا ہوئی ہو۔ جس کے سبب سے اُن کو آفتاب کہا جا سکتا۔ اور اب کہ بارہ سو برس کا زمانہ گذر گیا۔ ممکن ہے۔ کہ اتنے زمانے میں دیگر ثوابت نے بھی قابلیت شمس ہونے کی پیدا کر لی ہو جس سے اب چالیس سے زیادہ معلوم ہوتے ہوں۔ لیکن پہلی دو توجیہیں بہ نسبت اس تیسری وجہ کے زیادہ قوی ہیں۔ کیونکہ اس وجہ کی معارض کچھ اور حدیثیں ہیں۔ جو تعدد عالم کی بابت وارد ہوئی ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُن ثوابت میں ہزار و ہی مخلوق موجود ہیں۔ (مترجم عرض کرتا ہے۔ کہ بالکل ان حدیثوں میں اور وجہ مذکور میں منافات نہیں ہے۔ کیونکہ تعدد عالم کا مسئلہ چالیس کے عدد کو کب مضر ہو سکتا ہے۔ البتہ اس کے بعد کا بیان کسی قدر منافی ہے۔ جسے خود مصنف نے دفع کر دیا ہے) +

اس حدیث میں حضرت ؑ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے۔ کہ "**آفتاب و ماہتاب میں بہت سی مخلوق آباد ہے**"۔ بظاہر یہ کلام تحقیق جدید کے مخالف ہے۔ کیونکہ حکمائے حال کی رائے یہ ہے۔ کہ آفتاب و ماہتاب دونوں ہی میں اسباب تعیش موجود نہیں ہیں۔ مثلاً ہوا نہیں ہے۔ پانی نہیں ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر ممکن ہے۔ کہ حضرت ؑ کی مراد آفتاب و ماہتاب کی مخلوق سے اُن کے نظام کی مخلوق ہوں۔ یعنی ہر آفتاب کے نظام میں مخلوقات کثیرہ ہیں۔ نہ یہ کہ خود آفتاب میں مخلوقات کثیرہ ہیں +

ہاں یاد آیا۔ دیکھئے اُستاد ہرشل جس نے ستارۂ اورانوس کو دریافت کیا ہے۔ اور (اراغو) وغیرہ متاخرین نے بیان کیا ہے۔ کہ کل اجرام بلا استثناء قابل سکونت ہیں جن میں مخلوقات آباد ہے۔ حتےٰ کہ شمس و قمر میں بھی۔ غایۃ الامر یہ ہے۔ کہ ہر ایک میں اُس کے قابل مخلوق ہے یعنی جیسی مخلوقات کے رہنے کی اُن اجرام میں صلاحیت ہے۔ ویسی ہی

مخلوقات وہاں ہیں۔ یہ کیا ضروری ہے۔ کہ سب میں آدمی ہی آباد ہوں۔ یا زمین ہی کے سے حیوانات ہوں کیوں ایسے نہ ہوں۔ جیسے آگ میں سمندر پیدا ہوتا اور اُس میں زندہ رہتا ہے۔ نیز یہ کہ حدیث میں کسی مخلوق خاص کو تو بیان فرمایا ہی نہیں ہے۔ بلکہ صرف مخلوق کہا ہے۔ کیا معلوم کہ وہ جمادات کی قسم سے ہیں یا نباتات کی۔ حیوانات کی قسم سے ہیں یا کسی اور صنف کے۔ اور حکماء نے حال ہی میں کب تحقیق کرلی ہے۔ کہ فلاں سیارہ میں فلاں قسم کے موجودات ہیں۔ سوائے اس کے کہ ظن و تخمین سے کام لیا گیا ہے۔

اس حدیث میں چاند کی بابت یہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ اس میں ایسی مخلوقات رہتی ہیں جو زندہ اور ناطق مثل انسان کے ہیں۔ کیونکہ امام علیہ السلام نے اُن کی نسبت یہ فرمایا ہے۔ کہ وہ یہ نہیں جانتے۔ کہ آدم زمین پر پیدا کئے گئے یا نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ دراصل اُن میں علم اور درایت کی قابلیت موجود ہے۔ لیکن صرف اُنہیں امر مذکور کا علم نہیں ہے۔ کیونکہ آپ نے یہ نہیں فرمایا۔ کہ وہ بالکل کچھ نہیں جانتے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ وہ زندہ اور ناطق ہیں۔ لیکن بحث صرف اس میں رہیگی۔ کہ آیا وہ انسان کی قسم میں سے ہیں یا ملائکہ کی قسم میں سے۔

مجھ سے بعض فضلاء معتمدین نے یہ بھی بیان کیا ہے۔ کہ جناب امیر المومنین ؑ نے یہ بھی فرمایا ہے۔ کہ تمہارے چاند میں ایک ایسی خلقت ہے۔ جو زراعت کرنیکی قابلیت رکھتی ہے۔ مگر ابھی میں نے اس حدیث کو کسی کتاب میں نہیں پایا۔ خلاصہ یہ کہ ظواہر شریعت چاند میں مخلوقات ہونے کو ظاہر کر رہے ہیں۔ اور ہم اس بنا پر کہ یہ بات مشہور کے خلاف ہے۔ اس سے انکار نہیں کرسکتے۔ کیونکہ بہت سے فلاسفر متاخرین نے مشہور کی مخالفت کی ہے۔ اور ہمارے اس چاند میں حیوانات کے وجود کے قائل ہوئے ہیں۔ جیسے مسٹر ہوک مسٹر ہرشل۔ مسٹر کاک۔ مسٹر کاسنے۔ مسٹر اراغو۔ جیسا کہ حدائق النجوم میں لکھا ہے۔ مشتاک اور بیکرن صاحب کی بھی یہی رائے ہے۔ جس پر وہ لوگ اپنی دلائل اور شواہد پیش کرتے ہیں۔ اور اگر یہ بات صحیح مان لی جائے۔ تو ہمیں آئندہ انتظار کرنیکا موقع ہے۔ کہ انشاء اللہ جب آلات اس سے بھی زیادہ مکمل ہو جائینگے۔ اور علوم کی اس سے بھی زیادہ ترقی ہوگی۔ جیسا کہ قرینہ سے معلوم ہو رہا ہے۔ تو یہ حقیقت بھی واضح ہو جائیگی۔ جس طرح اور بہت سی چیزوں کی حقیقت اور صحت معلوم ہوئی۔ جنہیں ہمارے رسول معظم اور اُن کے اوصیاء کرام

نے بیان فرمایا تھا۔ باوجودیکہ قدماء کی رائے کے بالکل مخالف تھیں +

دوسری حدیث جو ہمیں اس باب میں ملی ہے وہ ہم بحار الانوار مجلسی رح اور درمنثور سیوطی رح سے نقل کرتے ہیں۔ جو ان دو حدیثوں سے پہلے گذرے ہیں کہ خدائے تعالےٰ جمعہ کے روز تین ساعت میں اپنے عرش پر متسلط ہوا۔ اور ایک ساعت میں آفتابوں کو پیدا کیا۔ (یعنی بہت سے آفتاب)۔ یہ حدیث بھی صریح طور پر تعدد آفتاب کو بیان کرتی ہے۔ باقی رہے اس حدیث کے اور الفاظ۔ وہ ابھی مجمل اور متشابہ ہیں۔ جن کا کوئی مطلب ہم ابھی یقینی طور پر نہیں بیان کرسکتے۔ ممکن ہے۔ کہ آئندہ اس اجمال کے رخ پر سے بھی پردہ اٹھ جائے۔ اور یہ راز بھی مثل دیگر رازوں کے منکشف ہوجائے +

تیسری روایت طبرسی علیہ الرحمہ نے جو پانچویں صدی ہجری کے لوگوں میں سے ہیں۔ کتاب احتجاج میں اور محدث جلیل صفار نے باب (۱۰۵) کتاب بصائر الدرجات میں اور جناب شیخ مفید متوفی سنہ ۴۱۳ ہجری نے منتخب الاختصاص میں اور مجلسی رح نے ساتویں اور چودھویں جلد میں بحار کی باسانید قویہ چھٹے امام جعفر بن محمد الصادق علیہ السلام سے ایک حدیث میں بیان کیا ہے۔ کہ آپ نے ایک یمنی عالم سے آفتاب کی صفت میں ارشاد فرمایا۔ کہ آفتاب کو اگر حکم دیا جائے۔ تو وہ بارہ آفتابوں اور بارہ چاندوں اور بارہ مشرق اور بارہ مغرب اور بارہ دریا اور بارہ عالم کو طے کرتا ہوا گذرے۔ اس حدیث میں بھی متعدد آفتابوں اور کئی چاند اور کئی عالم اور کئی مشرق اور کئی مغرب کا وجود سمجھ میں آتا ہے۔ جس کے گرد نہ ہمارے اس آفتاب کی گردش ہوتی ہے۔ نہ وہ اس سے قریب ہوتا ہے۔ کیونکہ اسے اس کے مدیر اور مدبّر نے یہ حکم نہیں دیا ہے۔ اور اگر حکم دیا جاتا۔ تو بے شک اس میں ایک بہت بڑی مختار کی قوت پیدا ہوتی جس سے وہ ان آفتابوں اور عالموں کے حدود کو طے کرتا۔ اور ان چاندوں اور دریاؤں کے مدار پر سے ہو کر گذرتا۔ اور نیز ان مشارق اور مغارب کو بھی اسی ذیل میں طے کرجاتا +

رہا بارہ کی تعداد خاص کا جھگڑا۔ تو اس کی نسبت بھی یہی سمجھنا چاہئے۔ جو ہم چالیس کے متعلق ابھی لکھ آئے ہیں۔ یعنی کہ عاقل وہی ہے۔ جو ایسا کلام کرے جسے سامعین تحمل کرسکیں۔ اور اس وقت کے سامعین کا حال واضح ہے۔ کہ ایک سے زائد کا تحمل نہیں کرسکتے تھے۔ چہ جائیکہ بارہ یا ہزار۔ لہذا معصوم نے اسی قدر پر اکتفا

فرمائی۔ یا یہ کہ بارہ سے مطلق زیادتی مراد ہو۔ یعنی متعدد عوالم اور متعدد شموس وغیرہ جس کے بعد پھر کوئی بحث باقی نہیں رہتی +

(لطیفہ) جب کہ عالم سے مراد یہی نظام شمسی ہوا۔ اور مشرق و مغرب سے بھی مراد وہی ہے۔ تو مجموعا ان سب کا قریب چالیس کے پہنچ جاتا ہے۔ یعنی گویا کہ آپ نے بارہ آفتاب بارہ مشرق زور بارہ عالم سے چھتیس نظام شمسی مراد لئے۔ والعلم عند اللہ +

(تنبیہ) ممکن ہے۔ کہ آپ کے اس ارشاد سے کہ اس وقت آفتاب کو حکم ان عوالم کے گردگردش کا نہیں ہے یہ مطلب ہو کہ جب اس کے فنا و ہلاک کا وقت آئیگا۔ تو اُس وقت ایسا ہوگا۔ کہ ان تمام عوالم اور نظامات شمسیہ کے گردگردش کریگا جیسا کہ اکثر حکمائے حال کا خیال ہے۔ کہ جب آفتاب کی قیامت کا زمانہ آئیگا۔ اور اس کی نوریت اور ناریت فنا ہو جائیگی۔ اس کا نظام بھی مختل ہو جائیگا۔ اس کے صفات و خواص بھی درہم برہم ہو جائینگے۔ تو یہ مارا مارا فضا میں پھریگا۔ اور اس کی زمینیں اس سے چھوٹ جائینگی اور اس کے گردگردش کرنیوالے سیارے اس سے الگ ہو جائینگے۔ اُس وقت آفتاب اپنے لئے کوئی اور مرکز تلاش کریگا۔ حالانکہ اُس سے قبل خود مرکز تھا دیگر سیارات کا۔ بلکہ ممکن ہے۔ کہ کسی دوسرے ثابت ستارہ کی زمین بن جائے +

حاصل یہ کہ جب اس کی مرکزیت باقی نہ رہیگی۔ تو اس فضائے وسیع میں بہت سے عالم اور بہت سے نظامات شمسیہ کو طے کرتا ہوا گذر کریگا۔ اور کسی کو اپنا محل و موطن نہ بنا سکیگا۔ الا جس نظام کو اپنا جاذب پائیگا۔ وہاں ٹھیر جائیگا۔ اُس وقت یہ حیران و سرگردان آفتاب کسی دوسرے ثابت آفتاب کی ضیا کے نیچے پناہ گزین ہوگا۔ اور اُس کے نور و نار سے فائدہ اٹھا کر اُس کی زمینوں کے ذیل میں داخل ہو جائیگا +

چوتھی دلیل شرعی دعوے مذکور پر خدائے تعالےٰ کا یہ کلام ہے جو سورۂ فرقان میں مذکور ہے "تبارک الذی جعل فی السماء بروجا و جعل فیہا سراجا" اس آیت میں قرأت مشہورہ "سراجا" ہے یعنی مفرد جس سے مراد یہی آفتاب ہے۔ مگر مفسرین نے اسے "سُرُجا" بضم سین و بضم را بھی پڑھا ہے۔ جو سراج کی جمع ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہو۔ یعنی اصل آیت میں "سُرُجا" ہی نازل ہوا ہو۔ تو قرآن مجید سے بھی تعدد آفتاب ثابت ہو جائیگا جس کا اعتقاد متاخرین حکما کو ہے۔ اور اس لحاظ سے آیت کے معنی یہ ہونگے کہ مبارک

ہے وہ پروردگار جس نے سماء میں کئی برج اور کئی آفتاب پیدا کئے" کیونکہ سراج اسی کو کہتے ہیں۔ جو خود روشن بھی ہو۔ اور حرارت بھی اس میں پائی جاتی ہو۔ علے ہذا القیاس آفتاب بھی ہے۔ نیز یہ بھی بیان کیا جا چکا ہے۔ کہ "سماء" بلند چیز کو کہتے ہیں۔ ہماری شریعت میں جہاں جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس سے کہیں تو کرہ بخاریہ مراد ہے اور کہیں خود کرہ سیارات اور کہیں فضائے عالم۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے۔ گویا اس کلام سے خدائے تعالے کا یہ مطلب ہے۔ کہ اس نے فضائے بلند میں چند برج اور چند آفتاب پیدا کئے ہیں۔ جو فی نفسہ روشن ہیں +

پانچویں ایک اور روایت ملی ہے جو کتاب انوار لغمانیہ جناب محدث سید جزائری متوفی سنہ ۱۱۱۲ ہجری میں جابر جعفی سے مروی ہے۔ کہ امام پنجم محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا "من وراء شمسکم ھذہ اربعون عین شمس ما بین عین شمس الے عین شمس اخری اربعون عالما فیھا خلق کثیر ما یعلمون ان اللہ تعالے خلق آدم اولم یخلقہ وان من وراء قمرکم ھذہ اربعین قرصا ما بین القرص الے القرص الاخر اربعون عالما فیھا خلق کثیر ما یعلمون ان اللہ خلق آدم ام لم یخلقہ"۔ اس حدیث میں بھی صریح طور پر کثرت آفتاب کو ظاہر فرمایا ہے۔ الفاظ و مضامین اس حدیث کے قریب قریب وہی ہیں۔ جو حدیث سابق میں بیان ہوئے ہیں۔ لیکن چند امر اس میں زائد ہیں:-

ایک یہ کہ ایک آفتاب سے دوسرے آفتاب تک کے درمیانی حصہ میں چالیس عالم آباد ہیں۔ اور ایک قرص قمر سے دوسرے قرص قمر تک کی مسافت میں چالیس عالم آباد ہیں۔ بعض نسخوں میں بجائے عالم کے "عام" ہے۔ جس کے معنی یہ ہوئے۔ کہ ان دونوں کے درمیان چالیس برس کی راہ کا فاصلہ ہے۔ بہر صورت ان دونوں امروں کا فیصلہ ابھی تک ہیئت جدیدہ نے نہیں کیا ہے۔ انشاء اللہ آئندہ پیدا ہونے والی نسلیں اس مطلب سے فائدہ اٹھائینگی +

دوسرے یہ کہ آپ نے قمر کو قرص سے تعبیر کیا ہے۔ اگرچہ لفظ قرص عام ہے۔ آفتاب و ماہتاب دونوں ہی کو کہتے ہیں۔ (مگر اس تعرض کی وجہ نہیں معلوم ہوئی۔ مترجم) +

تیسرے آفتاب کی مخلوقات کی نسبت معصومؑ کا یہ ارشاد کہ "ان کو معلوم نہیں کہ آدم پیدا ہوئے یا نہیں"۔ اس کے متعلق تو ہم پہلے لکھ آئے ہیں۔ کہ آفتاب میں بھی مخلوقات کے وجود کو اہل ہیئت جدیدہ تسلیم کرتے ہیں۔ مثل ہرشل اور اراغو وغیرہ کے۔ اور اگر ایسا نہ بھی ہو تب بھی ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ آفتاب سے مراد عالم آفتاب ہے۔ یعنی اُس آفتاب کے نظام میں ایسے مخلوقات ہیں۔ نیز ممکن ہے۔ کہ اُن مخلوقات سے مراد ملائکہ ہوں۔ جن کی نفی کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ بہر حال اس حدیث سے ہمارا دعوٰے ثابت ہے ✦

اس مقام پر ناظرین کو انصاف کرنا چاہئیے۔ کہ آج کتنے دنوں بعد زمانے نے یہ صلاحیت پیدا کی ہے۔ کہ ان مطالب کی تحقیق بطور خود کر سکے۔ جن پر اہل مغرب فخر کرتے ہیں۔ کیا ہم کو ان لوگوں سے زیادہ فخر کا موقع حاصل نہیں ہے۔ کہ ہمیں خدا نے ایسے حکماء و عرفاء ہادی دین مرحمت فرمائے۔ جنہوں نے سیکڑوں برس پہلے ہی ان باتوں کو بے فکر و رویہ اور بے زحمت رصد و استعمال آلات دوربین خورد بین وغیرہ ہمارے لئے بیان فرما دیا۔ درآنحالیکہ اُس وقت کی حالت کا مقتضا بالکل ان باتوں کے اظہار کا نہ تھا۔ کیونکہ بڑی جاہل قوم سے ہمارے ہادیوں کو سابقہ پڑا تھا۔ اور سب سے زیادہ اعجب یہ ہے۔ کہ یہ حضرات ایسے فلسفے و ریاضی کے دقائق و نکات بھی بیان فرماتے تھے۔ پھر بھی اُس سے زیادہ تہذیب اخلاق و تعلیم سیاست مدن۔ و تدبیر المنزل اور تکمیل نفوس انسانیہ کے بھی متکفل تھے۔ اور اس قدر ان امور کے متعلق بیان کر گئے۔ اور تعلیم فرما گئے۔ جس کا احصاء و احاطہ آج دشوار ہے۔ یہ تھے وہ لوگ۔ جو دونوں ہی صیغوں میں اکمل عالم تھے۔ نہ اُن کو مشغلہ فلسفہ مشغلہ مذہب سے روکتا تھا۔ اور نہ شغل مذہبی شغل فلسفہ سے مانع ہوتا تھا۔ حالانکہ آج جسے آپ امور ریاضیہ میں منہمک پائینگے۔ اُسے بالکل مذہب سے بھی غافل دیکھیں گے۔ اور جسے مذہبی آدمی دیکھیں گے۔ اُسے فلسفہ سے بالکل بے بہرہ اور غافل پائیں گے پس سوائے اس کے کہ ان حضرات کی نسبت ہم وہی کہیں جو پروردگار عالم جل شانہ نے فرمایا ہے۔ اور کوئی لفظ اُن کی مدح کے لئے کافی نہیں معلوم ہوتا۔ "اللہ یعلم حیث یجعل رسالتہ" ✦

دسواں مسئلہ

قمر کے متعلق

صورت سوال۔ اس زمانہ کے اہل ہیئت نے چاند کے متعلق کچھ حالات اور صفات ایسے بیان کئے ہیں جنہیں ہم نے اس سے قبل کبھی نہ سنا تھا۔ کیونکہ پرانا فلسفہ ان حالات کا منکر تھا۔ اب بتلائیے۔ کہ آپ کی اسلامی شریعت اس کے متعلق کیا کہتی ہے؟

صورت جواب۔ اس مسئلہ میں تو قدماء و متاخرین دونوں ہی مضطرب ہیں۔ اور کسی نے بھی قطعی فیصلہ اس کی نسبت نہیں کیا ہے۔ باوجودیکہ بہ نسبت دیگر ثوابت وسیارات کے ہم سے زیادہ قریب چاند ہی ہے۔ لیکن پھر بھی حد درجہ کا اختلاف اس کے باب میں ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے۔ کہ چاند ایک مسطح چیز ہے۔ بعضے اس میں نشیب و فراز بتاتے ہیں۔ بعضے چھوٹا بتاتے ہیں۔ بعضے بڑا بتاتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے۔ کہ بسیط لطیف ہے۔ بعضے اس کو مرکب کثیف کہتے ہیں۔ کوئی نورانی کہتا ہے۔ کوئی ظلمانی۔ کوئی کہتا ہے۔ کہ یہ ایک ہی ہے۔ اور کوئی متعدد چاند کا قائل ہے۔ علےٰ ہذا القیاس اور بھی اختلافات ہیں۔ مگر ہم ان میں سے چند منتخب باتوں کو بیان کرینگے۔ کیونکہ سب کا بیان کرنا باعث طول محل ہے +

اوّل یہ کہ قدماء فلاسفہ کا خیال ہے۔ کہ جرم قمر ایک آسمان دبیز کے ثخن میں جڑا ہوا ہے۔ اور اس آسمان کو بھی ویسا ہی دوسرا آسمان محیط ہے۔ جس کے اندر عطارد جڑا ہوا ہے۔ اس کے اوپر ایک اور ویسا ہی موٹا اور بڑا آسمان ہے۔ جس کی دبانت میں زہرہ ہے۔ اس کے اوپر ایک فلک عظیم ہے۔ جس میں آفتاب ہے۔ اس سے اوپر ایک اور فلک ہے۔ جس میں مریخ ہے۔ وغیرہ۔ (دیکھو نقشہ ۱)۔ مگر جدید فلاسفروں کی یہ رائے ہے۔ کہ چاند اس زمین کی ہوا سے تقریباً باسٹھ ہزار فرسنخ اوپر واقع ہے۔ اور زمین کے گرد اپنے مدار پر دورہ کرتا ہے۔ کسی جسم کے اندر جڑا

ہوا نہیں ہے۔ بلکہ وہ خود مستقل ایک کرہ ہے۔ جو فضا میں دورہ کرتا ہے۔ اور اپنی سالانہ گردش میں زمین سمیت ہر ایک مدار پر حرکت کرتا ہے۔ چونکہ زمین کا مدار اور زمین کا فلک تمام سیارات کے افلاک کے درمیان میں واقع ہوا ہے۔ اس لئے چاند کا محل قرار تمام سیارات کے درمیان میں ہے۔ کیونکہ زہرہ اور عطارد تو بہ نسبت آفتاب کے زمین کے آگے واقع ہوتے ہیں۔ اور مریخ وغیرہ زمین کے پیچھے۔ چاند ان سب کے بیچ میں پڑتا ہے۔ لیکن قدما کی رائے بموجب سب کے نیچے اس کا درجہ ہے +

ہم نے جو اقوال شریعت پر اس جگہ نظر کی۔ تو بیشتر جدید علم ہیئت ہی کے موافق ملے۔ جنہیں ہم یہاں پیش کرتے ہیں +

(ایک) وہ ہے۔ جو سورۂ نوح میں قرآن مجید کی مذکور ہے۔ الم تروا کیف خلق اللہ سبع سموات طباقا وجعل القمر فیہن نورا وجعل الشمس سراجا۔ "کیا تم لوگوں نے نہیں دیکھا کہ خدا تعالےٰ نے کس طرح سماوات پیدا کئے۔ جو تہ بتہ ہیں۔ اور ان کے درمیان چاند کو نور بنایا۔ اور آفتاب کو چراغ" لفظ فیہن اس آیت میں بتا رہا ہے۔ کہ چاند ان تمام افلاک کے بیچوں بیچ میں واقع ہے۔ کیونکہ پروردگار عالم نے یہ نہیں ارشاد فرمایا ہے۔ کہ چاند کو کسی ایک آسمان میں پیدا کیا ہے۔ بلکہ فرمایا۔ کہ اُسے بیچ میں ان آسمانوں کے خلق کیا ہے۔ جو بالکل تحقیق جدید کے مطابق ہے۔ خواہ ہم سماوات سے افلاک مراد لیں۔ یا سماوات سے کرات سیارات و ثوابت مراد لیں۔ بہر حال اس آیت کی رُو سے چاند کا محل وسط معلوم ہوتا ہے۔ یا اگر سماوات سے مراد کرہ بخاریہ لیں۔ تب بھی کوئی ضرر نہیں ہے +

اِس مطلب کی مؤید یہ بات بھی ہے۔ کہ چاند کو تو خدا تعالےٰ نے فرمایا "فیہن" جس سے وسط سمجھ میں آتا ہے۔ مگر آفتاب کی نسبت "فیہن" نہیں فرمایا ہے۔ باوجودیکہ بنا بر قدما فلسفہ آفتاب ہی سب کے بیچوں بیچ میں ہے۔ بلکہ آفتاب کو صرف "سراجا" فرما کر الگ کر دیا۔ کیونکہ درحقیقت وہ مرکز عالم پر واقع ہوا ہے۔ جس کے گرد دیگر سیارات گردش کرتے ہیں۔ اور وہ خود ان کے گرد گردش نہیں کرتا۔ (یہی حکمائے حال کا بھی خیال ہے) +

(رہا سماوات کا تہ بتہ ہونا) تو اس سے ہم ہرگز یہ بات نہیں سمجھ سکتے۔ کہ مثل

پیاز کے چھلکوں کے تہ بتہ ہیں۔ جن میں سے اوپر والا نیچے والے کو محیط ہے۔ جیساکہ متقدمین کا خیال تھا۔ بلکہ ممکن ہے۔ کہ مراد خدائے تعالےٰ کی یہ ہو۔ کہ یہ ساتوں سماوات اس طرح درجہ بدرجہ ہیں جس طرح مکان کے طبقے اور درجے ہوتے ہیں۔ جیساکہ مولانا سید نعمت اللہ الجزائری کی رائے ہے ✦

باقی رہا یہ امر کہ لفظ نوراً کو نصب کیوں ہے۔ اس سے ہم کو یہاں بحث نہیں ہے۔ اس کو کسی اور موقع کے لئے چھوڑتے ہیں ✦

(**دوسری دلیل**) اس مطلب پر وہ روایت ہے جو کتاب فرج الہموم" میں جناب سید حافظ علی بن طاؤس متوفی ۶۶۴؁ ہجری نے نقل فرمائی ہے۔ اور مجلسی علیہ الرحمہ نے بحارالانوار میں۔ کہ ایک دہقان مسمی سرفیل منجم فارسی نے جناب امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے کچھ گفتگو نجوم کے متعلق کی۔ تو آپ نے اُس کے جواب میں فرمایا "ظننک حکمت علی اقتران المشتری و زحل لما استنارا لک فی الغسق و ظہر تلالو المریخ و تشریقہ فی السحر وقد سار فاتصل جرمہ بجرم تربیع القمر" میرا خیال ہے۔ کہ تو نے یہ حکم اس وجہ سے لگایا ہے۔ کہ تو نے شام کے وقت مشتری اور زحل کا قران دیکھا۔ اور صبح کے وقت مریخ کی زیادہ روشنی محسوس کی۔ جو اپنی رفتار میں چلتے چلتے جرم تربیع قمر سے قریب ہو گیا تھا۔ اس کلام سے صاف ظاہر ہے۔ کہ مریخ کبھی کبھی ہمارے اس چاند سے قریب بھی ہو جاتا ہے ✦

یہ بات سوائے ہیئت جدیدہ کے اور کسی بنیاد پر صحیح نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ قدیم علم ہیئت نے تو ہر سیارہ کے واسطے ایک ایک آسمان جسیم و عظیم ثابت کیا ہے۔ جس میں ہر ایک کو دوسرے سے بعید فاصلہ ہے۔ اور ہر ایک دوسرے سے قریب نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اس مقدار سے زیادہ دور ہو سکتا ہے۔ جس قدر اُس کے لئے ایک مرتبہ حاصل ہو چکا ہے۔ البتہ ہیئت جدیدہ نے اس امر کو بیان کیا ہے۔ کہ فلک مریخ زمین کو محیط ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان کوئی اور فلک یا سیارہ حائل نہیں ہے۔ اور قمر بھی زمین ہی کے گرد گردش کرتا ہے۔ پس جب کہ ہم ان تینوں کے افلاک یعنی مدارات کو بیضوی مان لیں۔ اور زمین کو اُس قطر میں فرض کریں۔ جو چھوٹا ہے۔ اور قمر کو بڑے قطر میں اور مریخ کو بھی چھوٹے قطر میں۔ تو یقیناً زمین سے قریب ہوگا (دیکھو نقشہ نمبر۲)۔ اور

یہ اتفاق یعنی مریخ کا قمر سے قریب ہو جانا اکثر ہوا کرتا ہے +

مسٹر فاندیک اپنی کتاب النقش فے الحجر میں لکھتے ہیں۔ مریخ کا مدار طولانی اور اہلیلجی واقع ہوا ہے۔ یعنی اس صورت کا (زمین مریخ) ۔ کبھی تو ہم سے بہت قریب ہو جاتا ہے۔ اور کبھی بہت دور ہو جاتا ہے۔ اور اس وقت بہت اچھی طرح اس کے حالات رصد سے معلوم کر لئے جا سکتے ہیں +

(فیلکس ورنہ) کی کتاب کے ترجمہ میں لکھا ہے "کہ جب مریخ آفتاب کے مقابلے سے قریب ہو جاتا ہے۔ تو اُس کا جرم بہت دکھائی دینے لگتا ہے۔ کیونکہ اُس وقت وہ ہماری زمین سے بہت نزدیک ہوتا ہے۔ اور یہ قرب اُس کے لئے ہر دو برس اور پچاس دن میں حاصل ہوتا ہے"۔ ان دونوں قولوں کی رو سے معلوم ہوا۔ کہ مریخ چاند سے قریب ہوتا ہے۔ اور اتنا قریب کہ جس سے اتصال کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ اور اُس وقت اُسکی روشنی بسبب قرب کے ہمیں زیادہ محسوس ہوتی ہے +

(کتاب حدائق النجوم) میں بیان کیا ہے۔ "کہ مریخ جبکہ ہم سے قریب ہوتا ہے۔ تو ہمیں پچیس درجہ بڑا دکھائی دیتا ہے۔ بہ نسبت اُس حالت کے جبکہ وہ اپنے بعد بعید پر ہوتا ہے"۔ اب ان اقوال سے حدیث شریف مذکور الصدر کو ملا کر دیکھئے۔ تو آپ کو معلوم ہو کہ کس قدر نظام جدیدہ کی مؤید اور فلسفہ حال سے موافق ہے +

باقی رہا صبح کے وقت قریب ہونا مریخ کا تربیع قمر سے۔ تو کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے واسطے کوئی خاص وقت معین نہیں ہے۔ ممکن ہے۔ کہ اُس زمانے میں صبح ہی کے وقت قریب آتا ہو +

حضرتؐ نے زحل اور مشتری کی نسبت جو یہ فرمایا ہے "لما استنارلک فی الغسق"۔ اس سے اس مطلب کی طرف اشارہ ہے۔ کہ اجسام سیارات بنفسہ تو روشن نہیں ہیں۔ مگر آفتاب سے روشنی حاصل کر کے روشن ہوتے ہیں۔ جیسا کہ بالفعل کے حکما کی رائے ہے۔ اس مسئلہ کو میں عنقریب خاتمہ کتاب کے مقالہ ثانیہ میں تفصیل سے بیان کرونگا۔ اور وہاں فلسفہ جدیدہ اور شریعت کا ایک دوسرے سے موافق ہونا دکھلاؤنگا +

(تیسری دلیل) کتاب درمنثور سیوطی کی ایک روایت میں اور بحار الانوار کی چودھویں جلد میں ہم نے دیکھا ہے۔ کہ ان القمر والنجوم والرجوم فوق السماء الدنیا "چاند ستارے

اور شہاب ثاقب یہ سب نیچے والے آسمان سے اوپر ہیں"۔ اس کلام کی موافقت بھی فلسفہ جدیدہ سے واضح ہے۔ کیونکہ جب ہم نے سماء دنیا سے مراد کرۂ بخاریہ لے لیا۔ جیسا کہ مسئلہ حقیقت سماوات میں اس کا بیان بہ تفصیل آچکا ہے۔ تو اس لحاظ سے چاند سماء دنیا سے اوپر ہی واقع ہوگا۔ علیٰ ہذا القیاس دیگر نجوم و شہب وغیرہ بھی۔

اور اگر سماء دنیا سے مراد فلک قمر ہو۔ جیسا کہ قدماء محققین کے نزدیک مسلم ہے۔ یا اس سے مراد فلک البروج ہو۔ جیسا کہ یہ بھی ایک رائے ہے۔ تو لازم تھا کہ امام علیہ السلام علی السماء الدنیا" نہ فرماتے۔ بلکہ "فی السماء الدنیا" کہتے۔ یا "تحت السماء الدنیا" فرماتے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ ہم نے جو رائے سابق میں اختیار کی ہے۔ وہی دین اسلام کے موافق ہے۔

دوسری بات جو اس مسئلہ میں قابل بحث ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ آیا چاند ایک ہی ہے۔ یا کئی ہیں۔ لوگوں کو وہم و خیال بھی تعدد قمر کا نہ تھا۔ سنہ ۱۶۱۰ء میں پہلے پہل اس چاند کے علاوہ مشتری کا ایک چاند مسٹر غالیلیو نے دریافت کیا۔ اُس کے بعد متعدد چاند دریافت ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ اس وقت تک اٹھائیس چاند معلوم ہو چکے ہیں۔ ایک چاند ہماری اس زمین کا ہے۔ اور دو مریخ کے ہیں۔ آٹھ مشتری کے ہیں۔ آٹھ زحل کے۔ آٹھ ارانوس کے۔ اور ایک نبتون کا۔ جیسا کہ مقدمہ ششم میں بیان ہوا ہے۔ اور اگر اُس چاند کو مان لیا جائے۔ جس کے دیکھنے کا دعوے مسٹر کاسنی اور مونتاین نے کیا ہے۔ اُنہوں نے زہرہ کا بھی ایک چاند دیکھا ہے۔ جیسا کہ کتاب دائرۃ المعارف میں مذکور ہے۔ تو کل چاند اُنتیس (۲۹) ہو جائینگے۔

میخائیل نے حاشیہ کتاب مشہد الکائنات میں لکھا ہے۔ کہ اکثر مشاہیر منجمین نے زہرہ کے واسطے بھی ایک چاند کا وجود تسلیم کیا ہے۔ جو ہمارے اس چاند کے مثل ہے۔ یہاں تک کہ بعضوں نے چار مرتبہ اُسے دیکھا ہے۔ اور بعض نے اُس کا قطر دو ہزار میل کا پیمائش کیا ہے۔ اُس کا بُعد بھی زہرہ سے اُتنا ہی بتایا ہے۔ جتنا ہمارے چاند کا ہماری زمین سے ہے۔

اور اگر ایک اور چاند کو تسلیم کریں۔ جیسا کہ باب مذنبات (دُم دار ستارے) میں مسٹر فانڈیک نے اپنے اصول میں لکھا ہے۔ کہ بعض فلاسفروں کی رائے ہے کہ ان دُمدار ستاروں میں سے ایک ستارہ چاند بن کر ہماری زمین کے گرد گردش کرنے لگا ہے۔

اور اپنا دورہ تین گھنٹے بیس منٹ میں اپنے پانچ ہزار میل والے معدل کے بُعد پر تمام کرتا ہے۔ تو پورے تیس چاند ہو جائینگے۔ لیکن اس آخری چاند کی پوری تحقیق نہیں ہوئی۔ کیونکہ باوجود بڑی بڑی دوربینوں کے محققین نے اس کو ابھی تک نہیں دیکھا ہے۔

اب اس کے بعد ہمارے رسولؐ کے اوصیاءؑ کے اقوال پر نظر ڈالئے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ جب کہ اس عالم میں کسی تعدد قمر کا ذکر بھی نہ تھا اور نہ کسی کے وہم و گمان میں یہ بات آئی تھی۔ اُس وقت ان مقدس اور روحانی نمدگواروں نے تعدد قمر کا مسئلہ بیان فرما دیا تھا۔ اِس سے پہلے ہم نے مسئلہ صفات آفتاب میں چند حدیثیں پیش کی ہیں جن سے چالیس چاند تک کا پتہ ہمارے اسلامی ہادیوں نے دیا ہے۔ اور بعض روایات میں بارہ کا۔ علاوہ اُن روایات کے ایک اور روایت کتاب روضۂ کافی میں جناب امیر المومنین علیہ السلام سے ملی ہے۔ جس سے وجود او رچاند کا علاوہ ہمارے اس قمر مشہور کے معلوم ہوتا ہے۔ اُس میں حضرتؑ نے فرمایا ہے۔ قمر نا ام قمر ھم۔ وہ اُن کا چاند یا ہمارا چاند۔" جس سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہمارے اس چاند کے علاوہ کسی دوسرے عالم کے لئے دُوسرا چاند بھی ہے۔

تیسری بات جو اس مسئلہ میں قابل ذکر ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ "چاند گرم ہے یا سرد" اس سے پہلے تو سب کا خیال یہی تھا۔ کہ چاند کی روشنی ٹھنڈی ہے۔ بالکل حرارت کا اُس میں نام بھی نہیں ہے۔ اور یہ کہ اس میں عنصر ناری کو بالکل دخل نہیں۔ مگر متاخرین نے جو آلات بالفعل بنائے ہیں۔ اُن سے معلوم کیا ہے۔ کہ چاند کی روشنی میں کسی قدر حرارت بھی ضروری ہے محض بارد نہیں ہے۔

(مسٹر فاندیک) ص ۱۳۱ میں اپنی کتاب اصول ہیئت کے لکھتے ہیں۔ "چاند اپنی حرارت کو زمین کی طرف دو طریقوں سے بھیجتا ہے۔ ایک بذریعہ انعکاس یعنی کہ اول اُس پر آفتاب کی شعاع پڑتی ہے۔ پھر وہ شعاع وہاں سے منعکس ہو کر زمین پر آتی ہے۔ دوسرے یہ کہ خود بھی قمر جب آفتاب کے نیچے آجاتا ہے۔ اور اُس کی حرارت سے گرم ہوتا ہے۔ تو وہ حرارت بذریعہ نور قمر کے زمین تک آتی ہے" مطلب اس کلام کا یہ ہے۔ کہ جس طرح اور اجرام عنصریہ مثل پہاڑ وغیرہ کے دُھوپ میں رہ کر گرم ہو جاتے ہیں۔ اور پھر اپنی گرمی کو اطراف میں پھیلاتے ہیں۔ اسی طرح ماہتاب بھی اوّلاً آفتاب کی دُھوپ سے گرم

ہوتا ہے۔ پھر اُس سے حرارت جدا ہو کر ہر طرف زمین پر پڑتی ہے +

(فیلکس ورنہ) کی کتاب ہیئت کے ترجمہ میں مذکور ہے "چاندکی روشنی کے ساتھ ساتھ کسی قدر حرارت بھی ہوتی ہے، اگرچہ حکماء سابق اس کے منکر تھے لیکن حکماء حال نے بذریعہ آلات و تجربات کے اس کو ثابت کیا ہے"+

اب میں عرض کرتا ہوں کہ ان تمام متاخرین حکمائے سے بہت پہلے ہمارے آٹھویں امام جناب علی بن موسے الرضا علیہ السلام نے اس مسئلہ کو ارشاد فرمایا ہے۔ جہاں شمس و قمر دونوں ہی کو خدائے تعالے کے وجود کی نشانی بتایا ہے"۔ ان دونوں کی روشنی خدا کے عرش کے نور سے ماخوذ ہے، اور حرارت ان کی حرارت جہنم سے"۔ اس قول کو مشروحاً ہم نے صفات شمس کے مسئلہ کے پانچویں قول میں بیان کر دیا ہے۔ ملاحظہ فرما لیجئے۔ اور ہم نے چند مرتبہ یہ بھی بیان کر دیا ہے۔ کہ مسلمان علماء نے ائمہ علیہم السلام کے ان ارشادات کی طرف صرف اس وجہ سے توجہ نہیں کی کہ یہ باتیں بسبب فلسفہ قدیم کے مخالف ہونے کے اُن کی سمجھ میں نہ آئیں۔ لہذا تاویلات سے ٹال دیا +

اس حدیث کا ظاہر اس بات کو بھی بتاتا ہے کہ قمر کا نور بھی ذاتی ہے۔ اگرچہ آفتاب سے بھی اکتساب نور کرتا ہے۔ یہ وہ رائے ہے جسے سوائے متاخرین فلاسفہ کے اگلوں نے تسلیم نہیں کیا ہے۔ مسٹر ہرشل نے کتاب حدائق النجوم میں لکھا ہے "کہ تمام اجرام مظلمہ (غیر روشن) میں ایک خفیف نور پایا جاتا ہے۔ جو اُس کا ذاتی ہے" لہذا چاند میں بھی ایسا ہی ہونا چاہئے۔ اس کی تائید یوں بھی ہوتی ہے کہ اکثر چاند دن کو بھی دکھائی دیتا ہے جبکہ مقابلہ آفتاب سے بالکل دور ہوتا ہے پھر بھی سفید اور روشن معلوم ہوتا ہے۔ (اگرچہ اُتنی ہی روشنی اُس میں نہیں ہوتی جتنی رات کے وقت ہوتی ہے) دوسرے یہ کہ گہن کے موقع پر بھی ہم نے دیکھا ہے کہ اُس میں خفیف روشنی اور سفیدی محسوس ہوتی ہے۔ جو مائل بسرخی ہوتی ہے۔ اگر ہم چاند کو بالذات روشن نہ مانیں۔ بلکہ کالی ٹکیہ کے مثل تسلیم کریں۔ تو کہاں سے یہ خفیف روشنی آتی ہے۔ اسی مطلب کو ہمارے پانچویں امام محمد باقر علیہ السلام نے بھی اُس شخص کے جواب میں جس نے چاند کی بابت آپ سے سوال کیا تھا "کہ آفتاب بہ نسبت اس کے گرم کیوں ہے" تو فرمایا تھا "خدا تعالے نے چاند کو آگ کے نور کی شعاع سے اور صاف پانی سے تہ بتہ اور طبق بطبق پیدا کیا ہے

ایک تہ اِس کی اور ایک تہ اُس کی دی ہے۔ جب سات تہیں ہو گئیں تو اُوپر سے پانی کا لباس اُس پر پہنا دیا۔ اس وجہ سے چاند بنسبت آفتاب کے خنک ہو گیا۔" اِس روایت کی سند کو بھی مسئلہ صفات شمس کے تیسرے قول میں مفصل طور پر بیان کر دیا ہے۔ البتہ اس حدیث سے جو چند نئی باتیں مستنبط ہوتی ہیں۔ اُن کو عرض کرتا ہوں +

۱۔ یہ کہ چاند اجزاے عنصریہ سے مرکب ہے۔ قدماء حکماء کی رائے بموجب بسیط نہیں ہے۔ حال کے فلاسفر بھی ترکیب ہی کے قائل ہیں +

۲۔ چاند آفتاب کا تابع اور خلقت میں اُس سے متاخر ہے۔ یعنی پہلے آفتاب بنا پھر چاند۔ کیونکہ امام ؑ نے آفتاب کے متعلق یہ فرمایا تھا "آفتاب کو خدا نے آگ کے نور سے پیدا کیا ہے"۔ اور چاند کی بابت فرمایا۔ کہ "اسے آگ کے نور کی شعاع اور ضوء سے پیدا کیا۔ جس سے ترتیب خلقت معلوم ہوتی ہے"۔ اور یہی رائے متاخرین کی بھی ہے۔ کیونکہ یہ لوگ چاند کو نور میں بھی آفتاب کا تابع مانتے ہیں حرکت میں بھی۔ اور خلقت کی رُو سے بھی بعد آفتاب کے اس کا درجہ تسلیم کرتے ہیں +

۳۔ یہ کہ قمر کے نور کے ساتھ ساتھ حرارت خفیفہ بھی رہتی ہے۔ کیونکہ آپ نے فرمایا ہے۔ کہ اس وجہ سے آفتاب بہ نسبت چاند کے زیادہ گرم ہے۔ یعنی چاند میں بھی حرارت ہے۔ مگر اتنی نہیں ہے جتنی آفتاب میں ہے +

۴۔ یہ کہ چاند کے اندر اجزاے ناریہ اور طبقات ناریہ پائے جاتے ہیں۔ اور یہی رائے متاخرین کی بھی ہے۔ کہ قرص قمر میں آتش خیز پہاڑ اور آتشی بھٹیاں موجود ہیں۔ جسے پہلے پہل مسٹر ہوک نے دریافت کیا۔ جیسا کہ کتاب حدائق النجوم میں مذکور ہے۔ اور نیز مسٹر ہوک نے اسے ۱۸۳۶ء کے حلقہ دار گہن کے موقع پر مع چاند کی صبح اور شفق کے دیکھا تھا۔ اور اُس وقت اُس آگ کی مقدار جو چاند سے نکل رہی تھی سہ رشل والی دوربین سے اتنی بڑی دکھائی دیتی تھی۔ کہ اگر بغیر دوربین کے بھی دیکھی جاتی۔ تو ممکن تھا۔ کہ ناظر اُسے دیکھ سکتا۔ اسی بنیاد پر مسٹر ہوک نے بخارات ہوا اور فضا کے وجود کا قول کُرہ قمر میں اختیار کیا ہے۔ اور یہ بھی کہ اچھی طرح ممکن ہے۔ کہ اس میں حیوانات بھی بستے ہوں کیونکہ صبح شفق اور آگ کا وجود صاف بتاتا ہے۔ کہ اس کُرہ میں ہوا پائی جاتی ہے۔ جو حیوانات کی زندگی کے لئے لازم ہے +

ناظرین کو پھر اس مقام پر متوجہ کرتا ہوں۔ اور انصاف چاہتا ہوں۔ کہ آیا اسلامی شریعت محکم اور باقاعدہ ہے۔ جس نے بغیر آلات کی مدد کے آج سے بارہ تیرہ سو برس پہلے ان اسرار مخفیہ کو بیان کر دیا تھا۔ یا کوئی اور۔ اور کیا اس سے یقینی طور پر معلوم نہیں ہوتا۔ کہ ہمارے ائمۂ کرام خاص اولیاء اللہ اور حکیم الٰہی اور حامل شریعت حقہ تھے؟ ذرا غور درکار ہے۔ اور بس +

گیارھواں مسئلہ

عدد سیّارات کے بیان میں

حکمائے سابقین کی عموماً یہ رائے تھی۔ کہ سیّارات صرف سات ہیں۔ ایک آفتاب۔ دوسرے ماہتاب۔ تیسرے عطارد۔ چوتھے مشتری۔ پانچویں مریخ۔ چھٹے زہرہ۔ ساتویں زحل۔ (البتہ) ذی مقراطیس اور ارشمیدس کی بابت بیان کیا جاتا ہے۔ کہ یہ دونوں بیشمار سیّاروں کے قائل تھے۔ مگر میرا خیال یہ ہے۔ کہ سیّاروں سے ان دونوں کی مراد یہی ثوابت تھے۔ جنہیں پہلے تو ثابت سمجھا جاتا تھا۔ مگر بعد اُس کے حکمائے یونان نے ان کو سیّار مانا۔ اور قائل ہوئے۔ کہ کل ثوابت ساٹھ ہزار برس یا اس سے زیادہ میں دورہ تمام کرتے ہیں۔ نہ یہ مقصود تھا۔ کہ ہمارے عالم شمسی کے سیّارات بے شمار ہیں۔ بالجملہ ہمیں بطلیموسی نظام کے متعلق اس وقت گفتگو ہے۔ جو زمانہ اسلام سے قبل اور بعد بھی رائج تھا۔ وہ ہرگز سوائے سات سیاروں کے زیادہ کا قائل نہیں ہے +

نظام کوپرنیکی جو آج کل رائج ہے۔ اُس میں بھی عدد سیّارات کی بابت بہت کچھ اختلاف رہا ہے۔ اور مختلف رائیں ہوتی رہی ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ اوّل اوّل تو یہ لوگ صرف چھ سیّارے کے قائل تھے۔ ایک زمین اور پانچ متحیّرہ۔ باقی آفتاب و ماہتاب کو یہ لوگ سیّاروں میں شمار نہ کرتے تھے +

مگر جب مسٹر (ٹی ٹی یوس) نے ابعاد سیّارات کے دریافت کرنے کا قاعدہ شائع کیا جسے سلسلۃ الیٰد کہتے ہیں۔ اُس وقت چند حکماء کو ایک اور سیّارہ کا مریخ اور مشتری کے

درمیان میں احتمال پیدا ہوا کیونکہ ٹی ٹی بوس کی یہ رائے تھی کہ اگر زمین کا بُعد آفتاب سے دس درجہ ہے تو عطارد کا بعد زمین سے چار درجہ ہوگا۔ اور زہرہ کا سات۔ اور جو سیارہ بعد مریخ کے ہے اُس کا سولہ درجہ۔ اور قاعدہ اُس نے یہ رکھا تھا کہ ہر سیارہ کے واسطے چار کا عدد اُس مقدار میں سے دیا جائے جس مقدار میں دس کا عدد زمین کو دیا گیا ہے۔ (یعنی اگر زمین کا فاصلہ آفتاب سے مثلاً دس ہزار فرسنگ کا مانا جائے۔ تو عطارد کا چار ہزار فرسنگ کا ہوگا۔ پھر زہرہ کو اُسی قسم کے فاصلہ میں سے تین کا عدد دیا جائے۔ اور مابعد زہرہ کے واسطے چھ کا علےٰ ہذا القیاس ہر سیارہ کو سابق سیارہ کا دُگنا دینا چاہئیے۔ اور زمین کو اُس سے مستثنےٰ رکھنا چاہئیے۔ کیونکہ اُسے دس کا عدد اوّلاً دیا جا چکا ہے۔ اس لحاظ سے نظام شمسی یوں ٹھیرا کہ (عطارد) ۴ (زہرہ) ۷ (زمین) ۱۰ (مریخ) ۱۶ (مابعد مریخ) ۲۸ (مشتری) ۵۲ (زحل) ۱۰۰ (ارانوس) ۱۹۶ (نبتون) ۲۲۸۔ مگر یہ حساب تحقیقی نہ تھا۔ بلکہ تقریبی تھا۔

جب ہرشل نے سیارہ ارانوس کی تحقیق کی۔ تو منجمین یورپ کا خیال ہوا۔ کہ سیارات سات ہیں۔ کیونکہ ٹی ٹی بوس کا قاعدہ چاہتا تھا۔ کہ (۱۹۶) درجے پر ایک مدار ہو۔ اگر زحل کے بعد کوئی ستارہ پایا جائے۔ جب ارانوس کی تحقیق ہوگئی۔ تو (۱۹۲) درجہ پر پایا۔ جو بہت زیادہ قاعدہ ٹی ٹی بوس سے بعید اور مخالف نہ تھا۔ تو یہ خیال مستحکم ہوگیا۔ کہ مریخ اور مشتری کے درمیان میں بھی (۲۸) درجہ کے فاصلہ پر کوئی سیارہ ضرور ہوگا۔ اس خیال سے دوربینوں سے کام لینے لگے۔ یہاں تک کہ مسٹر پیازی نے ۱۲۱۵ھ میں ستارہ مسمی سرس کو دریافت کیا۔ جو مریخ و مشتری کے درمیان میں ہے۔ (۲۸) ہی درجہ کے فاصلہ پر۔ اُس وقت منجمین و اہل ہیئت میں بڑا غل مچا۔ اور سب کے سب ٹی ٹی بوس کو بدعائے خیر یاد کرنے لگے۔ کیونکہ اُس کا قاعدہ صحیح نکلا۔ اُس وقت آٹھ سیارے کا اعتقاد ہوا۔ اور سرس بھی خندہ بہ سیارات میں داخل کیا گیا۔

لیکن یہ خوشی ان کی بہت دنوں باقی نہ رہی۔ بلکہ بہت جلد فنا ہوگئی۔ کیونکہ اُسی سال کے اندر ایک اور سیارہ معلوم ہوا۔ جس کا نام بلس رکھا گیا۔ پھر ایک اور سیارہ محسوس ہوا۔ جسے جون کہتے ہیں۔ پھر ایک اور جسے دستا کہتے ہیں۔ اُس وقت پھر اُن کو ٹی ٹی بوس کے قاعدہ پر اطمینان نہ رہا۔ اور گیارہ سیارے کے قائل ہوئے۔

تقریباً دس سال تک کوئی اور سیارہ دریافت نہ ہوا۔ اس وجہ سے اب یہ امر پاس ہوگیا۔ کہ گیارہ ہی سیارے ہیں۔ اور کتابیں بھی اس مضمون پر لکھی گئیں۔ جن میں سے ایک حدائق النجوم

بھی ہے پھر چند دنوں کے بعد ظلمت دور ہوئی۔ ناموس معنویہ پروردگار عالم نے ظہور پایا۔
اور جدید تحقیقات کے مسلسل باقی رہنے سے ۱۲۶۶ سنہ ہجری میں تقریباً (۲۸) سیارے دریافت
ہوئے۔ اور تقریباً ایک ہی مہینے میں اٹھارہ سیاروں کا پتہ چلا یا۔ اب اہل ہیئت کی رائے ادھر
پلٹی۔ کہ یہ سیارے جو ہمیں معلوم ہوتے ہیں۔ اور جو مریخ و مشتری کے درمیان ہیں۔ وہ کوئی
مستقل سیارے نہیں ہیں۔ بلکہ یہ سب کسی بڑے سیارے کے منفصل اجزاء ہیں۔ جو ان دو
مداروں کے درمیان (۲۸) درجہ پر تھا۔ اور زمانہ کے انقلابات سے ٹوٹ کر متفرق ہو گیا۔
اور اس کے وہی منفصل ٹکڑے اپنے اصل کے موافق اسی مدار پر حرکت کرتے ہیں۔ اس خیال کو
اس وجہ سے اور بھی قوت ہوئی۔ کہ ان سیارات جدیدہ کی رفتار باعتبار زمانے اور اوصاف
اور اوضاع کے یکساں پائی گئی۔ اور یہ کہ ان کے مدارات بھی بہت قریب قریب ہیں جیسا کہ
میں نے مسئلہ تعدد زمین کے پانچویں قول میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور جب یہ خیال
قوی ہو گیا۔ تو پھر بطلیوس کی رائے کی طرف پھرے۔ اور اسی کا کلمہ پڑھنے لگے +

پھر جب حکیم لوریہ فرانسیسی نے سیارہ نبتون کو ارانوس کے پیچھے اور سیارہ فلکان کو
عطارد سے قبل ۱۲۶۴ سنہ ہجری میں دریافت کیا۔ تو اس وقت سے سیارات تو قرار پائے۔
مگر مشہور آٹھ ہیں۔ کیونکہ فلکان کی رصد بہت دشوار ہے۔ جسے بہت کم آدمی اس وقت
تک معلوم کر سکے ہیں۔ یہ مختصر قصہ ہے منجمین یورپ کے سیارات کو دریافت کرنیکا۔ جس
میں ان کی رایوں کے انقلابات کا حال معلوم ہوتا ہے۔ کہ کتنے الٹ پھیر اس تحقیق
میں ان کے لئے واقع ہوئے +

اب شریعت اسلامیہ کو دیکھئے اس کے ظواہر اقوال دو قسم کے
ہیں۔ ایک تو وہ ہیں۔ جو سیارات کو سات بتاتے ہیں۔ لیکن اس اندازپر کہ نظام جدید سے مطابق
ہو۔ میرا خیال یہ ہے۔ کہ یہ تعداد ان سیارات کی شریعت نے بیان کی ہے۔ جو آنکھوں سے
بغیر دوربین کی مدد کے دکھائی دیتے ہیں۔ نہ مطلق سیارات کی۔ نیز اس سے پہلے ہم نے
بیان بھی کر دیا ہے۔ کہ متکلم کا یہی فرض ہے۔ کہ وہ اپنے خطابات عرفیہ عمریہ میں انہیں باتوں کا
ذکر کرے۔ جو قابل حس و ادراک ہوں۔ ورنہ لوگ اس کے سمجھنے اور ماننے سے انکار کرنے
لگینگے۔ اور اس میں شک نہیں۔ کہ سیارات سات ہی قابل احساس و ادراک ہیں۔ اگرچہ ان میں
سے بعض کو مخاطبین سمجھ سکتے تھے۔ مگر یہ در اصل ان کا قصد نہ تھا۔ باقی وہ باتیں جو حس و ادراک

سے باہر ہیں۔ اُن کی بابت کسی عاقل کو جائز نہیں ہے۔ کہ اُنہیں عام آدمیوں سے بیان کرے۔ کیونکہ وہ بصورت نہ سمجھنے کے متکلم پر منہ آ دینگے۔ اور اُس کی تغلیط کرنے لگینگے۔ البتہ اگر بطور اسرار کے کسی خوش نفس اور صاحب کمال کے سامنے بیان کرے۔ تو مضائقہ نہیں ہے جیساکہ ہمارے ائمہ معصومین علیہم السلام نے کیا ہے۔ دوسری قسم کے وہ ظواہر اقوال ہیں۔ جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں۔ کہ سیارات گیارہ ہیں۔ اور ان گیارہ سے وہی سیارات مراد ہیں۔ جو ہمارے نظام شمسی میں داخل ہیں۔ جن میں سے بعض دکھائی دیتے ہیں۔ اور بعض نہیں دکھائی دیتے۔ بعض کا حال فلاسفۂ یورپ نے بیان کیا ہے اور بعض کا نہیں۔ (منجملہ) اقوال کے ایک قول پروردگار عالم کا سورۂ یوسفؑ میں انی رایت احد عشر کوکبا والشمس والقمر رایتھم لی ساجدین یہ گیارہ ستارے وہ ہیں۔ جنہیں خواب میں جناب یوسف علیہ السلام نے دیکھا تھا۔ اور جن کی تاویل عالم بیداری میں اُن کے گیارہ بھائیوں سے کی گئی۔ کیونکہ درصل جناب یوسفؑ نے خلاف واقع نہیں بیان کیا تھا۔ اگر سچ مچ بھائیوں کو خواب میں دیکھا ہوتا تو اس خواب کی تاویل کی کیا ضرورت تھی۔ بیشک انھوں نے ستارے ہی اس عدد مذکور اور اس صفت خاص کے خواب میں دیکھے تھے۔ پھر اگر یہ ستارے جن کی نسبت یہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ اُنہوں نے یوسفؑ کو سجدہ کیا۔ ثوابت کی قسم میں سے تھے۔ تو پھر ترجیح بلا مرجح کی کیا وجہ۔ کیونکہ ثوابت تو ہزاروں ہی ہیں۔ اور سب کے سب جنس و صفت میں مساوی ہیں۔ ہاں اُن گیارہ سے مراد سیارات لئے جائیں۔ تو البتہ خصوصیت کی وجہ اور عدد کی مناسبت پیدا ہوسکتی ہے۔ لہذا بقرینۂ عقلیہ ان ستاروں سے سیارات ہی مراد لینے چاہئیں جن کو جناب یوسفؑ نے اپنے سامنے جھکتے ہوئے دیکھا تھا۔ آئندہ ہم اس کلام کے اور بھی شواہد بیان کرینگے۔

دوسری دلیل اس مطلب پر وہ ہے۔ جو تفسیر نیشاپوری اور تفسیر کشاف زمخشری متوفی ۵۳۸ھ ہجری میں ہم نے دیکھی ہے۔ جو ۷۲۵ھ ہجری کے شوال کی دسویں تاریخ جمعہ کے دن کی لکھی ہوئی بخط عبدالعزیز ابن محمد ابن یعقوب نزغری مجھے ملی تھی۔ نیز اور کتابوں میں بھی میں نے دیکھا۔ جابر روایت کرتے ہیں۔ کہ ایک یہودی نے جناب رسالتمآب صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اُن ستاروں کی نسبت دریافت کیا۔ جنھیں

خواب میں جناب یوسفؑ نے دیکھا تھا۔ تو آپ نے فرمایا اُن کے نام جریان۔ طارق۔ ذیال۔ قابس۔ عمودان۔ فلیق۔ مصبح۔ ضروح۔ فرغ۔ وثاب اور ذوالکتفین ہیں۔ یہ سنتے ہی یہودی مسلمان ہوگیا۔ اسی روایت کو ابن بابویہ صدوق رحؒ نے کتاب خصال میں جابرؓ سے دو سند سے روایت کی ہے۔ جن میں تھوڑا سا اختلاف ہے +

حافظ قمی نے بھی جابرؓ سے اسی آیت کی تفسیر میں اس روایت کو بیان کیا ہے۔ اور ستاروں کے نام بھی بیان کئے ہیں۔ مگر کسی قدر ناموں میں تغیر ہے۔ پھر اُس کے بعد فرمایا ہے کہ یہ سب ستارے آسمان سے گھرے ہوئے ہیں۔ اور بعض نسخوں میں ہے۔ کہ آسمان کو گھیرے ہوئے ہیں۔ ان دو لفظوں میں صرف محاط اور محیط کا فرق ہے۔ میرا خیال یہ ہے۔ کہ یہ اشتباہ رسم الخط عثمانی کی وجہ سے پیدا ہوا کیونکہ وہ لوگ عثمان کو عثمن اور لقمان کو لقمن لکھتے تھے۔ اسی طرح ممکن ہے۔ کہ محاط کو محط کی طرح لکھا ہو۔ جسے بعضوں نے محاط پڑھا۔ اور بعضوں نے محیط پڑھا جن کا ترجمہ ہماری زبان میں گھیرے ہوئے اور گھرے ہوئے کا ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ یہ گیارہ ستارے جو بیان کئے گئے ہیں۔ ان کے اس عدد خاص کے مذکور ہونے کا کوئی سبب ہونا چاہئے۔ ہماری نظر میں کوئی وجہ ترجیح سوائے سیاریت کی تحقیق کے سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کے مؤید حضرتؑ کا یہ ارشاد بھی ہے۔ کہ وہ سب کے سب آسمان سے گھرے ہوئے ہیں۔ کیونکہ یہ خلقت بھی مخصوص سیارات ہی کی ہے۔ جیسا کہ نظام جدید کا مسلک ہے۔ کہ کرۂ بخاریہ سے مراد سماء ہے۔ جیسا کہ ہم نے پچھلے مسئلہ میں بیان کیا۔ اور اس کے بعد والے مسئلے میں بھی بتفصیل بیان کریں گے۔ کہ ہر سیارے کے واسطے ایک کرۂ بخاریہ ہے۔ جو اُسے محیط ہے۔ نیز اس کے مؤید یہ نام بھی ہیں۔ جو اس روایت میں بیان کئے گئے۔ کیونکہ بیشتر نام بلحاظ شے کے کسی قوی صفت کے رکھا جاتا ہے۔ اب ملاحظہ کیجئے۔ اس ترتیب کو کہ جس کی ابتدا زمین سے شروع ہوتی ہے۔ پہلا نام جو اس روایت میں بیان کیا گیا ہے (جریان) ہے جس کے معنی چلنے کے ہیں۔ اس حدیث کے علاوہ بھی زمین پر جاریہ کا لفظ اطلاق کیا گیا ہے یعنی چلنے والی۔ جیسا کہ ہم نے مسئلہ تعدد زمین کے تیسویں مقالہ میں بیان کیا ہے +

اور طارق سے مراد زہرہ ہے۔ کیونکہ طارق صبح کے ستارے کو کہتے ہیں جیسا کہ قاموس میں ہے۔ اور عرف عام میں بھی صبح کا ستارہ زہرہ ہی کو کہتے ہیں +

ذبال بروزن قطام جو تیسرے ستارے کا نام بتایا گیا ہے لغت میں اُس لاغر آدمی کو کہتے ہیں جس میں ترو تازگی بالکل نہ باقی رہی ہو۔ اب دیکھئے۔ کہ عطارد ستارہ بھی ایسا ہی ہے۔ یعنی بہت خشک ہے۔ ترو تازگی اُس میں بالکل نہیں ہے۔ کیونکہ وہ آفتاب سے بہت قریب ہے +

قابس چوتھے ستارے کا نام بتایا گیا ہے۔ جو دہکتے ہوئے انگارے کو کہتے ہیں۔ جو کسی بڑی مقدار کی آگ سے حرارت حاصل کئے ہوئے ہو۔ اب اگر آپ سیارہ فلکان کو دیکھینگے تو اُسے بھی ایسا ہی پائینگے۔ کہ وہ ایک بڑی آگ سے حرارت حاصل کر رہا ہے۔ کیونکہ وہ آفتاب سے بہت قریب ہے۔ آفتاب سے بڑھ کر آگ کون ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ہم نے بیان کر دیا کہ فلکان اُس پہاڑ کو کہتے ہیں جس سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں۔ اُسی طرح یہ سیارہ بھی نہایت گرم ہے +

عمودان کی بابت یہ خیال گذرتا ہے۔ کہ اس سے مراد مریخ ہو کیونکہ ہمیشہ اس کے گرد دو چاند پھرتے رہتے ہیں جن کی شعاعیں مثل عمود کے اُس پر پڑتی ہیں +

فلیق سے مراد وہ بڑا سیارہ ہوگا جس کی بابت خیال ہے۔ کہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بہت سے چھوٹے چھوٹے ستاروں کی طرف منقسم ہو گیا ہے جن کو مشتری کے ستارے کہتے ہیں۔ کیونکہ فلیق کے معنی منفلق یعنی پھٹ جانے والے کے ہیں۔ (ہم نے ان ستاروں کا ذکر اس سے سابق کیا ہے۔ وہاں ملاحظہ فرمائیے) +

خلاصہ یہ کہ حدیث مذکور سیارات نظام شمسی پر اچھی طرح منطبق ہو سکتی ہے۔ جس کی ابتدا زمین سے شروع ہوتی ہے۔ پھر زہرہ ہے۔ پھر عطارد۔ پھر فلکان۔ پھر مریخ۔ و علےٰ ہذا القیاس۔ اس مقام پر اگر آپ کہیں۔ کہ ہمارے نظام شمسی کے سیارے تو صرف نو ہیں۔ اور یہ گیارہ ہو گئے۔ تو ہم اس کا جواب یہ دینگے۔ کہ ابھی ہم اس تطبیق کے متیقن ہونے کے قائل نہیں ہیں۔ لیکن اتنا ضرور کہینگے۔ کہ نو سیارے تو نظام شمسی کے موجود و معلوم ہیں۔ اور دسواں وہ سیارہ تھا جو پھٹ کر بہت سے چھوٹے ستارے بن گیا ہے۔ اگرچہ وہ اس وقت سیارات میں مندرج نہیں۔ لیکن سیارات کے شمار میں تھا تو ضرور اور اس قدر اُس کو دسواں سیارہ کہنے کے لئے کافی ہے۔ کیونکہ بحث نظام شمسی کے سیاروں سے ہے۔ خواہ موجود ہوں یا منتشر ہو گئے ہوں۔ رہا گیارھواں سیارہ جسے حدیث نے بیان کیا ہے۔ یہ وہ جدید سیارہ ہے جسے ابھی تک جدید فلسفہ نے معلوم نہیں کیا ہے۔

جیساکہ ہم نے پانچویں مسئلہ کے تتمہ میں بیان کیا ہے۔ مگر ہمیں بہت قوی امید ہے۔ کہ آئندہ یہ بھی دریافت ہوکر رہیگا۔ جبکہ آلات اور بھی مکمل ہو لینگے +

بلکہ مصری مجلہ (رسالہ) الضیائے نے جو شیخ ابراہیم بازیجی کی اڈیٹری سے نکلتا ہے ۱۸۹۹ء کے صفحہ ۱۳۴ میں عنوان ذیل (السیار الجدید بین الارض والمریخ) کے بعد لکھا ہے۔ کہ یہ جدید سیارہ جبکہ نقشہ آفتاب کی ایک سمت کو دکھائی دیا۔ تو اہل ہیئت نے گذشتہ سنین کے صفحات کو بھی دیکھنا شروع کیا۔ جہاں جہاں اس کے ہونے کا خیال تھا۔ تو معلوم ہوا کہ نقشہ سنہ ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۶ء میں بارہ موقعوں پر اس کا پتہ ملتا ہے۔ جب حساب لگایا گیا۔ تو معلوم ہوا کہ اس سیارہ کا سال بہ نسبت مریخ کے سال کے (۴۴) دن کم ہے۔ اور مدار بھی اس کا تین حصہ مدار مریخ سے الگ ہے چونکہ اس سیارہ کو مسیو دیبٹ نے دریافت کیا تھا۔ لہذا انہیں کا حق تھا کہ اس کے لئے کوئی نام تجویز کریں۔ چنانچہ انہوں نے اس کا نام (ایروس) رکھا یعنی الہ الحب۔ (اب تو یقین ہوا۔ کہ گیارہ سیارے پورے ہوگئے۔ جنہیں حدیث مذکور نے بیان فرمایا ہے) +

تیسری دلیل اس مطلب پر وہ ہے۔ جو مجلسی علیہ الرحمہ کی کتاب بحار جزائری کی انوار نعمانیہ۔ سید علی بن طاؤس کی کتاب النجوم میں چھٹے امام جناب صادق آل محمدؐ سے مروی ہے۔ فرمایا۔ فی السماء اربعۃ نجوم ما یعلمہا الا اھل بیت من العرب واھل بیت من الھند یعرفون منہا نجما واحدا فبذالک قام حسابھم "آسمان پر چار ایسے ستارے ہیں۔ جن کو سوائے عرب کے ایک گھر والوں کے (یعنی رسول خداؐ کے گھر والے جن سے مراد حضرتؐ کے بارہ اوصیاءؑ ہیں) کوئی نہیں جانتا۔ البتہ ہندوستان میں بھی ایک گھر کے لوگ ان میں سے ایک ستارے کو جانتے ہیں۔ جس سے اُن کا حساب درست ہوتا ہے" +

اسی روایت کی موید وہ روایت بھی ہے۔ جو کتاب النجوم مذکور اور کتاب دلائل حمیری میں بسند صحیح جناب صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ کہ آپ نے فرمایا۔ نجوم کا فن سوائے قریش کے ایک گھر والوں کے اور ہندوستان کے ایک گھر والوں کے کوئی نہیں جانتا جس سے بظاہر یہی مطلب ہے۔ کہ ایک تو رسول خداؐ کے گھر والے (اہلبیت کا ترجمہ ہے) اس فن کو بتعلیم الہی جانتے ہیں۔ اور اسی طرح ایک خاندان ہندوستان میں بھی ہے جو اس سے واقف ہے۔ کیونکہ قریش میں کوئی خاندان بحافظ علم و فلسفہ سوائے اہل بیت رسولؐ کے نہ تھا۔

تو گویا آپ نے اُن چار ستاروں کے جاننے کو مخصوص فرمایا آلِ محمدؐ سے۔ مگر یہ کہ بعض ہنود بھی اُن چاروں میں سے ایک ستارے کے عالم و عارف ہیں۔ (حدیث میں فی السماء سے مراد یا یہ اُوپر کی جانب ہے۔ یا وہ کرۂ بخاریہ ہے جس میں سیارہ گردش کرتا ہے۔ جیسا کہ سابق میں بیان کیا گیا۔ ہم نے اُس کا ترجمہ آسمان کیا ہے) +

نیز اس روایت کا ظاہر اسی بات کو بتا رہا ہے۔ کہ ان چاروں ستاروں سے مراد وہی ستارے ہیں۔ جو ہمارے نظامِ شمسی میں داخل ہیں۔ اور سیّار ہیں نہ ثوابت۔ کیونکہ ثوابت تو ہزاروں ہی ہیں۔ اور پھر یہ کہ اُس زمانہ میں صرف چار ہی ثوابت نامعلوم نہ تھے۔ بلکہ بیشمار ثوابت نامعلوم الحقیقت تھے۔ قدماء نے تو صرف ایک ہزار کچھ اوپر بیس ستاروں کی رصد کی ہی تھی۔ باقی اس زمانے میں مرصود ہوئے ہیں۔ جن کی تعداد تقریباً چھ ہزار ہے پھر کجا چھ ہزار اور کہاں چار۔ لہٰذا معلوم ہُوا۔ کہ اُن چاروں ستاروں سے مراد ثوابت نہیں ہیں۔ بلکہ نظامِ شمسی کے سیارے ہیں +

نیز اگر ثوابت ہی مراد ہوں۔ تو یہ فرمانا کیا معنی رکھتا ہے۔ کہ اُن میں ہندوؤں کو ایک ستارہ معلوم ہے۔ کیونکہ ثوابت تو بہت سے اُن کو معلوم تھے۔ اور بہت سے مجہول۔ ایک کی تخصیص کیسی۔ بلکہ ایسا بھی تھا۔ کہ بعض جگہ کے لوگوں کو کچھ ثوابت معلوم تھے۔ اور بعض جگہ کے لوگوں کو ان کے علاوہ۔ کیونکہ باہم کوئی طریقہ مراسلہ اور خط و کتابت کا تو تھا ہی نہیں جس سے ایک دوسرے کے معلومات سے فائدہ اٹھاتا۔ بخلاف آج کل کے کہ اگر ایک سیارہ کہیں امریکہ یا فرانس یا جرمنی میں دریافت ہوتا ہے۔ تو اخباروں کے ذریعہ تمام ملکوں میں دم کے دم میں مشہور ہو جاتا ہے +

نیز معصوم کا یہ فرمانا کہ اُس ایک ستارے کے معلوم ہو جانے سے اہلِ ہند کا حساب درست ہو گیا۔ بتا رہا ہے کہ وہ ستارہ ثابت نہیں ہے۔ بلکہ سیارہ ہے۔ کیونکہ حساب سیارات ہی سے لگایا جاتا ہے۔ نہ ثوابت سے۔ اور انہیں کے باہمی ارتباط سے حساب درست کیا جاتا ہے جس سے احکام درست ہو سکیں۔ اگر کہیں ایک حساب بھی مختل ہو جائے۔ تو سارا حساب اور تمام احکام غلط ہو جائیں۔ اسی وجہ سے ضروری ہے کہ منجم پہلے دورے سیارات کی معلوم کرے۔ پھر اُن کے مکان اور مقام اور مقابلات و مقارنات و اجتماع و تربیع وغیرہ کو دریافت کرے۔ (جو علم نجوم کے لئے ضروری ہیں)

لہذا معلوم ہوا کہ ان چاروں ستاروں سے مراد سیارات نظام شمسی ہیں +

اب انہیں سیارات مرصودۂ معلومہ پر منطبق کر لیجئے۔ دیکھئے تو اُس زمانے میں کے سیارے لوگوں کو معلوم تھے۔ اور کے نامعلوم۔ اب یہی جواب دینگے۔ کہ پانچ معلوم تھے۔ زمین کو وہ لوگ سیارہ جانتے ہی نہ تھے۔ باقی رہا آفتاب جسے وہ سیارہ گنتے تھے۔ مگر غلطی سے گنتے تھے۔ کیونکہ دراصل وہ سیارہ ہی نہیں ہے۔ اب پانچ باقی رہے۔ زہرہ۔ عطارد۔ مریخ۔ مشتری۔ زحل۔ باقی تین سیارے اُس وقت تک سوائے ہمارے ائمۂ ہدیٰ علیہم السلام کے کسی کو معلوم نہ تھے۔ (۱) فلکان۔ (۲) نبتون۔ (۳) وہ سیارہ جو ابھی معلوم نہیں ہوا ہے۔ یا اُسے مانئے جسے مسیو ویٹ نے دریافت کیا ہے۔ (اور اُس کا نام ایدوس رکھا ہے)۔ باقی رہا چوتھا ستارہ جو ان حضرات ع کے علاوہ بعض اہل ہند کو بھی معلوم تھا۔ (وہ ارانوس تھا)۔ کیونکہ وہ نظر سے بھی دکھائی دیتا ہے۔ اگرچہ بہت چھوٹا اور باریک نظر آتا ہے۔ مگر ممکن ہے۔ کہ ہندوستان کے بعض آدمی جو تیز نگاہ والے ہوں۔ وہ اُسے دیکھتے ہوں۔ اور اُس سے اپنے حساب درست کئے ہوں۔ نیز آئندہ ہم بیان کرینگے۔ کہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ارانوس کو عرب کے علاوہ کچھ حکماء نے مرصود بھی کر لیا تھا۔ کیونکہ آپ نے سوال کرنے والے سے فرمایا ہے۔ (انا سقطتم نجماً براسہ) کیا تم نے ایک سیارہ کو بالکل نمارد کر دیا۔" جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کسی زمانہ میں یہ سیارہ مرصود ہو چکا ہے۔ اور چاہیئے تھا۔ کہ سائل اُسے جانتا ہو۔ مگر نہ جانتا تھا۔ بہرحال پانچ وہ سماوی سیارے۔ چھٹے زمین۔ اور چار یہ سیارے (فلکان۔ نبتون اور ارانوس) دس ہوئے۔ اور اگر (فلیق) کو ملا لیجئے۔ تو گیارہ ہوتے ہیں۔ جس کا ذکر اوپر بہ تفصیل آچکا ہے +

معصوم ع نے اس سیارہ یعنی فلیق کا ذکر اس وجہ سے نہیں کیا ہے۔ کہ آپ تمام سیارات کو بیان کرنے کے لئے نہیں بیٹھے تھے۔ کہ خواہ وہ موجود ہوں۔ یا معدوم ہو گئے ہوں سب کی تفصیل فرمائیں۔ بلکہ مقصود صرف اُن سیارات کا بیان تھا۔ جو بالفعل موجود ہیں۔ اور ظاہر ہے۔ کہ سیارہ فلیق اُس وقت ٹوٹ کر بکھر چکا تھا۔ جسے بیان کرنیکی ضرورت بھی نہ تھی۔ باقی پانچ مشہور سیارے یعنی زہرہ و مریخ وغیرہ کے بیان کی بھی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ وہ تو سب کو معلوم ہیں۔ اس وجہ سے حضرت ع نے صرف چار کو فرمایا۔ جو اوروں کو معلوم

نہ تھے۔ اور کہا۔ کہ چار ایسے سیارے ہیں۔ جن کو سوائے ہمارے خاندان کے اور ہندوؤں کے ایک خاندان کے کوئی نہیں جانتا۔ والعلم عند اللہ +

بارھواں مسئلہ

کیا سیارات میں ذی حیات بھی رہتے ہیں؟

آج کل کچھ عجیب عجیب باتیں حکمائے متاخرین کی تحقیق کی ہوئی سنائی دیتی ہیں مثل اس کے کہ کرات سماویہ میں ہوا ہے۔ پہاڑ ہیں۔ دریا ہیں۔ بخار ہے۔ شب و روز ہیں۔ زندہ مخلوقات ہیں۔ جس طرح ہماری اس زمین پر دکھائی دیتے ہیں۔ تو کیا یہ بات شریعت اسلامی کے موافق ہے۔ آپ کے حامیان شریعت نے کچھ اس کی نسبت بیان کیا ہے۔ یا مخالفت کی ہے۔ یا دیگر مذہب سابقہ کی طرح سکوت سے کام لیا ہے؟

جواب فلاسفر سابقین کا خیال تو ضرور یہی تھا۔ کہ جرم ارض بالکل الگ ہے۔ اور عناصر کی ترکیب سے جو چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ اسی عالم ارضی میں پیدا ہوتی اور ہو سکتی ہیں۔ یعنی دیگر کرات سامیہ میں حیوانات و نباتات وغیرہ کا وجود نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ حیوانات کی زندگی کے لئے ہوا۔ بخارات شب و روز صبح شفق وغیرہ کی ضرورت ہے۔ ستاروں میں یہ چیزیں کہاں۔ لہٰذا لازمی نتیجہ یہ نکلا۔ کہ اس زمین کے سوا کوئی مقام آبادی حیوانات کا نہیں ہے۔ اور نہ یہاں کے سوا کہیں پانی۔ ہوا۔ آگ اور مٹی پائی جاتی ہے۔ جو حیوانات کے وجود کے لئے ضروری ہے۔ البتہ صاحبان مذاہب کے نزدیک ملائکہ کا وجود ان کرات عالیہ میں مسلم تھا۔ مگر وہ از قسم حیوانات نہیں ہیں۔ بلکہ مجردات محضہ ہیں جنہیں تغذّی کی ضرورت ہی نہیں واقع ہوتی۔ آج تک سابقین میں سے کوئی اس امر کا قائل نہیں ہوا۔ جو آپ کے سوال میں مندرج ہے تا رہے ہے حکمائے مغرب"۔ ان لوگوں نے البتہ اس بات کو مانا ہے۔ کہ جتنے کرے آفتاب کے گرد گردش کرنے والے ہیں۔ وہ سب مثل زمین کے کرے کے ہیں۔ ان میں پہاڑ۔ ہوا۔ بخار۔ لیل و نہار۔ فصول۔ چاند وغیرہ سب چیزیں موجود ہیں۔ جیسا کہ ہم نے تیسرے مسئلہ کے شروع میں بیان کیا ہے۔ اور وہاں بانی اسلام رسول انامؐ اور ان کے اوصیائے

متقدمین کے اقوال بھی درج کرتے ہیں۔ جن سے بتصریح معلوم ہوتا ہے۔ کہ حکمائے حال کی یہ رائے صحیح ہے۔ ہم نے وہاں یہ بھی بیان کر دیا ہے۔ کہ اگر ان چیزوں کا وجود سیارات مذکورہ میں مسلم مان لیا جائے۔ تو انہیں زمین کہنا چاہئے۔ کیونکہ ارض اُسی کو کہتے ہیں جسکی یہ شان ہو۔ البتہ حیوانات کے وجود کو آج تک کسی نے حسًا نہیں معلوم کیا ہے۔ نہ دوربینوں کے ذریعے سے اور نہ بغیر دوربینوں کے۔ ہاں قیاسًا ضرور اس بات کو کہتے ہیں۔ کہ اجرام سماویہ میں حیوانات کا وجود ہونا چاہئے جس کی دو وجہیں ہیں۔ (وجہ اول) یہ ہے۔ کہ ہم قطعًا دوربینوں کے ذریعے سے دیکھتے ہیں۔ کہ ان کروں میں پہاڑ موجود ہیں۔ اور ظاہر ہے۔ کہ پہاڑ نہیں پیدا ہوتے۔ مگر بڑے بڑے پتھروں اور ریگ سے جیسا کہ قواعد جیالوجی ہمیں بتاتے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے۔ کہ کرات سماویہ کی زمینیں بھی مثل ہماری اس زمین کے ہوں اور قابل زراعت و نمو نبات بھی ہوں نیز ہر کرہ میں کرہ بخاریہ کا ہونا بھی مسلم ہے۔ کیونکہ شواہد و دلائل اس کے موجود ہیں۔ مثلاً انکسار نور۔ وجود شفق۔ روشنی صبح وغیرہ۔ اور ظاہر ہے۔ کہ بخارات کا پیدا ہونا۔ ابر کا اُٹھنا۔ ہواؤں کا چلنا۔ فصلوں کا بدلنا۔ بغیر بارش اور برف۔ اور تند ہواؤں کے چلنے کے ممکن نہیں۔ کیونکہ نظام عالم کا جو قانون ہے۔ اُسے ہر جگہ ایک رفتار پر ہونا چاہئے۔ کیا معنی کہ زمین کے بخارات تو پانی اور ہوا کی مدد سے پیدا ہوں۔ اور کرات بلند کے بخارات و ابر وغیرہ بغیر پانی کے۔ لہٰذا ضروری ماننا پڑتا ہے۔ کہ وہاں بھی شدت سے مینہ برستا ہے۔ وہاں بھی بکثرت ابر اُٹھتے ہیں۔ وہاں بھی آندھیاں چلتی ہیں۔ تغیرات فصول اور جزر و مد سب کچھ ہوتا ہے۔ بلکہ ہماری زمین سے بھی زیادہ۔ کیونکہ یہاں ایک ہی چاند ہے۔ جس کے گھٹنے بڑھنے سے جزر و مد ہوتا ہے۔ وہاں تو کئی کئی چاند ہیں۔ اور پھر نہایت تیز رفتار اور بہت قریب۔ اور جب مان لیا گیا۔ کہ یہ سب چیزیں وہاں موجود ہیں۔ تو نباتات کیوں نہ ہوں گے۔ زمین قابل نبات کے موجود۔ بارش موجود۔ ہوا موجود۔ حرارت موجود۔ پھر نباتات کا نہ ہونا عقل کے خلاف ہے۔ پھر جب نباتات اور درخت ہوں گے۔ تو حیوانات بھی ضرور ہوں گے۔ کیونکہ ہم نے اپنی زمین پر تجربہ کیا ہے۔ کہ جہاں جھاڑیاں گھاس اور درخت ہوتے ہیں۔ وہاں پرندے۔ کیڑے مکوڑے اور دیگر حیوانات بھی ضرور پائے جاتے ہیں۔ اور جب پانی برستا ہی ہے۔ دریا و سمندر موجود ہیں۔ تو کیا وجہ کہ وہاں مچھلیاں نہ ہوں۔ دیگر آبی حیوانات نہ ہوں۔ یہ ایک وجہ ہوئی۔ (وجہ دوم) یہ ہے کہ

ازبسکہ مبدء فیاض یعنی باری تعالےٰ جل اسمہ کی طرف سے کسی قسم کا بخل نہیں ہے۔ بالضرور بحسب قابلیت و استعداد کے افاضہ خیر و جود فرماتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ مادہ میں صلاحیت قبول ہو۔ اور پھر اُس کی طرف سے موافق اُس کی صلاحیت کے افاضہ نہ ہو۔ اور جب یہ امر مسلم ہے۔ تو کیونکر ہو سکتا ہے کہ ان سیارات میں باوجود اس کے کہ صلاحیت حیوانات کے موجود ہونے کی ہے۔ پھر بھی انہیں پیدا نہ فرمائے۔ اور اُس صلاحیت کو بیکار ضائع کرے۔ اگر یہ انکشافات اور تحقیقات صحیح ہیں یعنی کرات سماویہ میں ہوا و بخار۔ پانی اور مٹی کے اجزا رات اور دن۔ صبح اور شفق موجود ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ کہ ان سب چیزوں کو جو لوازم حیات حیوان سے ہیں۔ خدائے تعالےٰ ضائع کرے۔ اور ان میں مخلوقات کو پیدا کر کے ان سے منتفع نہ فرمائے۔ تعالی اللہ عن ذلک علوا کبیرا۔ لہٰذا بمقتضائے دلیل عقلی ماننا پڑیگا۔ کہ ان کروں میں بھی ذی حیات بستے ہیں۔ جس طرح ہماری زمین پر پیدا ہوتے اور رہتے ہیں +

اس مقام پر مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہم متاخرین حکماء کی رایوں کو لکھیں۔ اور جو کچھ انہوں نے اپنی کوششوں سے ان سیارات میں دیکھا ہے۔ اُس کے بعد اُن آیات قرآنیہ اور روایات کو لکھیں۔ جو ان جدید تحقیقات کے موافق ہیں +

علامہ فاندیک اصول ہیئت میں لکھتے ہیں "(زہرہ کے متعلق) آہستہ آہستہ نور کے کم ہونے سے خط فاصل کی جانب اور بعض کلف کے پڑ جانے کے سبب سے اس کرہ میں ہوا اور بخار کا کرہ بھی محسوس ہوا۔ اس کرہ میں جو پہاڑ ہیں۔ اُن میں سے بعض کی پیمائش کی تھی۔ تو معلوم ہوا۔ کہ (۲۷) میل کے ہیں۔ لیکن ابھی یہ بات مشکوک ہے۔ کیونکہ اس سیارے کی رصد بسبب اس کی زیادتی روشنی کے بہت دشوار ہے" +

پھر مریخ کی بابت لکھا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے۔ کہ اس سیارے کے دونوں قطبوں کی طرف ایک سفید سی مسافت معلوم ہوتی ہے۔ جو سردی کے زمانے میں زیادہ اور گرمی کے زمانے میں کم ہو جاتی ہے۔ جس سے خیال ہوتا ہے۔ کہ یہ برف کا دہ حصہ ہے۔ جو عموماً قطب کی طرف ہوا کرتا ہے۔ آلہ اسپکٹرسکوپ بھی بتاتا ہے کہ اس سیارہ میں بخارات کا کرہ موجود ہے۔ اور جو زرد ٹکڑے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ بظاہر خشکی کا حصہ ہے۔ اور جو ٹکڑے سبز دکھائی دیتے ہیں۔ وہ پانی کا حصہ ہے۔ مگر بری حصہ بہ نسبت بحری حصہ کے اس میں زیادہ ہے۔ برعکس

زمین کے کہ اس میں بحری حصہ زیادہ ہے۔ اور بری کم۔ ابھی تک اس کے قطبین کا مسطح ہونا معلوم نہیں ہؤا ہے۔ اور نہ اس سیارے کے لئے کوئی مشہور چاند ہے۔ البتہ تقریباً مان لیا جاتا ہے +

(مَیں کہتا ہوں)۔ استاد "اساف ہال" نے ۱۲۹۴ھ ہجری میں مریخ کے دو چاند دریافت کئے۔ اُس وقت فانڈیک کی کتاب اصول ہیئت چھپ چکی تھی۔ اسی وجہ سے اُس کے بعد والی کتابوں میں فانڈیک نے ان دونوں چاندوں کا ذکر کیا ہے +

مشتری کی بابت لکھا ہے۔ کہ بڑی دوربینوں کے ذریعے سے معلوم ہؤا ہے۔ کہ اس سیارہ میں کچھ دھاریاں ہیں۔ جو اُس کے خط استوا کے موازی واقع ہوئی ہیں۔ اُن دھاریوں کے قطعے مختلف قسم اور مختلف رنگ کے ہیں۔ ایک طرح پر قائم نہیں رہتے۔ کبھی کسی طرح اور کبھی کسی طرح کے دکھائی دیتے ہیں۔ آگے لکھا ہے کہ مسٹر (سوبیٹ یا صوت) نے لکھا ہے۔ کہ مشتری میں ایک قطعہ اتنا بڑا تھا۔ کہ تقریباً طول اُس کا (۲۲۰۰) میل ہوگا۔ جو قریب تین دقیقہ کے اندر منتشر ہوگیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کرہ میں بھی تغیرات ابر و بادا بخرہ اور ہبنہ وغیرہ پائے جاتے ہیں +

بعض فلاسفروں کا خیال ہے۔ کہ یہ چیزیں مشتری میں آفتاب کی حرارت کی وجہ سے نہیں پیدا ہوتیں۔ بلکہ خود اس کی ذاتی حرارت ان کا سبب ہوتی ہے۔ جس سے بہت ابخرے اُٹھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایسا بھی دیکھا گیا ہے۔ کہ اُس کا ایک چاند ایک مرتبہ چھپ گیا۔ پھر اُسی مقام پر دکھائی دیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کوئی ابر کا ٹکڑا یا بخار غلیظ اُس کے محاذی آگیا تھا۔ جس نے اُسے چھپا لیا تھا۔ اس سیارے کے استوائی اطراف بہ نسبت اُس کی باقی سطوح کے زیادہ روشن ہیں۔ کبھی کبھی اس کی سطح پر نا قائم حلقے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اور دھاریاں بادامی بھورے رنگ کی بھی ہیں۔ جو بہت واضح و روشن نہیں ہیں۔ جس کے سبب سے اُن کی شناخت اصلی سیارے کے رنگ سے بخوبی ہوتی ہے +

زحل کی بابت کہا ہے۔ کہ ہرشل کا خیال ہے۔ کہ زحل میں ہوا کا کرہ ہے۔ اور اُس کی فصلیں مریخ کی فصلوں سے مشابہ ہیں +

سیارات کے طیف کے بیان میں لکھا ہے۔ "سکی اور جانسن" کی رصدوں سے معلوم

طیف جس کا ترجمہ بظاہر ستاروں کا خواب ہے۔ یعنی وہ مضامین خیالیہ جو سیارات کی نسبت ذہن میں آتے ہیں۔ مترجم

ہوتا ہے کہ مشتری اور زحل میں بھی پانی کے بخارات پائے جاتے ہیں۔ (کتاب النقش فی الحجر) میں مریخ کی بابت لکھتے ہیں "اس کے دونوں طرف ایک سفید سا قطعہ پایا جاتا ہے۔ جو گرمی میں گھٹ جاتا اور سردی میں بڑھ جاتا ہے۔ اور ایک گھٹتا تو دوسرا بڑھتا ہے جس طرح زمین کے قطبین کی طرف کا حال ہے۔ نیز کہا ہے۔ کہ مشتری پر جو نشانات اور دھاریاں پائی جاتی ہیں۔ وہ بتا رہی ہیں۔ کہ اس کرے کو ابر گھیرے رہتے ہیں۔ اور وہ گول دائرے جو اس میں ہیں۔ وہ سوراخ دار ہیں۔ جس سے مشتری کا اصل جرم دکھائی دیتا ہے۔ یہ دائرہ اور دھاریاں قائم بھی نہیں رہتیں۔ بلکہ جس طرح جلد جمع ہوتی ہیں۔ اسی طرح جلد سمٹ جاتی اور متصل و منفصل بھی ہو جاتی ہیں۔ یہی اس بات کی دلیل ہے۔ کہ دور سے وہ دھاریاں معلوم ہوتی ہیں۔ مگر دراصل وہ ابر کے ٹکڑے ہیں۔ جو اس پر چلتے رہتے ہیں +

زحل کی نسبت لکھتے ہیں۔ اس سیارہ میں جو منطقے اور نشانات پائے جاتے ہیں۔ وہ مشتری کے منطقے اور نشانات سے مشابہ ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس میں بھی ابر وغیرہ بیشتر رہتے ہیں +

(کتاب ارواء الظماء) میں عطارد کی نسبت لکھتے ہیں "اس کی نسبت حکم لگایا گیا ہے۔ کہ اس کے لئے ایک کرہ بخار یہ کثیفہ بھی ہے۔ جو روشن اور تاریک دونوں حصوں کے درمیان ایک حد قائم کرتا ہے۔ اس کا تاریک حصہ چمکدار نہیں ہے جس سے خیال ہوتا ہے۔ کہ غالباً وہ پہاڑ ہو گا" +

مریخ کی نسبت لکھتے ہیں "بعض لوگوں نے سطح مریخ کا ایک نقشہ بنایا ہے۔ اور اس کے بری و بحری حصوں کو جدا جدا کر کے دکھلایا۔ اور ہر ایک کے لئے نام بھی تجویز کیا ہے۔ مثلاً "قارہ سکی" "قارہ میلر" "جزیرہ لوکیرہ" "بحر کنوبل" "خلیج برٹن" "بوغاز داوس" "بحیرہ سکیا پرلی" "بوغاز ارا کو" وغیرہ۔ اس کے بعد لکھتے ہیں "اس کرے میں پانی اور برف وغیرہ کا پایا جانا بتاتا ہے کہ یہاں ہوا کا کرہ ضرور ہے سپکٹرسکوپ کے ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ مریخ کا کرہ بخار یہ زمین کے کرہ بخاریہ سے مشابہ ہے +

مشتری کے متعلق بعض ظواہر فضائیہ کے بیان کے لکھتے ہیں "یہ جتنی چیزیں وہاں نظر آتی ہیں۔ اس بات کو بتاتی ہیں کہ ہوا اور بخار کا کرہ وہاں ضرور ہے۔ (مسٹر فلامریون) مشہور ہیئت دان فرانسوی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں "عطارد کے پہاڑ ہماری زمین کے

پہاڑوں سے بہت زیادہ بڑے بلند ہیں۔ جن میں معدنی پتھر بہت ہیں۔ کرۂ زہرہ بھی مثل زمین کے ہے۔ مگر زمین سے کسی قدر ہلکا ہے۔ معدنی پتھر اُس میں زیادہ ہیں۔ گرمی کے زمانے میں آفتاب کی حرارت کو وہ ابر جو اُسے گھیرے رہتے ہیں کم کر دیتے ہیں۔ نیز ہم نے ہوائے اٹمسفر میں عطارد پر بہت گہرے ابر دیکھے ہیں۔ جس سے خیال ہوتا ہے۔ کہ اُس میں حرارت حد اعتدال پر ہے۔ اور پہاڑی سلسلے بھی بہت دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اُس کی اٹمسفری ہوا میں ابر کبھی کبھی بہت گہرے بھی ہو جاتے ہیں۔ یہ سیارہ ہر طرف سے سکونت کے قابل ہے۔ میرا خیال ہے۔ کہ اس میں متمدن آدمی رہتے ہیں۔ جن میں وہ لوگ بھی ہیں۔ جو ہماری زمین کی رصد لگاتے ہیں جس طرح ہم لوگ ان سیارات کی رصد لگاتے ہیں۔ ممکن ہے۔ کہ اُن کے آلات ہمارے آلات سے زیادہ قوی ہوں۔ مریخ میں تو ضرور متمدن اور کامل الصنعت انسانوں کی بود و باش ہے۔ اُن کا تمدن اسی سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُن لوگوں نے بڑے بڑے باندھ اور سدّ بنائے ہیں۔ جن کا عرض ایک لاکھ میٹر کا ہے۔ اور طول پانچ سو میلین کا۔ جن کے ذریعے سے اپنے ہاں کے سمندروں کے طغیان کے وقت زمینوں کو خراب ہونے سے بچایا ہے۔ علے ہذا القیاس کتاب دائرۃ المعارف۔ کتاب مشہد الکائنات کتاب حدائق النجوم وغیرہ میں زہرہ و مشتری و مریخ و عطارد کی نسبت پہاڑوں۔ دریاؤں ہواؤں۔ بادلوں اور بخارات کا ہونا بیان کیا ہے۔ مسٹر ہاف نے یہ بھی لکھا ہے۔ کہ چونکہ مریخ کا سن زیادہ ہے۔ اور زمین سے پہلے اس میں جمود اور برودت پیدا ہوئی۔ اس وجہ سے اس کے رہنے والے آدمیوں کی خلقت بھی زمین کے باشندوں سے بہت قبل ہوئی ہے۔ اور اُن کی ترقی بھی زمین والوں کی ترقیوں سے کہیں زیادہ ہے +

(تقویم المویّد ۱۳۱۹ھ) کے صفحہ ۱۲۷ میں فاضل محمد مسعود آفندی نے لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ "حکمائے اس باب میں اختلاف کیا ہے۔ کہ کواکب میں آیا آبادی ہے۔ یا نہیں مشہور تو یہی ہے۔ کہ آبادی نہیں ہے۔ مگر ہرشل اور اراغو وغیرہ بڑے بڑے فلاسفروں کی یہی رائے ہے۔ کہ کل کواکب مسکونیۃ کے قابل ہیں مشہور کا خیال یہ ہے۔ کہ رصد کے ذریعے سے ہمیں معلوم نہیں ہوا کہ ان میں آبادی ہے۔ اِلّا یہ کہ ثابت ہو جائے۔ کہ ان میں اسباب حیات حیوانات کے پائے جاتے ہیں۔ اور یہ بات ابھی مشکوک ہے۔ قمر کی فضا تو بالکل پانی اور دیگر عناصر سے خالی ہے۔ لیکن لوگوں کا خیال ہے۔ کہ مریخ میں بخارات اور دیگر

اسباب زندگانی بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اس وجہ سے زیادہ قوی ہے۔ کہ ان میں باشندے ہوں۔ اگرچہ صورت و سیرت کی راہ سے ارضی باشندوں سے مخالف ہوں۔ اس زمانے میں جو طے شدہ بات ہے۔ وہ اس قدر ہے۔ کہ زہرہ اور عطارد چونکہ جوان اور جدید العہد ہیں۔ اس وجہ سے ان میں ابھی قابلیت مسکونیۃ کی نہیں ہے۔ اور اگر بالفرض آباد ہوں۔ تو ہو سکتا ہے۔ کہ اس کے باشندے ویسے ہی ہوں۔ جیسے آدمیوں سے قبل زمین کے باشندے تھے۔ رہا مشتری کا کرہ۔ یہ چونکہ ابر سے ہر وقت گھرا رہتا ہے۔ اور اس کی اغلب سطح پر پانی ہے۔ تو ممکن ہے۔ کہ بحری جانور اس میں زیادہ ہوں۔ "زحل" اور "تارانوس" اور "نبتون" کی نسبت کوئی رائے ابھی تک قائم نہیں ہوئی ہے۔ کیونکہ بُعد ہم سے بہت زیادہ ہے۔ اور نور بھی ان کا کم ہے۔ حرارت بھی کم ہے۔ یعنی زمین کی حرارت کی نسبت ۱/۹ جزو کی نسبت ہے۔ فصلیں بھی اس کی طولانی ہیں۔ اس وجہ سے ہم ان کی نسبت کچھ نہیں کہہ سکتے۔ البتہ مریخ میں حکمائے حال نے خطوط اور دھاریاں دیکھی ہیں۔ جس سے خیال ہوتا ہے۔ کہ یہ دھاریاں نہیں ہیں۔ بلکہ سمندر۔ دریا اور دریاؤں کے بند ہیں۔ نیز چونکہ مریخ کا وزن زمین کے وزن سے ایک تہائی کی نسبت رکھتا ہے۔ اس لئے اس کے باشندوں کو ہلکا اور خوش قامت اور خوش رُو ہونا چاہئے۔ منشی (برنارڈل ڈوسان پیئر) نے لکھا ہے۔ کہ زہرہ کے باشندے زمین کے باشندوں سے مشابہ ہیں۔ بعضے ان میں سے بھیڑ اور بکریوں کے چرواہے بھی ہیں۔ جو پہاڑوں کی چوٹیوں پر دکھائی دیتے ہیں۔ بعضے ان میں سے نہروں میں اپنا وقت گزارتے ہیں۔ کیونکہ اکثر ناچ۔ گانے۔ کھانے پینے اور عیش و عشرت کے شائق ہیں۔" (مسٹر فونٹنل نے) لکھا ہے۔ کہ عطارد کے باشندے چھوٹی چھوٹی عمارتوں اور چھوٹے مکانوں میں رہتے ہیں۔ کیونکہ ان کے قد بہت چھوٹے ہیں۔ اور بسبب شدت حرارت آفتاب کے اکثر مجنون ہیں۔" ایک اور حکیم نے لکھا ہے۔ جس کی کتاب ۱۷۵۰ء میں چھپی تھی۔ کہ "عطارد کے باشندے مثل فرشتوں کے پردار ہیں۔ جسم ان کے چھوٹے ہیں۔ ہوا میں اُڑتے پھرتے ہیں۔"

(میں کہتا ہوں) بعض حکمائے حال نے جو حیوانات کے وجود کو ان کُرات میں مستبعد سمجھا ہے۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے۔ کہ یہ کرے آفتاب سے یا تو زیادہ قریب ہیں۔ مثلاً عطارد اور فلکان۔ یا زیادہ بعید ہیں۔ مثلاً زحل۔ یارانوس اور نبتون۔ اقل والے دہ میں تو حرارت

اس قدر ہے۔ کہ حیوانات زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور پچھلے تینوں میں سردی اس قدر ہے۔
کہ حیوانات کی زندگی محال ہے۔ مگر جواب اس کا یہ ہوسکتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ آپ
یہی کہ سکتے ہیں۔ کہ زمین کے حیوانات کی مانند اُن میں حیوانات نہیں ہے جو زیادہ گرمی
یا زیادہ سردی کے متحمل ہو سکیں۔ مگر کیا ممکن نہیں ہے۔ کہ ایسے حیوانات وہاں موجود ہوں
جو اُن سیاروں کے مزاج کے موافق ہوں۔ کیونکہ معلوم ہے۔ کہ آگ جاندار چیزوں کو جلادیتی
ہے۔ مگر اُنہیں کو جو اُس کے مزاج کے نہ ہوں۔ سمندر نامی کیڑے کو جو آگ ہی میں پیدا ہوتا
ہے نہیں جلاتی۔ بلکہ اُس کو زندہ رکھتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس برف میں ایسے حیوانات نہیں
رہ سکتے۔ جن قوٰے حرارت و برودت میں معتدل ہوں لیکن کیا مضایقہ ہے ایسے حیوانات
کے وجود میں جو بالکل باردالمزاج ہوں۔ جیساکہ بالفعل بھی تحقیق ہُوا ہے۔ کہ زمین کے
قطب شمالی کے قریب باوجود شدت برف باری کے حیوانات پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ
بسبب برودت کے سفید رنگ کے ہیں +

(دوسرے) یہ کہ محض آفتاب سے قریب یا دور ہونا اس کا سبب نہیں ہوسکتا۔
کہ حیوانات وہاں نہ رہ سکتے ہوں۔ بلکہ ممکن ہے۔ کہ جہاں آفتاب کو بُعد ہے۔ وہاں خود
اُن سیارات میں ذاتی حرارت اس قسم کی ہو۔ جو حرارت آفتاب کی بدل ہو سکے۔ یا جو سیارہ
آفتاب سے نزدیک ہے۔ اُس میں ذاتی برودت ایسی ہو۔ جو اُس کی حرارت کا مقابلہ کرسکے۔
اور ایسا مشاہدہ میں بھی آیا ہے۔ (ہملایا) کے پہاڑ کو دیکھئے۔ تو کس قدر بلند ہے۔ اور
آفتاب کی حرارت اس پر کس قدر پڑتی ہے چاہئے تھا۔ کہ یہاں کبھی سردی نہ ہوتی۔ مگر کوئی
زمانہ ایسا نہیں ملتا جس میں برف اس جگہ نہ پائی جاتی ہو۔ اسی طرح اس پہاڑ کے دامن
اور اُس کے نیچے کے صحرا۔ آفتاب سے بہت دور ہیں۔ چاہئے تھا۔ کہ ان میں سردی بشدت
ہو۔ لیکن بخلاف اس کے اس قدر حرارت ان میدانوں میں ہے۔ کہ آدمی ہرگز اُس کا متحمل
نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ہوسکتا ہے۔ کہ ان سیارات میں بھی تبدل فصول اور ہواؤں اور
بارشوں کی وجہ سے اعتدال پیدا ہو جاتا ہو۔ جو وہاں کے باشندوں کے واسطے زندگی کا پورا
سامان مہیا کر سکتے ہوں +

(تیسرے) یہ کہ زیادتی قرب آفتاب کا اثر اُن ہی مقامات پر زیادہ ہوتا ہے جو خط استوا
کے قریب ہیں۔ نہ اُن مقامات پر جو قطبین سے قریب ہیں۔ اسی طرح بُعد آفتاب کا زیادہ

انہیں مقامات پر ہو سکتا ہے جو قطبین سے قریب ہیں۔ نہ ان مقامات پر جو خط استوا سے قریب ہیں۔ لہٰذا ممکن ہے۔ کہ عطارد وغیرہ حار سیاروں پر تو آبادی قطبین کی طرف ہو۔ اور زحل وغیرہ بارد سیارات پر آبادی حدود خط استوا میں ہو +

(چوتھے) یہ کہ اکثر حار اور بارد غذائیں بھی حرارت اور برودت کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ لہٰذا ممکن ہے۔ کہ جو لوگ بارد مقامات کے رہنے والے ہوں۔ وہ اپنی برودت کا تدارک حار غذاؤں سے کرتے ہوں۔ اور جو حار مقامات کے رہنے والے ہوں۔ وہ اپنی حرارت کا تدارک بارد غذاؤں سے کر لیتے ہوں۔ پھر تو کوئی وجہ عدم موجودگی حیوانات کی نہیں ہو سکتی +

ان تمام تفصیلوں کے بعد ہم اپنی اسلامی شریعت کے اقوال کو اس مسئلہ میں دکھاتے ہیں۔ اگرچہ اس بارہ میں شریعت نے بہت کچھ بیان فرمایا ہے۔ جن کا شمار نہیں ہو سکتا۔ اور ہم نے بھی مسئلہ تعدد ارض کے چھٹے۔ دسویں۔ گیارھویں چودھویں۔ پندرھویں اور سولھویں مقالے میں کچھ احادیث و اقوال مشرح بیان کر دئے ہیں۔ مگر اس مقام پر چند کلمات شریعت کو پیش کرتے ہیں +

(ایک) اُن میں سے خدائے تعالےٰ کا کلام ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے۔

ومن ایاتہ خلق السماوات والارض وما بث فیہما من دابۃ۔ "خدائے تعالےٰ کی نشانیوں میں سماوات اور زمین کا پیدا کرنا ہے۔ اور نیز جو چلنے والے حیوانات اُس نے اِن دونوں میں پیدا کر کے پھیلائے ہیں" +

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ جس طرح زمین پر چلنے والے حیوانات ہیں۔ اُسی طرح سماوات پر بھی ہیں۔ کیونکہ پروردگار عالم نے زمین و سماوات میں فرق نہیں کیا ہے۔ بلکہ مساوی طور پر دونوں میں موجودیت حیوانات کو ظاہر فرمایا ہے۔ "سماء" کے معنی چونکہ بلندی کے ہیں۔ اس لئے سماوات کے معنی کرات عالیہ یعنی سیارات کے ہونگے۔ اسی کی موید وہ حدیثیں بھی ہیں جو خلقت حیوانات کو ان سیارات میں بتاتی ہیں +

رہے مفسرین۔ وہ چونکہ اس نکتہ کو سمجھے نہ تھے۔ اس وجہ سے آیت میں تاویلیں کر گئے ہیں۔ مگر زمخشری اور بیضاوی نے لکھا ہے۔ کہ کچھ بعید نہیں ہے۔ اگر خدائے تعالےٰ نے سماوات میں ایسے حیوانات پیدا کئے ہوں۔ جو مثل آدمیوں کے زمین پر چلنے کے چلتے ہوں +

اب اگر یہ بات فی الحقیقت صحیح ہو۔ جو حکمائے حال کہتے ہیں۔ تو ہم کو اس آیت کے ظاہری معنی مراد لینے میں کچھ تردد ہی نہ ہوگا۔ اور اگر واقع میں یہ بات غلط ہے۔ اور محض فلاسفران یورپ کا خیال ہی خیال ہے۔ تو ہم بھی اُنہیں تاویلات سے کام لینگے۔ جو قدمائے مفسرین لکھ گئے ہیں۔ بہر صورت ہمارے بچاؤ کی تدبیر آسان ہے ✦

(دوسری) اُن میں سے یہ آیت ہے۔ "تبارک الذی جعل فی السماء بروجًا" اکثر مفسرین نے بروج سے مراد عمارتیں اور مکانات لئے ہیں۔ کیونکہ بروج بمعنی متداول یعنی منزل آفتاب و ماہتاب تو مسلمانوں کی جدید اصطلاحات میں سے ہے۔ جو زمانہ بنی عباسیہ میں فلسفہ قدیمہ کے ترجمہ کے وقت بنائے گئے تھے۔ ورنہ اصلی معنی اس کے تو عمارات و مکانات ہی کے ہیں۔ چنانچہ مفسر فخر الدین رازی نے لکھا ہے۔ "البروج ھی القصور العالیة" اس لحاظ سے جائز ہے۔ کہ آیت میں اشارہ ہو اُس مطلب کی طرف۔ جسے اب حکماء حال نے اختیار کیا ہے۔ کہ ان سیارات میں آبادی ہے۔ جہاں لوگوں نے شہر مکانات اور بڑے بڑے محل بھی بنوائے ہیں۔ نیز لفظ بروج کو معرفہ نہیں فرمایا ہے۔ جس سے بارہ برج سمجھ میں آتے۔ بلکہ "بروجًا" نکرہ فرمایا ہے۔ جس سے بے تعین بارہ کی مراد ہو سکتی ہے۔ اور اس سے اشارہ اُنہیں مکانات کی طرف ہوگا ✦

(تیسری) بحار۔ کافی۔ وافی تالیف علامہ محمد محسن فیض۔ بصائر الدرجات اور انوار نعمانیہ وغیرہ میں جناب صادق علیہ السلام سے بسند ہائے معتبرہ روایت کی ہے۔ کہ ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کی "میں آپ پر فدا ہوں۔ یہ تو آدم علیہ السلام کا قبہ ہے" (یعنی آسمان) سو آپ نے فرمایا۔ نعم یعنی ہاں۔ پھر فرمایا۔ "و للّٰہ قباب کثیرۃ الا ان خلف

مغربکم ھذا تسعۃ و تسعون مغربًا ارضًا بیضاء مملوۃ خلقًا یستضیئون بنورہ لم یعصوا اللّٰہ طرفۃ عین ما یدرون خلق آدم علیہ السلام ام لم یخلق" اور یہی ایک قبہ کیا بلکہ خدا ئے تعالےٰ نے تو تمہارے اس مغرب کے پیچھے کی طرف ننانوے مغرب پیدا کئے ہیں۔ جن کی زمینیں سفید اور مخلوقات سے پُر ہیں۔ اُس کی روشنی اُن کے لئے کافی ہوتی ہے۔ ان لوگوں نے ذرہ برابر بھی خدائے تعالےٰ کی معصیت کبھی نہیں کی۔ اُنہیں یہ بھی خبر نہیں۔ کہ آدم علیہ السلام پیدا ہوئے ہیں یا نہیں ✦

معلوم ایسا ہوتا ہے۔ کہ سائل پہلے سے جانتا تھا۔ کہ قبے بہت سے ہیں۔ جب ہی

تو اس نے کہا۔ کہ "یہ تو آدم کا قبہ ہے"۔ کیونکہ اس سے پہلے امام محمد باقر علیہ السلام نے اس مطلب کو بیان فرما دیا تھا۔ سائل نے چاہا کہ اس مضمون کو جناب صادق علیہ السلام کی زبانی بھی سن لے۔ ہم آئندہ قبوں والی روایت باب تعدد عوالم میں نقل کرینگے۔ جس میں معصومؑ نے فرمایا ہے۔ کہ یہ تو ہمارے جد جناب آدمؑ کا قبہ ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی فلاں فلاں قبے ہیں +

معصومؑ نے روایت مذکورہ سابق میں "ارضا بیضا" فرمایا ہے۔ یہ بظاہر عبارت "مغربا" کا بیان ہے جس سے ظاہراً سمجھ میں آتا ہے۔ کہ فضا میں تعدد ارض کے مسئلہ کو بیان فرماتے ہیں۔ اور یہ کہ وہ سب مخلوقات سے پر ہیں۔ جیسا کہ متاخرین حکماء کی رائے ہے۔ بنورہ میں ممکن ہے کہ ضمیر اس کی اللہ کی طرف راجع ہو۔ یعنی نور خدا سے روشن ہیں۔ یا مغرب کی طرف راجع ہو۔ جس میں مراد وہ زمین ہے۔ جسے آپ بیان فرمانا چاہتے ہیں۔ یا آفتاب کا نور مراد ہو۔ کیونکہ وہ بھی خدائے تعالےٰ ہی کا پیدا کیا ہوا نور ہے۔ (یہاں کے مخلوقین کا معصیت سے بری ہونا جیسے معصوم نے ارشاد فرمایا ہے۔ اس کو ہم آئندہ مسائل متفرقہ کے جواب میں بیان کرینگے) +

(کتاب فلک السعادۃ) میں فاضل اعتضاد السلطنۃ ابن خاقان فتح علی شاہ قاچار نے لکھا ہے۔ کہ میں نے یہ حدیث ایک یورپین حکیم کے سامنے بیان کی۔ تو کہنے لگا۔ کہ "اگر مجھے یقین ہو جائے۔ کہ یہ کلام تمہارے نبیؐ کے وصیؑ کا ہے۔ تو میں تمہارے نبیؐ کا دین قبول کر لوں اور اسلام لاؤں"۔ افسوس ہے۔ کہ فاضل مذکور اس روایت کی صحت ثابت کرنے سے عاجز رہے۔ کیونکہ انہیں اس قدر احادیث پر اطلاع نہ تھی۔ اور نہ انہوں نے کتب روایات و اخبار کا اس قدر مطالعہ کیا تھا۔ ورنہ ہم نے جن جن کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ حدیث معصومؑ سے اس قدر معروف و مشہور ہے۔ کہ کتنے علماء نے اپنی اپنی کتابوں میں کئی کئی سندوں سے روایت کیا ہے۔ مگر فاضل مذکور نے ان کتابوں میں سے کسی کا حوالہ نہیں دیا۔ بلکہ ایک غیر مشہور کتاب سے اسے نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔ کہ "میں نے یہ روایت نظام الدین احمد گیلانی شاگرد سید الحکماء ملا محمد باقر داماد علیہ الرحمہ کی کتاب میں دیکھی تھی"۔ اگر فاضل مذکور اس روایت کو صرف کافی ہی میں دیکھ لیتے۔ تو اس وقت اتمام حجت کے لئے کافی تھا۔ کیونکہ یقینی طور پر متواتر ثابت ہے۔ کہ کافی شیعہ مذہب کی مشہور اور بہت قدیم کتاب ہے۔ جس کے قدیم قلمی نسخے بھی بیشمار ملتے ہیں +

مگر ہم بحمد اللہ جتنی روایتیں ان مضامین میں لکھتے ہیں۔ اُن سب کو مشہور مشہور کتابوں سے لکھتے ہیں۔ جو اس زمانے سے بہت قبل تالیف ہوئی ہیں۔ اور سنین تالیف بھی اُن کے معلوم ہیں۔ جس سے یہ ہرگز گمان نہیں ہو سکتا۔ کہ کسی نے اس زمانے کے حکماء سے سُن کر اپنی کتاب میں اس مضمون کو معصومؑ کی طرف نسبت دے کے لکھ دیا ہے۔ جس کا جی چاہے۔ وہ اصل کتاب بھی دیکھ لے۔ اگر ہمارے بیان میں کچھ اُسے شبہ ہو +

(چوتھے) بحار الانوار مجلسیؒ۔ الانوار النعمانیہ سید جزائری۔ کتاب فتوحات شیخ العرفاء محی الدین متوفی ۶۳۸ھ ہجری کے آٹھویں باب میں (عبداللہ بن عباس) صحابی رسولؐ اور اُن کے چچازاد بھائی سے کعبہ کے بیان میں مروی ہے۔ کہ "انہا بیت من اربعة عشر بیتا وان فی کل من الارضین السبع خلقا مثلنا حتے ان فیھم ابن عباس مثلی"۔ "یہ خانہ کعبہ تو ایک عبادت خانہ ہے چودہ عبادت خانوں میں سے۔ اور یہ کہ ہر زمین میں ساتوں زمینوں میں سے مثل ہمارے مخلوقات ہیں۔ حتے کہ مثل میرے ابن عباس بھی ہیں"۔ اس روایت میں تصریح بیان کیا گیا ہے۔ کہ سیارات میں نوع بشر موجود ہے۔ اور یہ کہ اس کعبہ کے علاوہ بھی اور کعبے ہیں۔ جن کو اُن زمینوں کے رہنے والوں کا قبلہ بنایا ہے۔ اور یہ کچھ مستبعد نہیں ہے +

(پانچویں) جناب شیخ رجب برسی نے اپنی کتاب مناقب میں جسے ۸۰۰ھ ہجری میں تالیف فرمایا ہے۔ اور شیخ ابراہیم نے جو دسویں صدی کے علماء میں سے ہیں۔ اور علامہ مجلسیؒ نے بحار میں کئی کئی سندوں سے وصی ہفتم امام موسیٰ کاظم علیہ السلام بن جعفر الصادق علیہ السلام سے روایت کی ہے۔ جس کا حاصل ترجمہ یہ ہے۔ کہ جبرئیل امینؑ نے رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا۔ "قسم اُس کی جس نے تمہیں سچا نبیؐ بنا کر بھیجا ہے۔ کہ مغرب کی پشت پر ایک سفید (روشن) زمین ہے۔ جس میں خدائے تعالےٰ کی مخلوقات میں بہت سے لوگ بستے ہیں۔ وہ ہرگز کبھی اپنے معبود کی نافرمانی نہیں کرتے۔ جن کے گوشت اور چہرے (خوف خدا سے) روتے روتے پھٹ گئے ہیں۔ علی ابن ابی طالب علیہ السلام فرماتے ہیں۔ میں نے کہا۔ یا رسول اللہؐ کیا وہاں ابلیس یا اور کوئی بنی آدم میں سے نہیں ہے۔ تو فرمایا۔ کہ قسم اُس کی جس نے مجھ کو سچا نبی بنا کر بھیجا ہے۔ وہ لوگ تو یہ بھی نہیں جانتے۔ کہ خدائے تعالےٰ نے آدم یا ابلیس کو پیدا بھی کیا ہے یا نہیں۔ عدد کے لحاظ سے بھی وہ اس قدر ہیں۔ کہ اُن کا شمار سوائے خدا کے کوئی نہیں کر سکتا" +

اس حدیث شریف سے بھی سمجھ میں آتا ہے۔ کہ جو لوگ اس زمین کے علاوہ اور زمینوں میں بستے ہیں۔ وہ بھی از قسم انسان ہیں۔ کیونکہ رونا انسان ہی کی خاصیت ہے۔ اور گوشت کا ہونا حیوانیت کی دلیل ہے۔ یعنی وہ بھی حیوان ناطق ہیں۔ نیز یہ کہ عبادت کرنا عصیاں نہ کرنا کسی چیز کو جاننا یا کسی خاص شے کو نہ جاننا عقل اور قدرت کی علامت ہے۔ یعنی وہ عالم و با اقتدار و اختیار بھی ہیں +

(چھٹے) شیخ محمد حر عاملی نے صحیفہ ثانیہ سجادیہ میں چوتھے وصی امام علی بن الحسین السبط صلوات اللہ علیہما سے جناب آدم علیہ السلام پر صلوات بھیجنے کے بیان میں نقل کیا ہے۔ کہ حضرت نے فرمایا۔ فصل علیہ انت و ملئکتک و سکان سمواتک و ارضک۔ یعنی" اے پروردگار آدمؑ پر تو بھی رحمت نازل کر اور تیرے ملائکہ اور ساکنین سماوات و ارض بھی اُن کے لئے طلب رحمت کریں " ملائکہ پر عطف کرنا سکان سماوات کا بتا رہا ہے۔ کہ وہ ساکنین از قسم ملائکہ نہیں ہیں۔ بلکہ اُن سے الگ کسی نوع خاص کے ہیں۔ جن میں صلاحیت استغفار و رحمت کی ہے تو لامحالہ وہ ذی حیات از قبیل انسان ہی ہونگے +

(ساتویں) بحار الانوار مجلسی اور درمنثور سیوطی میں ابن عباس سے (ومن الارض مثلھن) کی تفسیر میں مروی ہے۔ کہ" سبع ارضین فی کل ارض نبی کنبیکم و آدم کآدمکم و نوح کنوحکم و ابراھیم کابراھیمکم و عیسی کعیسی" سات زمینیں ہیں۔ ہر زمین میں ایک نبی مثل تمہارے نبیؐ کے ہے۔ اور ایک آدمؑ مثل تمہارے آدمؑ کے ہے۔ اور ایک نوحؑ مثل تمہارے نوحؑ کے ہے۔ اور ابراہیمؑ مثل تمہارے ابراہیمؑ کے ہے۔ اور عیسٰیؑ مثل عیسٰیؑ کے ہے "

اس قسم کی حدیثوں سے ہم بہت سے اپنے شبہات کو دفع کر سکتے ہیں۔ مگر چونکہ اس کتاب کے عنوان سے وہ خارج ہیں۔ لہٰذا ہم نے اُنہیں دوسرے مقام پر بیان کیا ہے +

(آٹھویں) کتاب معجم البلدان۔ یاقوت حموی متوفی ۶۲۶ھ ہجری کی مسد کتاب میں عطاؑ بن یسار سے جو راوی مشہور ہے۔ اور کتاب دائرۃ المعارف میں بھی شیخ سراج الدین صاحب کتاب عجائب المخلوقات سے روایت کیا ہے۔ اس نے بھی عطا بن یسار سے روایت کی ہے۔ (عطاء تابعی ہے یعنی صحابی کے بعد دوسرے طبقے کا آدمی)۔ ومن الارض مثلھن کی تفسیر میں عطا کہتا ہے فی کل ارض آدم مثل آدمکم و نوح مثل نوحکم و ابراھیم مثل ابراہیم ہر زمین پر آدمؑ مثل تمہارے آدمؑ کے اور نوحؑ مثل تمہارے نوحؑ کے اور ابراہیمؑ مثل تمہارے

ابراہیمؑ کے ہیں"+

(نویں) سورۂ صافات کی تفسیر میں محدث جلیل قمی رحؒ نے اور بحار الانوار کی چودھویں جلد میں مجلسی رحؒ نے بسند صحیح جناب امیر المومنین علی علیہ السلام سے روایت کی ہے۔ آپ نے فرمایا۔

ھٰذِہِ النجوم التی فی السّماء مدائن مثل المدائن التی فی الارض مربوطۃ کل مدینۃ یعمود من نور طول ذالک العمود فی السّماء مسیرۃ مائتین وخمسین سنۃ۔ اس روایت کو شیخ فخرالدین الطریحی النجفی متوفی ۱۰۸۵ھ ہجری نے بھی اپنی کتاب مشہور مجمع البحرین میں لغۃ (کواکب) کے بیان میں مرسلاً جناب امیر المومنین علیہ السلام سے نقل کیا ہے۔ ایک دوسری روایت میں یعمود من نور بھی ہے+

بہرحال مطلب حدیث واضح ہے۔ یعنی تمہارے یہ سیارے سب کے سب ویسے ہی شہروں سے آباد ہیں۔ جیسے تمہاری زمین شہروں سے آباد ہیں۔ ہر شہر نور کے ایک عمود سے متعلق ہے جس کا طول ڈھائی سو برس کی راہ کا ہے۔ شہروں کا ہونا ان سیارات میں دلیل اس بات کی ہے۔ کہ ذوی العقول حیوانات ان میں بستے ہیں۔ جیسا کہ متاخرین نے بھی مریخ میں دیکھا ہے۔ جیسے ہم پہلے لکھ چکے ہیں+

اس روایت میں جو معصومؑ نے یہ فرمایا ہے۔ کہ وہ نور کے عمود سے بندھا ہوا ہے اس سے مقصود حضرتؑ کا بظاہر آفتاب کی جاذبیت کو دکھانا ہے۔ یعنی مقصود یہ ہے۔ کہ یہ سیارات بھی نظام شمسی میں داخل ہیں۔ اور اُسی کی روشنی مثل عمود کے ان سیارات پر پڑتی ہے۔ چنانچہ یہی رائے علمائے متاخرین کی بھی ہے۔ اور اگر دوسری روایت کی بنا پر دو عمود نور صحیح مانا جائے۔ تو اس سے مراد حضرتؑ کی یہاں پر وہ دو قوتیں ہونگی آفتاب کی۔ جس کو متاخرین حکمائے نے مانا ہے۔ کہ وہی نظام سیارات کے حافظ ہیں۔ اول آفتاب کی قوت جذب ہے۔ اور دوسری قوت آفتاب سے الگ رہنے کی بسبب حرکت دوری کے ہے۔ پس اگر صرف پہلی ہی قوت کام کرنے لگے اور دوسری قوت اس کا مقابلہ نہ کرے۔ تو تمام سیارات کرۂ آفتاب سے مل جائیں۔ اور اگر صرف دوسری قوت اپنا اثر کرے۔ اور پہلی قوت اس کا مقابلہ نہ کرے تو تمام سیارات نظام شمسی سے نکل کر فضائے وسیع میں چلے جائیں کیونکہ یہ تمام سیارات اپنی اپنی حدوں میں صرف اسی وجہ سے قائم ہیں۔ کہ یہ دو قوتیں جو مثل دو عمود کے ہیں۔ ان کو کھینچے ہوئے ہیں۔ ایک اس طرف سے اور ایک اس طرف سے+

(دسویں) کتاب بحار الانوار اور تفسیر مفاتیح الغیب فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ ہجری میں یہ روایت ہے کہ "رسول صلعم نے فرمایا۔ کہ جب مجھ کو معراج کے واسطے آسمان پر لے گئے۔ تو میں نے ساتویں آسمان میں ویسے ہی میدان دیکھے۔ جیسے تمہاری زمین پر ہیں"۔ اس حدیث سے بھی ظاہر ہے۔ کہ وہ کرے بھی مثل ہماری زمین کے میدان وغیرہ رکھتے ہیں۔ تاکہ وہ زندہ حیوانات جو وہاں رہتے ہیں۔ اُس میں چل پھر سکیں +

(گیارھویں) بحار الانوار اور تفسیر درمنثور میں بعض ائمہ کوفہ سے جس سے یہاں امام جعفر صادق علیہ السلام مراد ہیں جنہوں نے اپنے جد امجد رسول اللہ صلعم سے اُس سفید زمین کے شرح میں جو ہمارے مغرب کی پشت پر واقع ہے۔ فرمایا۔ کہ رسول اللہ صلعم نے اس کی نسبت ارشاد کیا ہے۔ کہ اُس زمین میں مخلوقات خدا میں سے ایک بڑی خلقت رہتی ہے۔ جنہوں نے کبھی خدا کی مخالفت نہیں کی کسی نے دریافت کیا۔ یا رسول اللہ صلعم۔ کیا وہ آدم کی اولاد میں سے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ کہ وہ تو یہ بھی نہیں جانتے۔ کہ آدم پیدا ہوئے یا نہیں۔ پھر سائل نے پوچھا کہ یا رسول اللہ صلعم۔ ابلیس کیا ہوا۔ آپ نے فرمایا۔ کہ انہیں ابلیس کی بھی خبر نہیں۔ کہ آیا پیدا ہوا ہے۔ یا نہیں۔ ہم نے اس روایت کو اس سے پہلے بھی بیان کیا ہے۔ ناظرین اس کی تفصیل وہاں دیکھ لیں +

(بارھویں) ابو لیث سمرقندی کی کتاب میں جس کا ایک پرانا نسخہ میرے پاس بھی موجود ہے۔ جناب رسالت مآب صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے۔ کہ "خدائے تعالےٰ نے ایک روشن زمین پیدا کی ہے۔ جو اس زمین سے تین گنا بڑی ہے۔ یہاں تک کہ آپ نے فرمایا۔ کہ اُس میں خلق خدا بھری ہوئی ہے۔ جنہیں یہ بھی نہیں معلوم ہے۔ کہ آیا خدا کی مخالفت کی جاتی ہے یا نہیں۔ الخ" +

(تیرھویں) تفسیر نیشاپوری میں من الارض مثلھن کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ کہ ان زمینوں میں سے ہر ایک زمین میں خلقت خدا رہتی ہے۔ اور لوگ یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ اُن میں آدمؑ اور حواؑ اور نوحؑ اور ابراہیمؑ موجود تھے یا ہیں اور وہ آسمان کو زمین کی طرف سے دیکھتے ہیں اور روشنی بھی پاتے ہیں۔ یا یہ کہ اُن کے لئے خود ایک ایسا نور پیدا کیا ہے۔ جس سے وہ فائدہ اُٹھاتے رہتے ہیں۔ سنقاشی نے بھی اپنی تفسیر میں ایک خاص فصل اس بارے میں لکھی ہے۔ کہ سماوات و ارضین کی مخلوقات کتنی ہیں اور ان کی شکلیں کتنی ہیں۔ اُن کے نام کیا

ہیں، مگر ہم ان روایات کے بیان بسبب غیر معتبر ہونے کے درج نہیں کرتے"

(مَیں کہتا ہوں) علماء کا ایسی حدیثوں کو نامعتبر سمجھنا اس وجہ سے نہیں تھا کہ ان کی سندوں میں کچھ خرابی ہے۔ بلکہ بہت سی حدیثیں اُس میں صحیح بھی ہیں۔ اور قوی بھی ہیں۔ لیکن چونکہ ایسے مضامین کو یہ لوگ عجیب و غریب اور فلسفہ قدیم کے قواعد کے خلاف سمجھتے تھے اس وجہ سے ان کو خیال ہُوا کہ شاید یہ بناوٹی ہوئی باتیں ہیں۔ حالانکہ در اصل فلسفہ قدیم ہی غلط تھا۔ اور یہ روایتیں صحیح ہیں۔ یہ ایک ایسا ناگوار امر تھا یعنی فلسفہ قدیم سے احادیث کا مخالف ہونا کہ جس کے سبب سے علماء اس قسم کی روایتوں کو نقل کرنے سے اپنے تئیں بچاتے تھے۔ تاکہ اُس زمانے کے عقلا کی نگاہوں میں دین اسلام میں وہن نہ ثابت ہو۔ البتہ ہمارے سچے حفاظ اور محدثین عام اُن چیزوں کو نقل کر گئے ہیں۔ جو اُن تک پہنچی ہیں۔ تاکہ اقوال شریعت قائم نہ ہوں۔ خدا سے ہم دعا کرتے ہیں۔ کہ وہ ایسے محدثین کو جزائے خیر دے۔ اور اُن کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ کہ انہی نے ہم پر اس زمانے میں یہ احسان کیا کہ آلات نجوم اور فن ہیئت کی ترقی کی بدولت اُن اقوال کے سمجھنے کا موقع دیا۔ جو فی الواقع حق اور صحیح تھے۔ اور جو بسبب ناواقفیت کے اس سے پہلے غلط سمجھے جاتے تھے۔ الحمد للہ کہ آج اُن اقوال کے ذریعہ سے اسلام کی سچائی ظاہر ہو رہی ہے۔ اور جدید فلسفہ قرآن و حدیث کا ترجمان بنا ہُوا ہے۔ اور ایک نہایت اچھی دوربین اس فلسفہ کی ہمارے ہاتھ لگی ہے۔ جو ہماری شریعت کے اسرار مخفیہ کو نہایت صحیح طور پر دکھلا رہی ہے۔

تیرھواں مسئلہ

شہاب و دُمدار ستاروں وغیرہ کا بیان

یہ تو ظاہر ہے۔ کہ دُمدار ستاروں اور ٹوٹنے والے ستاروں کی نسبت جو رائے قدماء فلاسفہ کی تھی۔ وہ اس زمانے کی بحث و تدقیق کے سبب بالکل بدل گئی۔ قدما خیال کرتے تھے کہ دُمدار ستارے اور رجوم (ٹوٹنے والے ستارے) منجملہ نجوم و فلکیات کے نہیں ہیں۔ بلکہ بسبب بخارات اور دھوئیں کے فضا میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر حال کے فلاسفروں کی یہ رائے ہے۔ کہ یہ کل سیارے از قسم نجوم فلکیہ کے

ہیں۔ اور وہی ان کا مادہ ہے۔ اگرچہ اس کی تحقیق شریعت کے ذمے پر نہیں ہے۔ مگر ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں بتائیں۔ کہ آیا بانی شریعت نے اِنکے متعلق کچھ ارشاد فرمایا ہے یا نہیں۔ اور آیا اُنکے اقوال فلسفہ قدیمہ کے مطابق ہیں یا جدیدہ کے۔ یا بالکل سکوت کیا ہے؟

الجواب

اس میں تو کسی کو بھی شک نہیں ہے۔ کہ رات کے جو شعلے فضائے آسمان میں ایک طرف سے دوسری طرف جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ محض خیالی چیز نہیں ہیں۔ بلکہ در اصل موجود چیز ہیں۔ البتہ حکمائے نے اس باب میں اختلاف کیا ہے۔ کہ کس مادے سے ان کی خلقت ہے۔ اور ان کا منشاء حدوث کیا ہے۔ اگلے فلاسفر مثل ارسطو وغیرہ اور بطلیموس و تابعین بطلیموس کے تو یہ کہتے تھے۔ کہ ایسا دھوآں جس میں دھنیت بھی ہو۔ جب زمین سے اوپر کی طرف جاتا ہے۔ اور کرۂ نار سے قریب ہوتا ہے۔ تو اُس میں آگ لگ جاتی ہے۔ اور وہ آگ ایک سرے سے دُوسرے تک جلاتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک لمبا فلیتہ جل اُٹھا۔ اگر وہ دھوآں بہت لطیف ہوتا ہے تب تو جلتے وقت دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن اگر کثیف ہوتا ہے۔ تو دکھائی دیتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ ایک مدت تک مختلف شکلوں میں باقی بھی رہتا ہے۔ جبکہ اس قدر مادہ اُس کا زیادہ ہو۔ کہ فوراً جل کر راکھ یا دھوآں نہ بن جائے سو کبھی دُمدار ستارے کی شکل میں اور کبھی ریشدار ستارے کی شکل میں۔ کبھی شاخدار۔ کبھی زلف دار۔ اور کبھی اژدہے کی صورت میں۔ کبھی گول اور کبھی مخروطی نظر آتا ہے۔ جب کبھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔ تو اُسکی روشنی زمین تک پہنچتی ہے۔ ان کو حادثات جو کہتے ہیں۔ ستارہ کہنا ان کو مجاز ہے نہ حقیقت کیونکہ فلاسفران سابق کے نزدیک فلکیات میں مبدء میل مستقیم نہیں ہے۔ اور یہ ستارے حرکت کے وقت مستقیم حرکت کرتے ہیں۔ نیز یہ کہ ان میں کون و فساد ہوتا ہے۔ اور اجرام فلکیہ کے واسطے کون و فساد نہیں ٭

اس رائے کا مخالف حکمائے سابق میں سوائے حکیم سنیکا رومانی کے کوئی نہیں ہوا۔ اُس کا البتہ یہ خیال تھا۔ کہ یہ دمدار ستارے وغیرہ از قسم نجوم فلکیہ ہیں۔ اسلامی محققین بھی مثل شیخ ابن سینا۔ امام رازی۔ محقق طوسی۔ جرجانی اور تفتازانی وغیرہ کے ارسطو ہی کی رائے کی موافقت کرتے رہے۔ اور اُنہیں کا کلمہ پڑھتے رہے ٭

ایک ہزار سن ہجری کے بعد جو یورپین حکما پیدا ہوئے۔ ان لوگوں نے تقلید کو چھوڑ کر خود تحقیق کرنی چاہی۔ چنانچہ آلات رصدیہ کو مکمل کرنے کے بعد بہت سے امور میں حکمائے سابقین سے مخالفت کی ہے۔ اب اس امر پر اتفاق ہے۔ کہ شہاب ثاقب اور دمدار ستارے بھی واقعی ستارے ہیں۔ دھوئیں یا بخارات سے نہیں پیدا ہوئے ہیں۔ بلکہ یہ بھی مثل دیگر سیاروں کے فضائے آسمان میں دورہ کرتے ہیں۔ (پہلے پہل) ان ستاروں کا بُعد مسٹر (جون مولر جرمن نے جس کا لقب ریجیو منٹانوس تھا پندرھویں صدی عیسوی میں دریافت کیا۔ تو ایک دمدار ستارے کے زاویہ کا بُعد (جو ۱۴۷۲ء میں ظاہر ہوا تھا) چھ درجہ کا پیمائش کیا + حدائق النجوم وغیرہ کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ پہلے پہل دُمدار ستاروں کا حال تیخو براہے ڈنمارکی نے دریافت کیا۔ کہ یہ فلک قمر سے خارج واقع ہوئے ہیں۔ مگر اسکی رائے تھی۔ کہ مدار ان کی مُستدیر ہیں۔ چند دنوں بعد اُس کے شاگرد اُستاد کپلر جرمن نے یہ رائے شائع کی (سنہ ۱۶۵۴ء میں)۔ کہ دمدار ستارے فضائے وسیع میں اُسی طرح چلتے ہیں جس طرح پانی میں چھوٹی بڑی مچھلیاں۔ رفتار ان کی ایک خط مستقیم پر ہے۔ کبھی تو بسبب بڑے ہونے یا قریب ہونے کے ہمیں محسوس ہوتے ہیں۔ اور کبھی بسبب دور ہونے یا چھوٹے ہونے کے دکھائی نہیں دیتے۔ پھر مسٹر ڈرفل اور سر اسحاق نیوٹن نے اپنی اپنی دلیلیں قائم کیں۔ کہ دمدار ستاروں کے مدار بیضوی ہیں۔ جس طرح سیارات کے مدار بیضوی ہیں۔ مگر ان میں اور دیگر سیارات میں چند فرق ہیں۔ (۱) یہ کہ سیارات آفتاب کے گرد گردش کرتے ہیں۔ اور آفتاب ان کے بیچ میں واقع ہوتا ہے۔ مگر دمدار ستارے اپنے اپنے مدار پر آفتاب سے الگ حرکت کرتے ہیں۔ جیسا کہ اکثر دیکھا گیا۔ (دیکھو نقشہ نمبر ۲) + (۲) یہ کہ مدار سیارات کے اصل القطر دوسرے قطر سے ایک ربع سے زیادہ چھوٹے نہیں ہوتے۔ مگر دمدار ستاروں کے مدار کا ایک قطر دوسرے قطر سے ربع سے بہت چھوٹا بھی ہوتا ہے + (۳) یہ کہ اجرام سیارات بالفعل جامد ہیں۔ بکھرے ہوئے نہیں ہیں۔ اور نہ پگھلے ہوئے۔ بارد ہیں بہت حار نہیں ہیں۔ بخلاف دمدار ستاروں کے کہ بالفعل بسبب شدت حرارت اور احتراق کے مشتعل ہو گئے ہیں۔ جن سے گیس اور دھوئیں اُٹھتے رہتے ہیں جو تقریباً ان ستاروں سے بارہ گنا اصل قطر کی نسبت اِدھر اُدھر بلند ہوتے ہیں۔ (یعنی جتنا بڑا ان سیاروں کا اصل قطر ہے۔ اُس سے چودہ گنا زیادہ)۔ استاد سر اسحاق نیوٹن نے دمدار

ستارے کی حرارت کا اندازہ ۱۶۸۰ء میں کسی سرخ کئے ہوئے لوہے کی حرارت سے دو ہزار گنا زیادہ بتایا تھا۔ تو ایسے گرم جسم کے سرد ہونے کے واسطے بھی ہزاروں ہی برس کا زمانہ صرف ہونا چاہئے ۔ اسی وجہ سے حدائق النجوم میں بعض فلاسفروں کا خیال لکھا ہے۔ کہ دمدار ستارے ہی گنہگاروں کے جہنم ہیں۔ (۴) یہ سیارات نظام شمسی کے ایک قرینے اور انتظام سے قائم ہیں۔ بعد بھی سب کا ایک دوسرے سے اس قدر ہے۔ کہ کوئی کسی کے مدار کو مس نہیں کرتا۔ لیکن دمدار ستاروں کے مدار غیر منتظم ہیں ۔اسی وجہ سے کبھی ایک دوسرے سے لڑ بھی جاتے ہیں۔ اور دوسرے سیارات کے مداروں کو قطع کر دیتے ہیں۔ مثلاً ایک دمدار ستارہ جب اوپر سے نیچے آنے لگتا ہے۔ تو نبتون کے مدار کو پھر اراتوس کے مدار کو پھر اُس کے بعد والے سیارے کے مدار کو کاٹتا ہوا اُترتا اور آفتاب کے گرد گھومتا رہتا ہے۔ پھر کبھی اُوپر کو چڑھ جاتا ہے۔ اور اُسی طرح مدارات سیارات کو قطع کرتا ہوا گزرتا ہے۔ یہ چوتھا فرق سابق کے تین فرقوں سے بہتر ہے۔ اسے جناب امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے بھی بیان فرمایا ہے۔ (دیکھو اسی مسئلہ کی آٹھویں دلیل) +

منشاء حدوث میں یہ اختلافات ہیں۔ (بعض کا) خیال ہے۔ کہ دمدار ستارے آفتاب کے بقیہ اجزاء ہیں۔ یعنی پہلے کوئی آفتاب تھا۔ جو اپنی مدت زندگی تمام کر کے پھٹ پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اور متفرق ہو کر دمدار ستاروں کی صورت میں آگیا ہے۔ (بعض کا) خیال ہے۔ کہ کسی سیارے کے بکھرے ہوئے اجزا ہیں۔ جو کسی وجہ سے کسی وقت لوٹ گیا ہو گا۔ (بعض کا) خیال ہے کہ مستقل اجرام ہیں۔ جو فضائے آسمان میں بنفسہٖ حرکت کرتے ہیں جس طرح دیگر سیارات۔ غایۃ الامر یہ کہ نظام میں ان دونوں کے فرق ہے۔ (بعض کا) خیال ہے۔ کہ یہ سب چاند ہیں۔ جو (نبتون) سے اس دوری کی نسبت دو ہزار گنا بعید واقع ہوئے ہیں۔ جو نبتون کو آفتاب سے ہے۔ اسی طرح اور بھی رائیں ہیں۔ مگر تیسرا قول زیادہ مشہور ہے۔ یعنی کہ دمدار ستارے در اصل روشن ستارے ہیں۔ جن کا جرم کوکبی جسے نواۃ المذنب (دمدار ستارے کا تخم یا گٹھلی) کہتے ہیں خود روشن ہے۔ جسے گیس کے بادل ہر وقت گھیرے رہتے ہیں۔ اور جو آفتاب کے قرب کی وجہ سے ان کے گرد پیدا ہوتے ہیں۔ اسی گیس کو لوگ دُم کہتے ہیں۔ کبھی اس کی شکل دُم کی سی ہوتی ہے۔ کبھی ڈاڑھی کی سی۔ کبھی زلف کی سی۔ اور کبھی دوسری صورت کی۔ جس جس طرح کا فاصلہ اور مقابلہ بہ نسبت آفتاب کے اسے حاصل ہوتا ہے۔ اُتنے

نمبر ۲ گیس اس میں روشن دکھائی دیتے ہیں۔ جو دیکھنے میں دم یا زلف معلوم ہوتی ہے۔
خلاصہ یہ کہ ان تمام مذنبات میں بھی قوت جذب و انجذاب ہے جس طرح دیگر سیارات میں ہے۔
اور اسی طرح متحرک ہیں۔ اس وقت تک (۱۲۰۰) دمدار ستارے مرصود ہو چکے ہیں جن کی حرکات
و مدارات کا انضباط با قاعدہ کر لیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے جب کسی دمدار ستارے کے نکلنے کا
اعلان اخباروں میں چھپتا ہے۔ تو صحیح پایا جاتا ہے۔ اور یہ کھٹکا ہمیشہ لگا رہتا ہے۔
کہ مبادا کوئی دمدار ستارہ اپنی رفتار میں زمین سے ٹھوکر نہ کھا جائے۔ ورنہ زمین یا زمین والوں کو
سخت صدمہ پہنچیگا +

یہ تو دمدار ستاروں کا حال بیان ہوا۔ اب شہب و نیازک کا بھی کچھ حال سن لیجئے۔
بعض کا خیال ہے۔ کہ یہ در اصل پتھر اور آگ کے بڑے بڑے ڈلے ہیں۔ جو چاند کے آتش خیز
پہاڑوں اور کھوؤں سے نکل کر اوپر گئے ہیں۔ بسبب حدت کے چاند کے حلقے سے نکل کر
زمین کے حلقے میں داخل ہو گئے ہیں۔ بعض کا خیال ہے۔ کہ کسی سیارہ شکستہ کے
شکستہ اجزا ہیں۔ کسی کا خیال ہے۔ کہ یہ بھی مثل دمدار ستاروں کے مستقل سیارات ہیں۔
البتہ اوصاف اور نظام میں ان سے مختلف ہیں۔ بعض کا خیال ہے۔ کہ دمدار ستاروں کے
شکستہ اجزا ہیں۔ کتاب آیات بینات میں لکھتے ہیں۔ اکثر حکماء کی رائے ہے۔ کہ شہب و
نیازک دمدار ستاروں کے اجزاء بلکہ ان کی دمیں ہیں جنہیں زمین نے قریب ہوتے
وقت اپنی طرف جذب کر لیا تھا۔ کتاب مقتطف کے صفحہ ۷۶ میں لکھتے ہیں۔ کہ جو پتھر آسمان
سے گرتے ہیں۔ وہ در اصل نیازک ہیں۔ جو آفتاب کے گرد پھرتے رہتے ہیں۔ کبھی زمین
کے قریب ہو جاتے ہیں۔ اور کبھی دور۔ اور جب کبھی آفتاب سے قریب ہو جاتے ہیں۔
تو اس کا سبب یہ ہے کہ آفتاب اپنی قوت جاذبہ سے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اکثر
ایسا ہوتا ہے کہ کہربائی مقامات کی طرف سے ہو کر گزرنے کے سبب ان مادوں میں جو
فضا میں پھرتے رہتے ہیں آگ لگ جاتی ہے۔ اور زمین پر بھی کبھی گر پڑتی ہے +

علیٰ ہذا القیاس مسٹر فاندیک اور سکیاپرلی نے ان کے بارے میں لکھا ہے۔ مسیو
بارفیل، نے سکیاپرلی کے اس قول کی تائید میں کہ دمدار ستارے سیارات کی تاثیر کی وجہ
سے جلد منحل ہو جاتے ہیں۔ جو اس کے قریب سے ہو کر گزرتے ہیں۔ اور ٹوٹ ٹوٹ کر
اس کا اصل جرم ہزاروں اجزاء میں منقسم ہو جاتا ہے۔ جو کبھی قریب رہتے ہیں۔

اور کبھی بہت دُور دُور چلے جاتے ہیں۔" لکھا ہے۔ کہ بیلا کا دمدار ستارہ اس مطلب پر گواہ ہے۔ جو ہمیشہ طالع رہتا ہے۔ کبھی اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس سے الگ ہو کر کئی کئی دمدار ستارے بن جاتے ہیں۔ اور کبھی شہاب ثاقب بن کر اسی خط پہ چلتے ہیں۔ جو مدار اصل دمدار ستارے کا ہے۔ یہ خط مذکور زمین کو کسی نقطے پہ ماہ تشرین ثانی میں قطع کرتا ہے۔ اسی وجہ سے اس مہینے میں بہت ستارے ٹوٹتے ہیں۔ اور یہ علامت اس بات کی ہے۔ کہ اس زمانے میں بیلا کے دمدار ستارے سے بہت سے اجزاء منفصل ہو کر شہاب ثاقب بن جاتے ہیں۔ لیکن ایسا بھی ہے۔ کہ بہت سے دمدار ستارے جو ہمیں ابھی دکھائی نہیں دیتے ہیں۔ ٹوٹ ٹوٹ کر شہاب ثاقب ہو جاتے ہیں۔ مسیو کلنڈرو فرانسوی منجم کا یہ خیال ہے۔ کہ جو دمدار ستارے شلجمی دائروں پر حرکت کرتے ہیں وہی بسہولت ٹوٹ کر رجوم اور شہب بن جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے بعض راتوں کو بکثرت تارے ٹوٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں +

جب ان اقوال کو آپ سن چکے۔ تو آیئے۔ آپ کو شریعت اسلامیہ کے بھی کچھ ارشادات سناؤں۔ کہ ایمان تازہ ہو۔ (اوّل) خدائے تعالےٰ کا یہ قول ہے۔ جو سورۂ صافات (آیت ۶) میں ہے۔ انا زینا السماء الدنیا بزینۃ الکواکب وحفظا من کل شیطان مارد لا یسمعون الی الملا الاعلی ویقذفون من کل جانب دحورا "ہم نے سماء دنیا کو ستاروں سے زینت دی۔ اور سرکش شیطان سے بچایا۔ اب وہ فرشتوں کی باتیں نہیں سن سکتے۔ بلکہ ہر طرف سے ذلیل کر کے پتھر مارے جاتے ہیں" اس آیت کا ظاہر سیاق یہی بتا رہا ہے۔ کہ جن ستاروں سے خدا تعالےٰ نے سماء دنیا کو زینت دی ہے۔ اُنہی کو رجوم شیاطین بھی بنایا ہے۔ جو لوگ اقوال شریعت کے سمجھنے سے مانوس ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں۔ کہ شیطان کو نیازک ہی سے مارا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ان نیازک کو "شہب" اور "رجوم" بھی کہتے ہیں۔ اور جب یہ دونوں مقدمے ثابت ہو گئے۔ یعنی کہ نیازک ہی رجوم ہیں۔ اور شیاطین کے رجوم وہی سیارے ہیں۔ جو سماء دُنیا کی زینت ہیں۔ تو نتیجہ یہ نکلا۔ کہ رجوم یعنی نیازک از قسم نجوم فلکیہ ہیں۔ ان کا اُن کا مادہ ایک ہی ہے۔ اور یہی رائے حکمائے حال کی ہے۔ وہو المطلوب +

(اگر) آپ یہ اعتراض کریں۔ کہ زینت کے ستارے تو نجوم ثوابت ہیں۔ اور رجوم شیاطین

نیازک ہیں۔ اِن میں اُن میں بڑا فرق ہے۔ (توہم) جواب دینگے۔ کہ یہی اعتقاد تو اس وقت تک لوگوں کو راہ سے بھٹکائے ہوئے تھا۔ کہ نجوم کا لفظ سوائے اجرام فلکیہ کے اور کسی کو نہیں کہا جاسکتا۔ حالانکہ فے الواقع یہ بات غلط تھی۔ بلکہ ہر فلکی جرم کو جو مثل دیگر سیارات کے مدارو حرارت والے ہوں۔ نجوم اور کواکب کہینگے۔ تاکہ وہ خرابی اور اعتراض نہ لازم آئے۔ جو حکمائے سابقین کے خیال بموجب آیت قرآن پر پڑتا ہے۔ کیونکہ اُن کا تو یہ خیال ہے۔ کہ تمام نجوم ثوابت آٹھویں آسمان پر ہیں۔ اور خدائے تعالےٰ فرماتا ہے۔ کہ "ہم نے پہلے آسمان کو اُن کواکب سے زینت دی"۔ یہ کیا معنی۔ ستارے تو آٹھویں پر ہوں۔ اور زینت بنیں پہلے کی۔ لہٰذا ماننا پڑیگا۔ کہ یہ رائے غلط ہے۔ حکمائے حال ہی کی رائے صحیح ہے۔ کہ یہ کواکب رجوم سماء دنیا میں ہیں۔ اور وہیں سے ٹوٹتے بھی ہیں۔ وہیں روشن بھی رہتے ہیں۔ (البتہ) آپ یہ اعتراض کرسکتے ہیں۔ کہ زینت کے واسطے چاہیئے۔ کہ کوئی قائم چیز ہو۔ اور یہ نیازک زینت نہیں بن سکتے۔ کیونکہ ان کو ثبات و قیام نہیں۔ ادھر سے جلے۔ اُدھر ختم ہوگئے (لیکن ہم) یہ جواب دینگے۔ کہ زینت اس صورت میں اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ کیا آپ کو آتشبازی چھوٹتے میں زیادہ تفریح اور دلچسپی ہوتی ہے۔ یا صرف گڑی ہوئی لالٹین دیکھ کر؟ زیادہ کیفیت تو اسی میں آتی ہے۔ کہ اِدھر سے ایک ستارہ ٹوٹا۔ اُدھر سے دُوسرا۔ ادھر سے تیسرا۔ گویا آتشبازی چھوٹ رہی ہے۔ اسی وجہ سے ایرانی لوگ اس حالت کی تعبیر اس طرح کرتے ہیں۔ ع

چراغبانی جہانی و آتشبازی آسمانی

رہا سماء دنیا کا معاملہ۔ اُسے ہم آئندہ تحقیق سے بیان کرینگے +

(دوم) (آیت ۱۱ سورہ ۴۱ فصلت) ۔ وزیّنا السّماء الدنیا بمصابیح وحفظاً ذٰلک تقدیر العزیز العلیم۔ "ہم نے زینت دی سماء دنیا کو چراغوں (ستاروں) سے۔ اور حفاظت کی ہم نے اُن کی اچھی طرح۔ یہ ہے خدائے غالب دانا کی تقدیر"۔ حفظاً کا فعل محذوف ہے۔ یعنی "حفظنا ہا بہا حفظاً"۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ ستارے جو زینت کے لئے بنائے گئے ہیں۔ اُنہیں سے حفاظت کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے۔ شہب و رجوم ستاروں سے الگ نہیں ہیں +

(سوم) آیت ۵ سورۂ ملک ۶۷ - وَلَقد زینّا السّماء الدنیا بمصابیح وجعلنٰھا رجوماً للشیاطین - اِس آیت میں بھی جن ستاروں کو زینت بنایا ہے - انہیں کو رجوم شیاطین بھی بتایا ہے - سماء دنیا سے مراد کرۂ بخاریہ ہے - جس میں ان شہب و رجوم کی زینت معلوم ہوتی ہے - جیسا کہ ہم نے پانچویں مسئلے میں اس مطلب کو بتوضیح لکھا ہے - یہی رائے حکمائے حال کی بھی ہے - کہ رجوم و شہب کی شعاع آنکھوں کو اُس وقت تک نہیں معلوم ہوتی جب تک کرہ بخاریہ سے ہو کر ان کا مرور نہ ہو +

(چہارم) کتاب بحار الانوار کے باب البلدان میں بضمن سوالات عبد اللہ بن سلام یہودی بیان کیا ہے - کہ اُس نے رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ بھی دریافت کیا تھا کہ نجوم کی کے قسمیں ہیں - تو آپ نے فرمایا "تین قسمیں ہیں - ایک قسم کے وہ ستارے ہیں - جو ارکان عرش پر ہیں - جن کی ضو ساتویں آسمان تک آتی ہے - دوسری قسم کے وہ ستارے ہیں - جو سماء دنیا پر ہیں - جیسے قندیلیں لٹکی ہوتی ہیں - یہ ستارے سکان سماء دنیا کی زینت کا کام بھی دیتے ہیں - اور شیاطین کو بھی اپنے شرر سے مار کر ہٹاتے ہیں - تیسری قسم کے وہ ستارے ہیں - جو فضا میں معلّق ہیں - آسمانی دریاؤں اور ما فیہا و ما علیہا کو روشنی پہنچاتے ہیں "- اللہ اکبر" - یہ حدیث کس قدر فلسفہ قدیمہ سے مخالف اور فلسفہ جدیدہ سے موافق ہے - ظاہر روایت تین قسم کے نجوم کو بتاتی ہے - ایک وہ ستارے ہیں - جو ہمارے نظام شمسی سے خارج ہیں - اور عرش کے ارکان پر ہیں جس سے مراد وہ محدّد نظام عالم کون ہے - جس کے ماتحت تمام نظامات شمسیہ ہیں خواہ ہمارا نظام شمسی ہو - یا کوئی اور - کیونکہ شریعت نے عرش کا لفظ اکثر محدد اعلےٰ پر اطلاق کیا ہے - جس میں کل نظامات داخل ہیں - اور کرسی کا اطلاق محدد نظام شمسی پر - پس کرسی تو صرف ہمارے عالم کے سماوات و ارضین کو محیط ہے - اور عرش ان سماوات و ارضین کو بھی - اور ان کے علاوہ جو آفتاب اور اُن کے نظامات ہیں انہیں بھی - (ارکان عرش) سے مراد یہ ہے - کہ ہمارے عالم کے نظام سے خارج اور بواطن عرش میں داخل ہیں -

(یصل ضوئھا الی السماء السابعۃ) جن کی روشنی ساتویں آسمان پر پڑتی ہے - سے مراد یہ ہے - کہ اُن کواکب کی پوری روشنی یا مطلق روشنی ہماری زمین پر نہیں پڑتی - اگرچہ ہم آنکھوں سے بذریعہ دوربینوں کے اُن کو دیکھتے ہیں - ہاں اگر ساتویں آسمان یعنی کرۂ زحل پر چلے

جائیں۔ تو اُن ستاروں کی چھوٹ ہم پر بھی پڑیگی +

دوسری قسم کے وہ ستارے ہیں۔ جو نجوم شہب اور نیازک ہیں۔ جو ہمیں نیچے والے آسمان میں دکھائی دیتے ہیں۔ جو مثل قندیلوں کے اس کرۂ بخاریہ میں معلق ہیں۔ اور صرف سکان سماء دنیا یعنی اہل زمین اور مخلوقات فضا کو روشنی پہنچاتے ہیں +

تیسری قسم کے وہ ستارے بتائے ہیں۔ جو گزشتہ دونوں قسموں کے ستاروں سے ممتاز اور علیحدہ ہیں۔ یعنی مادہ کو کیفیت میں تو یکساں ہیں۔ مگر اوصاف میں الگ ہیں یعنی کرۂ ہواء میں معلق یا معلّق ہیں۔ اگر بتشدید یہ لام پڑھئے۔ تو یہ معنی ہونگے۔ کہ فضا میں لٹکے ہوئے ہیں۔ اگر بتخفیف لام پڑھئے۔ تو معنی ہونگے۔ کہ روشن ہیں۔ اس سے بالکل مذہب قدماء باطل ہوتا ہے۔ جو کہتے تھے۔ کہ کوئی ستارہ ہوا میں معلق نہیں ہے۔ بلکہ سب کے سب موٹے موٹے آسمانوں میں جڑے ہوئے ہیں +

(پنجم) جناب امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا ارشاد ہے ایک طولانی حدیث میں۔ جو بحار الانوار کی چودھویں جلد میں مروی ہے۔ اور نیز تفسیر فرات میں جس میں ایک جملہ یہ بھی ہے۔ وجعل فی کل سماء شہبا معلقۃ۔ ہر آسمان میں کچھ روشن یا معلّق شہاب ہیں۔ یعنی ہر زمین کے آسمان میں (جو اس کا محیط کرۂ بخاریہ ہے) شہب ہیں۔ جس سے صاف ثابت ہے۔ کہ ان شہابوں کے واسطے بھی ایک ایک آسمان ہے۔ جس میں وہ مچھلیوں کی طرح چلتے ہیں۔ جیسا کہ متاخرین حکمائے یورپ کی رائے ہے +

(ششم) بعض روایات بحار اور تفسیر در منثور میں ہے۔ ان القمر والنجوم والرجوم فوق السماء الدنیا۔ چاند ستارے اور ٹوٹنے والے ستارے سب کے سب سماء دنیا پر ہیں۔" قدماء تو کہتے تھے۔ کہ "سماء دنیا پر صرف چاند ہے۔ اور نجوم اُس سے بہت بلند واقع ہوئے ہیں۔ رجوم بالکل نیچے اور اس فضا میں ہیں۔" حدیث مذکور بالکل اس کے خلاف بیان کرتی ہے۔ کہ "یہ سب سماء دنیا پر ہیں۔" البتہ فلسفہ جدیدہ کی بنا پر اس کے معنی واضح ہیں۔ کیونکہ متاخرین کے نزدیک تمام ٹوٹنے والے تارے ہمارے کرۂ بخاریہ سے اوپر متحرک ہیں۔ جب اُس کو شق کر کے نیچے آتے ہیں اُس وقت اُن کی روشنی ہمیں محسوس ہوتی ہے۔ ورنہ اس سے پہلے ان کا محل سماء دنیا یعنی

کرۂ بخاریہ سے اوپر ہے ◆

(ہفتم) جناب علی بن طاؤس کی کتاب النجوم میں مسنداً امام دوم جناب امام حسن سبط اکبر علیہ السلام سے مروی ہے۔ کہ آپ نے اپنے ایک خطبہ میں نجوم کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ ثم اجری فی السماء مصابیح ضوئھا فی مفتحھا وجعل شھابھا من نجومھا الدراری المضیئۃ۔ اس حدیث کا ظاہر بھی اسی مطلب کو بتاتا ہے کہ شہب کوئی علیحدہ چیز نجوم سے نہیں ہیں۔ بلکہ وہ بھی نجوم ہی ہیں۔ اس میں ایک امر اور زائد ہے۔ وہ یہ کہ حدیث مذکور (سکیاپرلی وغیرہ) کی رائے کی تائید کرتی ہے جن کا خیال ہے۔ کہ شہب نیازک ٹوٹے ہوئے ومدار ستاروں کے اجزاء ہیں۔ تفصیل اس مطلب کی یہ ہے۔ کہ آپ نے اپنے اس کلام میں فرمایا ہے۔ المصابیح التی ضوئھا فی مفتحھا۔ یعنی وہ ایسے چراغ ہیں۔ جن کی ضوء اُن کی مبدء اور شروع میں قرار دی گئی ہے۔ اور ظاہر ہے۔ کہ ایسے چراغ سوائے ومدار ستاروں کے اور کوئی نہیں۔ کیونکہ یہی مثل ایک لمبے فتیلے کے ہیں۔ جن کی ضیاء کا مبدء اُن کا سرے کا حصہ ہے۔ جسے ذواۃ المذنب کہتے ہیں ◆

"جعل شھابھا من نجومھا الدراری" کا مطلب یہ ہے۔ کہ آسمانی شہابوں کو خدا تعالے نے ان ہی چراغوں کے ستارے سے بنایا ہے۔ گویا ومدار ستارہ ایک طولانی چراغ ہے۔ یعنی فتیلہ ہے۔ اور جس کا ایک سرا ہے۔ یعنی اُس کی اصل۔ اور جس کی دم ایک ہے۔ یعنی وہ بخارات جو اُس سے متصل ہیں ◆

(ہشتم) کتاب العلل ابن بابویہ علیہ الرحمہ اور بحار جلد ۱۴ اور تفسیر برہان۔ اور انوار نعمانیہ سید جزائری میں مسنداً امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ہے۔ کہ کسی نے آپ سے پوچھا "طارق" کیا چیز ہے۔ جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ ھو احسن نجم فی السماء ولیس یعرفہ الناس وانما سمی طارقا لانہ یطرق نورہ سماء سماء الی سبع سماوات ثم یطرق راجعا حتی یرجع الی مکانہ۔ یہ ایک نہایت خوبصورت ستارہ ہے۔ جسے عام لوگ نہیں جانتے۔ اس کو طارق اس وجہ سے کہتے ہیں۔ کہ اس کا نور آسمان آسمان کرکے ساتویں آسمان کو طے کر جاتا ہے۔ پھر وہاں سے درجہ بدرجہ نیچے کو اترتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی جگہ پر واپس آتا ہے۔ ایک دوسرے نسخہ میں "ثم یطرق سماء سماء راجعا" ہے۔ یہ حدیث بظاہر کسی مذنب ستارے کی تعریف کر رہی ہے۔

جس کی کئی وجہیں ہیں۔ (۱) تو یہ کہ آپ نے فرمایا ۔ حسن نجم فی السماء ۔ اگر اس سے مراد دیگر ثوابت و سیارستارے ہوتے ۔ تو ان میں تمائز شکل و صورت کا کہاں ہے ۔ وہ سب تو ایک ہی طرح کے ہیں ۔ پھر احسن نجم کہنا کیا معنی ۔ فرق تو اسی دمدار ستارے میں ہے ۔ کہ اس کی شکل و صورت ان ستاروں سے بالکل علیحدہ ہے ۔ اور ہیئت و ساخت بھی عجیب ہے ۔ مثلاً یا تو آپ دمدار ہیں ۔ یا زلفوں دار ہیں ۔ یا صاحب ریش دراز ۔ بہرصورت ان سیارات و ثوابت سے خوش منظر بحیثیت شکل کے ضرور ہے ۔ لہٰذا اقرب یہ ہے ۔ کہ اس کلام میں دمدار ستارہ مراد ہو ۔ بعض صاحبوں نے "طارق" کی تفسیر "زحل" کی ہے ۔ حالانکہ وہ کوئی بڑا خوش منظر ستارہ نہیں ہے ۔ اور کلام معصوم بتاتا ہے ۔ وہ ستارہ خوش ہیئت اور خوش منظر ہے + (۲) طارق نام ہونا ہی دمدار ستارہ کو بتاتا ہے ۔ کیونکہ طارق اس کو کہتے ہیں ۔ جو رات کو یک بیک آوے ۔ اور دروازہ کھٹکھٹاوے ۔ اور یہ شان دمدار ستارے ہی کی ہے ۔ کہ ابھی تو مخفی ہے ۔ اور تھوڑی دیر بعد سماوات کو شق کرتے ہوئے نیچے اتر آیا ۔ اور دکھائی دینے لگا + (۳) آپ کا یہ ارشاد کہ "لیس یعرفہ الناس" یہ شان بھی مذنب ہی کی ہے ۔ کہ لوگ اس کو نجم سماوی نہ جانتے تھے ۔ بلکہ اور کیا کیا باتیں اس کی نسبت بتاتے تھے ۔ جیسا کہ سابق میں بیان ہوا ۔ یہاں تک تیخوبراہے نے ایک ہزار سن ہجری کے بعد اس کی حقیقت پر متفطن ہو کر برہان قائم کی ۔ کہ یہ بھی نجم سماوی ہے + (۴) حضرت کا یہ ارشاد کہ یطرق سماء سماء الخ یہ صفت بھی مخصوص دمدار ستارے کی ہے ۔ کہ کبھی یہ اوپر کو چڑھ جاتا ہے ۔ اور کبھی نیچے اتر آتا ہے ۔ جیسا کہ ہم نے اس مسئلہ کے شروع میں چوتھے فرق میں بیان کیا ہے ۔ (دیکھو نقشہ نمبر ۲) معلوم ہوگا ۔ کہ دمدار ستارہ اوپر سے آسمانوں کو شگافتہ کرتا ہوا نیچے اترا ۔ آفتاب کے گرد دورہ کیا ۔ اور پھر وہیں واپس گیا ۔ جہاں سے آیا تھا ۔ طرق نور سے خود اس ستارے کا اوپر جانا اور نیچے آنا مراد ہے ۔ ورنہ مطلق نور تو ہر ستارہ کا چاروں طرف خود ہی پھیلا رہتا ہے ۔ درجہ بدرجہ چڑھنا اور جہ بجہ اترنا کیا معنی رکھتا ہے ۔ یہ صفت تو خاص مذنب کی ہے +

یہ حدیث بھی ایسی ہے جس پر تھوڑے غور کے بعد آدمی حکم لگا سکتا ہے ۔ کہ کس قدر فلسفہ جدیدہ کی رفتار اس وقت صحیح ہے ۔ اور شریعت اسلامیہ کہیں اس سے زیادہ مکمل اور ان خیالات کے شائع کرنے میں مقدم ہے ۔ یا ایہا الناس سمجھو اور اسلامی

شریعت کی قدر کرو۔ کہ کیسی کامل اور کس قدر سچی شریعت ہے۔ دور و دراز راہوں کو چھوڑ دو اور اس کے دروازے پر خیمہ گاڑو۔ والسلام +

چودھواں مسئلہ

تعدد عوالم و نظامات

آج کل کے حکماء ایک نئی بات کر رہے ہیں۔ جو بظاہر عجیب معلوم ہوتی ہے۔ کہ تمام ثوابت ستارے مستقل اور بڑے بڑے آفتاب ہیں جن کے گرد اور بہت سے سیارے گردش کرتے ہیں جو ہمارے نظام شمسی کی بہ نسبت بہت زیادہ ہیں۔ اور اُن سب میں حیوانات اور نباتات وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ اب بتائیے۔ کہ آپ کی شریعت اسلامیہ اس بارے میں کیا کہتی ہے۔ موافقت کرتی ہے یا مخالفت۔ یا بالکل سکوت کرتی ہے؟

الجواب

اس سے پہلے ہم نے کئی جگہ اس بات کو ظاہر کر دیا ہے۔ کہ قدماء فلاسفہ کی رائے تو یہی ہے۔ کہ عالم جسمانی ایک کرۂ واحدہ ہے۔ جو تہ بہ تہ تیرہ کروں سے مثل پیاز کے چھلکوں کے مرکب ہے۔ جس میں سے نو تو آسمان ہیں۔ اور چار عناصر کے طبقے ہیں۔ اور زمین مثل مرکز کے ہے۔ جس کے گرد یہ نو آسمان گردش کرتے ہیں۔ مگر ہیئت جدیدہ کے حکماء نے اس رائے سے مخالفت کی ہے۔ اور قائل ہوئے ہیں۔ کہ ہمارے آفتاب کے سیارے اور چاند سب کے سب آفتاب سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ اور یہ کہ ہمارا عالم شمسی جس مدار سے محصور ہے۔ اُس کی مقدار تین ہزار پانچ سو ملین فرسخ ہے۔ اسی وجہ سے کرۂ نبتون تک جا کر آفتاب ایسا دکھائی دیتا ہے۔ جیسے چھوٹا ستارہ۔ اس بنا پر جو ستارے نبتون سے بھی آگے ہیں۔ وہ آفتاب سے ہرگز روشنی حاصل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ نہایت بُعد پر واقع ہوتے ہیں۔ دیکھو کہ بعض دمدار ستارے جو آفتاب سے بہ نسبت نبتون کے بارہ درجے اور دور واقع ہوتے ہیں۔ باوجود اس کے آفتاب ہی کی طرف اُن کی کشش ہے۔ اور کوئی دوسرا ستارہ اس کو اپنی طرف نہیں کھینچتا جس سے

معلوم ہوتا ہے۔ کہ تمام وہ ثوابت آفتاب سے بہت ہی دور ہیں مسٹر فانڈیک نے
کتاب ارواء الظماء میں لکھا ہے کہ قریب سے قریب جو ثابت ستارہ ہمارے
نظام شمسی سے واقع ہوتا ہے۔ وہ بھی بنسبت اُس بُعد کے جو ہم کو آفتاب سے حاصل
ہے۔ نو لاکھ درجے آفتاب سے دور ہے۔ نیز اخبار الہلال مصری کے صفحہ ۸۷ سنہ
۱۹۰۹ء میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ قریب سے قریب ثابت ستارہ ہماری زمین سے
(دلفا) ہے جس کا بُعد ہم سے (۲۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰) میل ہے یعنی بیس ملین
میل۔ اور اُس کی روشنی ہم تک تین برس میں آتی ہے۔ حالانکہ نور کی رفتار فی سکنڈ
ایک لاکھ نوے ہزار میل ہے" تو اب بتائیے کہ جس ستارے کی روشنی ہم تک سو برس
یا ایک ہزار برس میں آتی ہے۔ وہ ہم سے اور آفتاب سے کتنا دور ہوگا۔ اسی کتاب
ارواء الظماء میں مذکور ہے۔ کہ جو ستارہ سولہ درجہ پر ہے۔ وہ ہم سے تین سو ترلیٹھ درجے
بہ نسبت ستارہ شعری کے دور ہے۔ اور اُس کی روشنی ہم تک پانچ ہزار برس میں
آتی ہے۔ تو اب بتائیے۔ کہ جو ستارہ اٹھائیس درجہ پر ہوگا۔ اُس کی روشنی ہم تک ہزار
برس میں آویگی۔ اور وہ آفتاب سے کتنا دور ہوگا۔ لہذا ہم کو ماننا پڑیگا کہ ستارے یا ثوابت
تک آفتاب کی روشنی نہیں جاتی۔ بلکہ روشنی نیچے ہی نیچے ختم ہو جاتی ہے۔ اور اس بنا پر
کہنا پڑیگا۔ کہ وہ ستارے خود سے روشن ہیں۔ اور عالم شمسی سے بالکل باہر ہیں پھر
اس سے یہی نتیجہ نکلیگا۔ کہ وہ بجائے خود آفتاب ہیں۔ جن میں کا چھوٹے سے چھوٹا
بھی ہمارے اس آفتاب سے ہزاروں درجے بڑا ہے۔ اور اس بات کے ثابت کرنے
کے لئے ہم یہ کہتے ہیں۔ کہ جب نبتون کے پاس جانے سے آفتاب مثل چھوٹے ستارے
کے دکھائی دیتا ہے۔ تو دلفا کے پاس جانے سے کتنا بڑا دکھائی دیگا۔ اب دیکھئے
کہ دلفا کا نور ہم تک تین برس میں پہنچتا ہے۔ اور شعری کا نور بیس برس میں۔ باوجود
اس کے یہ سب ستارے ہم کو اچھی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ جس سے ہم کو یقین ہوتا ہے۔
کہ شعری اور شعری کے ساتھ والے ستارے بالضرور آفتاب سے بڑے ہیں۔
بالجملہ آج کل یہ بات حد تحقیق کو پہنچی ہوئی ہے۔ کہ یہ تمام ثوابت بجائے خود آفتاب
ہیں۔ اور ہمارا یہ آفتاب بھی مثل اُن ثوابت کے ایک ثابت ستارہ ہے۔ جیسا کہ
تصریح اس کی کتاب النقش سے الحجر اور کتاب مداشۃ المعاشۃ میں مفصل مذکور ہے۔

اور یہ بھی تسلیم ہو گیا ہے کہ ان ستاروں میں حیوانات اور نباتات اور جمادات بلکہ کل اسباب زندگی کامل طور پر موجود ہیں۔ لہذا ان سب کو بجائے خود علیحدہ علیحدہ ایک نظام ماننا پڑیگا جن میں سے ایک ہمارا نظام شمسی بھی ہے۔

اب شریعت اسلامیہ کو دیکھئے۔ اور اس کے مقالات کو غور کیجئے۔ وہ آپ کو بصراحت بتا دینگے۔ کہ عالم ایجاد ایک ہی عالم میں منحصر نہیں ہے۔ بلکہ خدا تعالے نے اپنے فیض کامل سے بہت سے آفتاب اور بہت سے عالم پیدا کئے ہیں۔ کہ نہ ان کو ہمارا علم ہے اور نہ ہمیں ان کا۔ کیونکہ اس وقت تک کوئی ذریعہ روابط پیدا کرنے کا ہمارے اور ان کے درمیان نہیں ملا ہے منجملہ ان مقالات کے۔

پہلا مقالہ شریعت

وہ ہے۔ جسے ہم نے کتاب خصال اور کتاب بحار اور کتاب منتخب البصائر اور کتاب مختصر البصائر اور انوار نعمانیہ اور شرح صحیفہ کاملہ اور تفسیر نور الثقلین وغیرہ میں دیکھا ہے۔ جو سب کی سب قدمائے علمائے امامیہ کی تصنیف سے ہیں۔ بڑی قوی سندوں سے جن میں جناب امام صادق علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے جس کا حاصل ترجمہ یہ ہے۔ "کہ خدائے تعالے نے بارہ ہزار عالم پیدا کئے ہیں۔ ہر ایک ان میں سے ساتوں آسمان اور ساتوں زمینوں سے بڑا ہے۔ جن میں ہر عالم والے اس بات کی خبر نہیں رکھتے۔ کہ خدا نے ان کے سوا کسی کو پیدا کیا ہے یا نہیں۔" اس حدیث کا مفاد حکمائے حال کی رائے سے بالکل مطابق ہے۔ جو اس بات کے قائل ہیں۔ کہ عالم ایجاد ہزار ہا عالموں سے مرکب ہے۔ اور ہر عالم کے آسمان و زمین ہمارے عالم کے آسمان و زمین سے بہت زیادہ بڑے ہیں۔ نیز حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے۔ کہ اس عالم کے رہنے والے صاحبان عقل ہیں۔ جیسا کہ لفظ من اس بات کو ظاہر کرتا ہے۔

دوسرا مقالہ شریعت

کتاب احتجاج۔ اختصاص منتخب الاختصاص۔ بحار اور بصائر الدرجات میں

ان اللہ عزوجل خلق اثنی عشر الف عالم کل عالم منہم اکبر من سبع سماوات و سبع ارضین ما یری عالم منہم ان للہ عزوجل عالماً غیرہم

بسند صحیح جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے۔ کہ آپ نے ایک یمنی منجم سے فرمایا "میں ایک گھنٹہ میں بقدر آفتاب کے ایک سال چلنے کے سیر کرتا ہوں۔ اور بارہ ہزار عالموں کو مثل تمہارے عالم کے طے کر جاتا ہوں جو یہ بھی نہیں جانتے۔ کہ آدمؑ اور ابلیس پیدا بھی کئے گئے ہیں یا کہ نہیں" اس روایت میں جو اپنی رفتار کو حضرتؑ نے فرمایا ہے ممکن ہے۔ کہ رُوحانی رفتار مراد ہو۔ جس سے یہ مطلب ہوگا۔ کہ میں یہیں بیٹھے بیٹھے ایک گھنٹہ میں بارہ عالموں کا حال دریافت کر لیتا ہوں۔ اور آفتاب کے ایک سال کی رفتار سے مراد وہ رفتار ہو۔ جو شمس تمام اپنے سیاروں کے بحرکت انتقالیہ ایک مرکز مجہول کے گرد گردش کرتا ہے۔ جیسا کہ حکمائے حال کی رائے ہے +

تیسرا مقالہ شریعت

بحار شرح صحیفہ۔ بصائر الدرجات اور منتخب لاختصاص میں سنداً چوتھے امام جناب علی ابن حسین علیہ السلام سے مروی ہے۔ کہ میں نے ایک منجم سے فرمایا۔ "کیا میں تجھے ایک ایسے شخص کو بتاؤں جو تیرے یہاں آنے کے وقت سے لیکر اس وقت تک چودہ عالموں کی سیر کر آیا جس میں سے ہر ایک دنیا سے تین درجے بڑا ہے۔ اور پھر اپنی جگہ سے اُس نے حرکت بھی نہیں کی۔ اُس نے کہا۔ وہ کون ہے؟ فرمایا میں" +

(میں کہتا ہوں) دُنیا کا لفظ کبھی تو ہماری اس زمین پر بولا جاتا ہے۔ اور کبھی ہمارے اس پورے عالم پر۔ سو دونوں لحاظ سے یہ حدیث بتا رہی ہے۔ کہ بہت سے وسیع عالم ہمارے اس عالم سے علیحدہ بھی واقع ہیں۔ کیونکہ بارہ اور چودہ کا لفظ کثرت کے معنی بتاتا ہے جس سے کوئی تحقیق عددی بظاہر مقصود نہیں ہوتی۔ حضرتؑ نے جو یہ فرمایا ہے۔ کہ اُس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ اس کا مطلب سیر معنوی اور سفر روحانی ہے۔ نہ سیر جسمانی جیسا کہ ہم نے اوپر والے مقالہ میں اشارہ کیا ہے +

چوتھا مقالہ شریعت

تفسیر قمی اور بحار میں سنداً ابن عباسؓ سے مروی ہے ربّ العالمین کی تفسیر میں

کہ "خدائے تعالٰے نے تین سو سے کچھ اوپر عالم پیدا کئے ہیں۔ قاف سے پیچھے اور ساتوں دریاؤں سے اُس طرف۔ جہاں کے باشندوں نے ذرا بھی خدا کی معصیت نہیں کی۔ اور نہ اُنہیں یہ معلوم ہے۔ کہ آدمؑ یا اولاد آدمؑ کون ہیں۔ اُن کا شمار بھی تین سو تیرہ گنا آدمؑ و اولاد آدمؑ سے زیادہ ہے" +

مسئلۂ تعدد ارضین میں ہم نے بیان کر دیا ہے۔ کہ "قاف" سے مراد زمین کا مخروطی ظل ہے۔ جو ظل شمس کے پیچھے پیچھے حادث ہوتا ہے۔ اور یہ بھی بیان کر دیا ہے۔ کہ سات دریاؤں سے مراد وہ سات مجاری سیارات ہیں۔ جن میں سیارات کی حرکت واقع ہوتی ہے۔ اور جن میں مادہ ایتھر بھرا ہوا ہے۔ جو مثل دریا کے موج زن اور روان ہے۔ اور یہ سیارات اُن میں مثل مچھلیوں کے چلتے ہیں۔ اس مطلب کی تفصیل وہاں ملاحظہ فرمائیے۔ تاکہ یقین ہو جائے۔ کہ ان عوالم سے مراد وہ عوالم ہیں۔ جو ہمارے نظام شمسی سے خارج ہیں۔ اس حدیث کا یہ فقرہ کہ "ہر عالم کی تعداد تین سو تیرہ گنا آدمؑ و اولاد آدمؑ سے زیادہ ہے" بتا رہا ہے کہ وہاں کے باشندے ہمارے آدمؑ کی نسل سے نہیں ہیں۔ بلکہ اُن کے آدم اور ہی ہیں۔ جس سے یقیناً اُن کا ہمارے عالم سے خارج ہونا پایا جاتا ہے۔ اس کی تائید میں اور بہت روایتیں ہیں۔ جو بتاتی ہیں۔ کہ بیشمار آدم گذرے ہیں۔ اور بیشمار بنی آدم +

پانچواں مقالہ شریعت

بحار شرح صحیفہ کاملہ ملا نعمت اللہ الجزائری اور کتاب مختصر شیخ حسن بن سلیمان میں سنداً آٹھویں امامؑ سے مروی ہے۔ (امام علی الرضا علیہ السلام نے) فرمایا "خدا تعالےٰ نے اس نطاق سے باہر ایک زبرجد سبز (ہرا بھرا ملک اور سبز و زار عالم) پیدا کیا ہے جسکی سبزی سے یہ سماء سبز معلوم ہوتا ہے"۔ راوی کہتا ہے۔ میں نے عرض کی "نطاق" کیا؟ آپ نے فرمایا "حجاب"۔ پھر فرمایا۔ کہ "اس سے باہر ستر ہزار عالم ہیں۔ جن کا شمار جن و انس سے بھی زیادہ ہے"۔ میں نے رسالہ "جبل قاف" میں اس حجاب کی تطبیق زمین کے ظل مخروطی سے دکھلائی ہے۔ اور یہ کہ وہ زبرجد اخضر سے مشابہ ہے۔ اور یہ کہ مراد اس سے ہمارا نظام شمسی ہے۔ اور یہ عالم اس سے باہر ہیں۔ وہ اور نظامات شمسیہ

ہیں۔ (اس رسالہ کو ملاحظہ فرمائیے)۔ آپ نے جو شمار جن و انس سے زیادہ بتایا ہے اس سے مطلب بیان کثرت ہے یعنی وہ بہت زیادہ ہیں +

چھٹا مقالہ شریعت

کتاب بحار اور کتاب فرج المہموم سید بن طاؤس میں کتاب الانبیاء والاوصیاء سے نقل کیا ہے کہ چوتھے امام جناب علی بن الحسین السجادؑ نے ایک منجم سے فرمایا "ھل ادلک علی رجل قد مر منذ دخلت علینا فی اربعۃ الاف عالم" (یہ وہی روایت ہے جو تیسرے مقالہ شریعت میں ابھی گذر چکی ہے۔ اس کا بیان یہاں تکرار بیکار ہے مترجم) (مگر اس حدیث میں چودہ ہزار عالم مذکور ہیں اور وہاں صرف چودہ صحیح) +

ساتواں مقالہ شریعت

کتاب ابولیث سمرقندی میں جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے۔ کہ آپ نے فرمایا "خدائے تعالے نے اٹھارہ ہزار عالم پیدا کئے ہیں۔ دنیا بھی ان میں سے ایک عالم ہے" سید جزائری نے شرح صحیفہ کاملہ میں اس قدر اضافہ اور بھی نقل فرمایا ہے کہ "الدنیا من مشرقھا الی مغربھا عالم واحد" یعنی مشرق سے لیکر مغرب تک دنیا ان عالموں میں سے ایک عالم ہے" + ابن وردی نے کتاب "خریدۃ العجائب" میں روایت کی ہے کہ ابوسعید خدری مصاحب یا صحابی رسول خداؐ نے بیان کیا۔ کہ خدا تعالے نے چالیس ہزار عالم پیدا کئے ہیں۔ جن میں سے یہ دنیا من المغرب الی المشرق ایک عالم ہے" مطلب تو واضح ہے۔ مگر اس قدر کہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ روایات اس باب میں مختلف الالفاظ ہیں۔ کسی میں بارہ۔ کسی میں چودہ۔ کسی میں چالیس۔ کسی میں ستر۔ کسی میں کچھ اوپر تین سو عالم۔ کسی میں چار ہزار۔ کسی میں سات ہزار۔ کسی میں دس ہزار۔ کسی میں بارہ ہزار۔ کسی میں اٹھارہ ہزار۔ کسی میں چالیس ہزار۔ کسی میں اسی ہزار۔ کسی میں چھ لاکھ۔ کسی میں ۱۰۰۰×۱۰۰۰ کسی میں "بے شمار" مذکور ہے۔ ان سب سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ عدد خاص مراد نہیں ہے۔ بلکہ کثرت دکھانی مقصود ہے جیسا کہ

سابق میں ذکر ہوا کہ جس طرح ہم بولتے ہیں۔ سیکڑوں ہزار مل۔ اور اس سے کوئی عدد خاص مراد نہیں لیتے۔ بلکہ محض زیادتی کو بتاتے ہیں۔ اُسی طرح عرب میں کبھی ان الفاظ سے زیادتی مقصود ہوتی ہے۔ نہ کوئی عدد خاص نیز یہ بھی محتمل ہے۔ کہ سامعین کے تحمل کے انداز سے اعداد میں کمی بیشی فرمائی گئی ہے۔ بنا بر کلموا الناس علے قدر عقولھم" کے۔ اور فی الحقیقت بہت زیادہ اور بیشمار مراد ہے۔ یا اور کسی وجہ سے اختلاف ہو جس کی تفصیل ہم نے مبحث پنجم کے کے مقالہ اولے میں کی ہے۔ (دیکھئے مسئلہ صفات شمس کو)۔

آٹھواں مقالہ شریعت

کافی کلینی و وافی محمد حسن فیض۔ بحار الانوار مجلسی وغیرہ میں بسند قوی ابو حمزہ ثمالی سے مروی ہے۔ کہ مجھ سے جناب ابو جعفر محمد باقر علیہ السلام (امام پنجم) نے ایک شب کو فرمایا۔ جبکہ میں آپ کی خدمت میں حاضر تھا۔ اور آپ نے آسمان کی طرف نظر فرمائی۔ یا ابا حمزہ ھذہ قبۃ ابینا آدم وان للّٰہ عز وجل سواھا تسعۃ وثلثین فیھا خلق ما عصوا اللّٰہ طرفۃ عین الخ

یہی حدیث مشہور بحدیث قباب ہے۔ میرے خیال میں ان (۳۹) قبوں سے مراد وہ متفرق اراضی ہیں۔ جو اس وسیع فضا میں پیدا کی گئی ہیں جن میں سے کچھ تو آفتاب کے تابع اور اس کے نظام میں داخل ہیں۔ اور کچھ اس سے خارج۔ اور دیگر نظامات میں شامل ہیں۔ اور ہر ایک کے گرد گیس کا آسمان مثل قبہ کے اُسے محیط ہے۔ جیسا کہ ہم نے مسئلہ ترتیب سماوات سبع میں امام رضا علیہ السلام کی حدیث کے ارشاد بموجب بیان کیا ہے۔ کہ آپ نے اِنّ سماء کل ارض محیط بھا کالقبۃ فوق الشیٔ "ہر زمین کا آسمان اُس زمین کو اس طرح محیط ہے۔ جیسے کسی شے کا قبہ اُس شے کو محیط ہوتا ہے۔" واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

نواں مقالہ شریعت

بحار الانوار۔ انوار نعمانیہ۔ احتجاج طبرسی۔ شرح صحیفہ سید جزائری اور کتاب فرج الھموم سید ابن طاؤس علیہم الرحمۃ میں بسند ہائے قویہ امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ہے۔ کہ آپ نے ایک

فارسی منجم سے فرمایا جس کا نام سرغیل دہقان تھا۔ فی البارحۃ سعد سبعون الف عالم وولد فی کل عالم سبعون الفا واللیلۃ یموتون مثلہ "شب گذشتہ ستر ہزار عالموں کے باشندے سعادت مند ہوئے۔ (یعنی یہ شب اُن کی سعادت کی تھی)۔ اور ہر عالم میں ستر ہزار مخلوق پیدا ہوئی۔ اور آج شب میں اسی قدر مرینگے" یہ شمار جو حضرتؑ نے فرمایا ہے۔ وہ قریب قریب اُن شماروں سے مطابق ہے۔ جو آج کل کے فلاسفروں نے لکھا ہے۔ چنانچہ فاضل جرجی زیدان نے صفحہ ۶۶۸۔ اہلۃ ۱۳۱۵ھ ہجری میں لکھا ہے۔ انہ یموت علی وجہ ارضنا کل لیلۃ تسعون الفا۔ ہماری اس زمین پر ہر شب کو نوّے ہزار آدمی مرتے ہیں۔ اور جب ایک شب میں نوّے ہزار کا مرنا ممکن ہے۔ تو ستر ہزار میں کیا تردد ہو سکتا ہے۔ بہرحال اس روایت سے ستر ہزار عالموں کا مثل ہماری زمین کے عالم کے ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ واللہ ربّ العالمین۔ اس روایت کو دوسری سند سے بھی نقل کیا گیا ہے جس میں یہ ہے۔ الف الف من البشر یولدون الیوم واللیلۃ ویموت مثلھم۔ یعنی ہر شب و روز میں دس لاکھ آدمی پیدا ہوتے ہیں۔ اور اسی قدر مرتے ہیں" ایک اور حدیث میں ہے۔ کہ کلھم مولدون فی یوم واحد ومئۃ الف البشر کلھم یموتون اللیلۃ وغدا "یہ سب کے سب ایک دن میں پیدا ہوئے ہیں۔ اور ایک لاکھ آدمی آج کی شب میں اور کل مرینگے" اس کے بعد آپ نے سرغیل سے فرمایا کہ اگر تجھ کو اس بات کا علم ہوتا۔ تو تجھے اس جھاڑی کے ہر تنکے کا حال معلوم ہوتا۔ (اشارہ اُس جھاڑی کی طرف کیا جو دائیں جانب تھی)۔

دسواں مقالہ شریعت

توحید صدوق خصال۔ بحار الانوار۔ انوار نعمانیہ شرح صحیفہ کاملہ اور تفسیر نور الثقلین وغیرہ میں مسنداً جابر سے مروی ہے۔ کہ پانچویں امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ "شاید تم سمجھتے ہو گے۔ کہ خدائے تعالےٰ نے صرف یہی ایک عالم پیدا کیا ہے۔ یا تم یہ سمجھتے ہو۔ کہ سوا تمہارے خدائے تعالےٰ نے کوئی قوم انسان نہیں پیدا کی۔ ہاں واللہ خدائے تبارک و تعالےٰ نے الف الف (دس لاکھ) عالم پیدا کئے ہیں۔ اور دس لاکھ آدم

اور تم تو ان تمام عالمین میں سے آخری عالم اور آخری آدمیوں میں سے ہو"۔ یہ حدیث
بھی ہمارے مطلب کی مصرح ہے۔ اس میں ایک بات سمجھنے کی ہے۔ وہ یہ کہ اس دنیا
کے آدمیوں کا اُن تمام عالم کے آدمیوں سے آخر ہونا کیا معنی دیتا ہے سو آخر ہونے کے
واسطے صرف بلحاظ زمانے ہی کے آخر ہونا لازم نہیں ہے۔ بلکہ بحیثیت عزت بحیثیت
شان بحیثیت قوت بحیثیت طبیعت وغیرہ کے بھی آخر ہو سکتا ہے۔ ہماری اُردو
زبان میں بھی بولتے ہیں۔ فلاں شخص فلاں سے پیچھے رہ گیا۔ یعنی مثلاً اُس کے بقدر
عزت نہ پیدا کرسکا۔ اُس کی سی ترقی نہ کرسکا۔ اُس کا سا کمال نہ حاصل کرسکا۔ وغیر ذالک۔ تو
ممکن ہے۔ کہ ہم لوگ بھی کسی صفت میں اُن عالم والوں سے پیچھے ہوں جس کو معصوم نے
آخر ہونے سے تعبیر فرمایا ہے +

گیارھواں مقالہ شریعت

بحار الانوار اور مشارق الانوار حافظ رجب برسی میں ابو حمزہ ثمالی سے روایت کی ہے
امام چہارم علی ابن الحسین زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا "اتظن ان اللہ تعالیٰ لم یخلق
خلقاً سواکم بلیٰ و اللہ لقد خلق الف الف عالم و الف الف آدم و انت
واللہ فی آخر تلک العوالم"۔ اس روایت کا محصل بھی وہی ہے۔ جو سابق کی
روایت کا ہے +

بارھواں مقالہ شریعت

بحار الانوار ج ۱۴ کے باب العوالم میں ایک طولانی حدیث میں ابن عباس رض سے
روایت کی ہے۔ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے آسمان کے اُس طرف کی چیزوں کے
متعلق فرمایا "من وراء ذالک ظل العرش و فی ظل العرش سبعون الف امۃ الخ"۔
اس عالم کے علاوہ یا اُس طرف عرش کا ظل ہے۔ اور ظل عرش میں خدا سے تعالےٰ نے
ستر ہزار امت کو پیدا کیا ہے"۔ اُس کے بعد فرمایا "و یخلق ما لا تعلمون کا یہی مطلب ہے"۔

یہ حدیث بھی تعدد عالم اور وجود خلائق حی و ناطق کو اُن عوالم میں بتاتی ہے۔ ظل عرش سے مراد تحت احاطہ عرش ہے۔ اور عرش ہماری شریعت میں محدد تمام عالم کون کو کہتے ہیں جس طرح کرسی محدد نظام شمسی کو کہتے ہیں۔ واللہ یعلم۔

اس مطلب کو کسی قدر تفصیل سے لکھتا ہوں۔ میں نے جہاں تک اقوال شریعت پر غور کرنے سے سمجھا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ خدائے تعالیٰ جل قدرتہ نے ہمارے امور معاش اور اسباب زندگی کو اس زمین اور اس کرہ بخاریہ میں قرار دیا ہے۔ جو اس زمین کو محیط ہے۔ اور اُس کا نام "سماء" رکھا ہے۔ جو ہماری زمین کے نظام کا منتہی ہے۔ پھر تمام اُن سیارات اور زمین کو جو آفتاب کے گرد بحیثیت مجموعی مع چاند اور نجوم و سب کے جو سماء میں گردش کرتے ہیں۔ اور جو فضا ان سب کو محیط ہے۔ اور جو کرہ ہوا ان سب کے اوپر تمام مجموعے کو گھیرے ہوئے۔ جسے حکمائے حال "ایتھر" کہتے ہیں۔ اُسے "کرسی" سے تعبیر کیا ہے۔ جیسا کہ ہم نے مسئلہ تعدد ارضین میں بیان کیا ہے۔ کہ ہر کرہ کے واسطے ایک ایتھر کا دریا ہے جس میں وہ سیارہ چلتا ہے۔ اسی محیط اعلے کو جو پورے نظام شمسی کو محیط ہے "سرادق" سے بھی تعبیر کی ہے یعنی گویا وہ ایک چھت یا خیمہ ہے ان تمام سماوات و ارض کے واسطے۔ جیسا کہ قرآن بیان فرماتا ہے وسع کرسیہ السماوات والارض۔ یعنی محدد نظام شمسی تمام سماوات و ارض کو محیط ہے۔

کتاب حدائق النجوم میں لکھتے ہیں۔ جس کا محصل یہ ہے۔ کہ ثوابت ستاروں کی رصد نے پہلی مقدار سے ہمیں بتایا ہے۔ کہ ایک دائرہ ایسا بھی پایا جاتا ہے جو "دودھ" سے مشابہ ہے۔ اور یہ کہ آفتاب کے گرد بھی ایک ایسا کرہ یا دائرہ محیط ہے۔ جیسا کہ دیگر سیارات کو محیط ہے۔ اور وہ کرہ لطیف بخارات کا ہے۔ لیکن ایسا لطیف ہے کہ گویا حکم میں معدوم کے ہے۔ اور خاتمہ اُس کا اُس حد پر ہوتا ہے۔ جہاں سے جاذبیۂ آفتاب اور اُس کی حکومت ختم ہوتی ہے۔

اور چونکہ اس آفتاب کے علاوہ اور بھی آفتاب ہیں جن کے گرد اُن کے سیارات گردش کرتے ہیں۔ اور ہر ایک کے نظام مثل ہمارے نظام شمسی کے علیحدہ علیحدہ ہیں تو ان کو بھی ضرور ہے۔ کہ ایک کرہ بخاریہ محیط ہو جس کے تحت میں وہ واقع ہیں۔ اور

پھر ایک ایسا کرۂ عظیمہ بھی ہونا ضرور ہے۔ جو مجموعۂ نظامات کو محیط ہو تاکہ معلوم ہو کہ یہ سب کے سب کسی ایک خالق یکتا کی حکومت میں اور زیر نگرانی ہیں۔ اُسی کو "عرش" سے ہماری شریعت میں تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ ہماری شریعت میں بیان کیا گیا ہے کہ سماوات سبعہ کی مثال کرسی کے مقابلہ میں ایسی ہے۔ جیسے ایک "حلقہ" کسی میدان میں پڑا ہو۔ (اور چھوٹا سا معلوم ہوتا ہو)۔ اور "کرسی" بمقابلہ "عرش" اس قدر کم ہے۔ جیسے ایک "حلقہ" کسی میدان میں پڑا ہو۔ رہا ظل عرش یعنی اُس کی سلطنت اور اُس کا احاطہ۔ تو وہ اُن نظامات کو محیط ہے۔ جن کے نیچے یہ سب کے سب اپنے اپنے کام میں مشغول اور امر خدائے عزوجل کی اطاعت میں مصروف ہیں۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین والعلم عند اللہ رب العالمین۔ اس بیان سے صرف عرش و کرسی کے معنی کا سمجھانا مقصود تھا۔ اور یہ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے کلام پاک میں جو "ظل العرش" کا لفظ آیا ہے۔ اُس کا کیا مطلب ہے۔ فافہموا تبین۔ ھدانا اللہ وایاک الی سواء السبیل۔

تیرھواں مقالہ شریعت

جناب رسالت آب صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم سے مروی ہے۔ اور یہ روایت مشہور ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ آپ نے فرمایا "عرش کو خدا نے پیدا کیا۔ اور عرش کے لئے ستر ساقیں ہیں ہر ساق اُس کی استدارہ میں مثل آسمان و زمین کی استدارہ کے ہے"۔

سرادق

اس روایت کو علامہ مجلسی رح نے بحار میں "وہب" صحابی رسول سے نقل کیا ہے۔ اور تفسیر علامہ فخر الدین رازی میں مروی ہے "کہ عرش کے چھ لاکھ سرادق ہیں ہر سرادق کا طول و عرض اور بلندی اگر بمقابلہ تمام سماوات و ارضین کے دیکھی جائے۔ تو بہت ہی تھوڑی اور چھوٹی معلوم ہو گی"۔ کتاب نہایۃ میں ہے۔ "کہ "سرادق" ہر اُس شے کو کہتے ہیں جو کسی شے کو محیط ہو۔ خواہ وہ خیمہ ہو۔ یا دیوار۔ یا کوئی اور چیز۔

یہ روایت بھی نظام جدید کی مؤید ہے۔ البتہ تعبیرات کا فرق ہے کسی میں کرسی۔ کسی میں سرادق اور کسی میں ساق سے تعبیر کی ہے مطلب سب کا ایک ہے۔ سرادق بھی

بھی یہی بات ہے۔ کہ عرش یعنی محدد تمام عوالم کے ماتحت نہ معلوم کتنے سرادق و حجاب و کرسی ہیں جن کا شمار سوائے خدائے تعالےٰ کے کوئی نہیں جان سکتا اور بظاہر یہی مطلب ہے "الرحمٰن علے العرش استویٰ" کا یعنی خدا ہی جانتا ہے۔ کہ اُس کے عرش کے ماتحت کتنے عالم اور کتنے موجودات اور کتنی مخلوقات ہیں۔ وہی ان سب کو محیط اور سب پہ غالب ہے جل جلالہ +

چودھواں مقالہ شریعت

بحار اور مناقب ابن شہر آشوب میں امام ششم جناب صادق آل محمدؐ سے مروی ہے۔ ان بین القائمۃ من قوائم العرش والقائمۃ الثانیۃ خفقان الطیر عشرۃ الاف عام الخ "عرش کے ایک قائمہ سے (یعنی اُس کے ماتحت کے ایک عالم سے) دوسرے قائمہ (دوسرے عالم) تک دس ہزار برس تک پرندے کے اُڑنے کی مسافت ہے" نیز شرح صحیفہ کاملہ جزائری۔ بحار اور روضۃ الواعظین میں جناب علیؑ بن الحسینؑ السجاد زین العابدین (امام چہارم) علیہ السلام سے ایک طولانی حدیث کے ذیل میں مروی ہے۔ کہ ان بین القائمۃ من القوائم العرش والقائمۃ الثانیۃ خفقان الطیر المسرع الف عام۔ اور ایک نسخہ میں ہے عشرۃ الاف عام والعرش یکسیٰ کل یوم سبعین الف لون من النور۔ یعنی ایک قائمہ عرش سے لیکر دوسرے قائمہ تک کی مسافت پرندے کے ایک ہزار برس تک اُڑتے رہنے کی مسافت ہے" دوسری روایت کے بموجب "دس ہزار برس" اور عرش کو ہر روز ہزار طرح کا نور مرحمت ہوتا ہے" اس کے بعد فرمایا جس کا حاصل یہ ہے۔ کہ خدائے تعالےٰ نے ایک فرشتہ پیدا کیا ہے جس کا نام حزقائیل ہے۔ اُس کے اٹھارہ ہزار بازو ہیں ہر بازو سے دوسرے بازو تک پانچ سو برس کی راہ کا فاصلہ ہے۔ اُس کے دل میں ایک امر کا خطور ہوا تھا۔ تو پروردگار عالم نے اُتنے ہی بازو اُس کو اور مرحمت فرمائے تو اُس کے چھتیس ہزار بازو ہو گئے۔ ہر ایک بازو سے دوسرے بازو تک پانچ سو برس کی راہ کا فاصلہ تھا۔ پھر خدائے تعالےٰ نے اُس سے فرمایا۔ کہ پرواز کر۔ اُس نے بیس

ہزار برس کے بقدر پرواز کی۔ مگر ایک قائمہ کو بھی قوائم عرش سے نہ پا سکا۔ پھر پروردگار عالم نے اُسے اور دُگنے بازو اور قوت مرحمت کی۔ اور حکم پرواز دیا۔ تو تیس ہزار برس کی مقدار میں اُڑتا رہا۔ پھر بھی نہ پہنچا تو پروردگار عالم نے اُس کی طرف وحی کی۔ کہ اگر نفخ صور تک تو اپنی قوت اور ان بازوؤں سے اُڑتا رہیگا۔ تو میرے عرش کی ساق تک نہ پہنچ سکیگا۔ اُس وقت فرشتہ نے تسبیح خدا کی۔ اور کہا۔ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى +

(میں کہتا ہوں)۔ اس حدیث شریف اور خبر محترم کے مضمون کو اگر فیلسوف ہزار زبان بھی چاہے۔ تو اس سے بہتر ادا نہیں کر سکتا۔ درحقیقت اس حدیث میں وہ تحقیقات دقیقہ مذکور ہیں جن کے سمجھنے کے واسطے اور تحمل کرنے کے لئے بہت بڑا ظرف درکار ہے۔ مجملاً یہ ہے کہ اس حدیث سے باہم مختلف نظامات عالم کا فاصلہ بتانا مقصود ہے۔ یعنی ایک عالم کو دوسرے عالم سے بعید فاصلہ ہے۔ اور اس فاصلہ کو اسی سے سمجھ لینا چاہئیے۔ کہ جو ہمارے نظام شمسی سے قریب قریب دوسرا آفتاب واقع ہوا ہے اُس کا نور جب کہ تین برس کی مدت میں آتا ہے۔ حالانکہ نور کی رفتار فی سکنڈ ایک لاکھ نوے ہزار میل ہے۔ تو بتائیے۔ کہ اُس آفتاب کا نور کتنے دنوں میں ہم تک پہنچیگا۔ جو ہم سے کئی لاکھ ملین فرسخ دور ہے۔ اور کتنا اُس کا فاصلہ ہم سے ہونا چاہئیے۔ یہی رائے حکمائے حال کی بھی ان عوالم کے فاصلہ کے متعلق ہے۔ چنانچہ حکمائے حال نے تصریح کی ہے۔ کہ کئی آفتاب ایسے ہیں۔ جن کا نور ہم تک پانچ ہزار برس میں یا اس سے زیادہ میں آتا ہے۔ جل اللہ وجلّت قدرتہ۔ اور جب نور کے یہاں تک پہنچنے کے واسطے اتنی مدت درکار ہے۔ تو فاصلہ کا اندازہ کون سی عقل کر سکتی ہے +

رہا قوائم عرش کا لفظ۔ تو ہم پہلے کہہ چکے ہیں۔ کہ اس سے نظامات شمسیہ مراد ہیں۔ جس طرح سرادق۔ اور حجب سے اور ساق سے بھی یہی مراد ہے۔ یا وسط دائرہ مراد ہو۔ جس کا محیط فی الواقع اتنا بڑا ہوگا۔ جسے عقل اندازہ نہیں کر سکتی۔ اور ممکن ہے کہ قائمہ سے مراد محور عرش اور ساق عرش سے قطر عرش ہو۔ اور ظاہر ہے۔ کہ یہ دونوں بھی اپنے احاطہ اور طول میں اس حد پر ہیں۔ کہ سوائے خدائے تعالےٰ کے کوئی ان کی مساحت نہیں کر سکتا +

پندرھواں مقالہ شریعت

بحار الانوار علامۂ مجلسی علیہ الرحمہ اور مناقب حافظ محمد بن شہر آشوب علیہ الرحمہ متوفی ۵۸۸ھ ہجری میں ابن عباسؓ سے مروی ہے۔ اُنہوں نے جناب امیر المومنین علیؑ بن ابی طالب علیہ السلام سے ایک طولانی روایت میں نقل کیا ہے۔ منجملہ اُس کے ایک جملہ یہ بھی ہے "واما الاربعة عشر فاربعة عشر قنديلا من النور معلقة بين السماء السابعة والحجب لتسرج بنور الله تعالى الى يوم القيمة" یہ روایت بحار ج ۱۴ میں اور کتاب اختصاص میں منجملہ جواب سوالات ابن سلام یہودی کے جو ہمارے رسول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کئے تھے۔ مذکور ہے "واما الاربعة عشر قنديلا من نور معلقة بين العرش والكرسي طول كل قنديل مسيرة مائة سنة" یعنی "چودہ قندیلیں نور کی درمیان عرش اور کرسی کے معلق ہیں۔ اور طول ہر قندیل کا ایک سو برس کی راہ کا ہے" اس حدیث کا ظاہر بھی تعدد عالم ہی کی خبر دے رہا ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ قندیل سے مراد واقعی لالٹین تو ہے نہیں۔ اس وجہ سے کہ اس کی ضرورت کیا تھی۔ جو لالٹینیں بنائی جاتیں۔ البتہ یہ ثوابت ستارے جو بذات خود روشن ہیں۔ اور ایک ایک آفتاب ہیں۔ اُن کو بسبب روشنی کے قندیلوں سے تعبیر فرمایا ہے۔ کیونکہ قندیل اس قسم کے چراغوں کو کہتے ہیں۔ جو بیضوی شکل کے ہوں۔ خصوصاً مع اُن رسیوں اور زنجیروں کے جن میں وہ لٹکائے جاتے ہیں اس لحاظ سے قندیل سے تشبیہ نہایت مناسب ٹھیریگی۔ کیونکہ نظام شمسی کی صورت بھی یہی ہے۔ نیز اس وجہ سے بھی کہ قندیل وہی ہے۔ جس کے بیچ میں ایک روشن چیز ہو۔ اور نظام شمسی میں بھی یہی ہے۔ کہ بیچوں بیچ میں آفتاب ہے۔ اُس کے گرد دیگر سیارات ہیں۔ جن پر آفتاب کی شعاعیں پڑتی ہیں۔ اور وہ اس سے اکتساب نور کرتے ہیں +

علاوہ اس کے اور الفاظ بھی حدیث مذکور کے تعدد عالم اور مطابقت فلسفہ جدیدہ کو بیان کرتے ہیں۔ مثلاً (۱) حضرت کا یہ ارشاد کہ "معلقا بين العرش والكرسي"

جیساکہ سابقاً ہم نے بیان کیا ہے۔ کہ عرش سے مراد مجموعہ نظامات عوالم ہے۔ اور کرسی سے مراد مجموعہ نظام شمسی ہے۔ جو عالم ان دونوں کے درمیان واقع ہوا ہے۔ اُس کو معلقا بین العرش والکرسی کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں + (۲) یہ کہ آپ نے فرمایا "طول ہر قندیل کا سو برس کی مسافت کا ہے" اس سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ عالم ہی مراد ہے۔ ورنہ دنیا میں اتنی بڑی قندیل کہاں ہوتی ہے۔ اور کہاں اور کس مکان میں لٹکائی جاتی ہے۔ البتہ ہر نظام شمسی خواہ وہ کتنا ہی چھوٹے سے چھوٹا ہو۔ یقیناً اُس کا قطر ایک ہزار ملین فرسخ سے زیادہ ہی ہوگا۔ نیز مُعلقہ یا مُعلّقۃ۔ دونوں کی بنا پر یہی مطلب ہوگا۔ کہ وہ عالم بنفسہ روشن ہے۔ اور شمس مستقل ہے۔ یا یہ کہ فضائے وسیع میں معلق ہے۔ کیونکہ واقعی ہر شمس ان میں سے اپنی اپنی فضا ہی میں ہے۔ نہ یہ کہ کسی جگہ میں جڑا ہوا ہے +

ایک احتمال یہ بھی ہے۔ کہ اس روایت میں بڑے دُمدار ستاروں کی طرف اشارہ ہو۔ جو بغیر دوربین کے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ جس پر اس روایت کے چند جملے دلیل ہو سکتے ہیں۔ ایک تو چودہ قندیلوں کا ہونا۔ کیونکہ بڑے بڑے دمدار ستارے جن کو آنکھوں سے بھی دیکھنا ممکن ہے۔ تقریباً اتنے ہی ہونگے۔ یا یہ کہ اُس زمانے میں اتنے ہی رہے ہونگے۔ اگرچہ بعد میں ٹوٹ ٹوٹ کر کم ہو گئے ہوں + دوسرے یہ کہ قندیل کہنا بھی تقریباً اس مطلب کو ظاہر کرتا ہے۔ کیونکہ دمدار ستارے بھی مشتعل ہیں۔ اور ذاتی حرارت رکھتے ہیں۔ نیز شکل میں بھی قندیل کی شکل سے بہت مشابہ ہیں۔ اس وجہ سے اُن کی دُمیں کبھی کبھی اتنی لمبی ہوتی ہیں۔ کہ (۱۳۲) ملین میل تک دراز ہو جاتی ہیں + تیسرے حضرتؑ کا یہ ارشاد بنا بر بعض روایات کے کہ "ہر قندیل کا طول سو برس کی مسافت کا ہے" کیونکہ بڑے بڑے دمدار ستاروں کا قطر تقریباً اس سے کم نہیں ہوتا۔ اور اگر وہ روایت لی جائے جس میں ایک ہزار برس کی مسافت بتائی گئی ہے۔ تو ممکن ہے۔ کہ اُس سے اُس دُمدار ستارے کا پورا فلک مراد ہو۔ جو بیشک اس قدر وسیع ہوتا ہے + چوتھے حضرتؑ کا یہ ارشاد کہ "بین السماء السابعۃ والحجب" کیونکہ اس مسافت سے مراد وہ مسافت ہے۔ جو ہمارے نظام شمسی کے بعد اراتوس اور نبتون کی حد سے بھی باہر ہے۔ جیسا کہ سابقاً ہم نے بیان کیا ہے۔ اور ظاہر ہے۔ کہ دُمدار ستارے اسی مسافت وسیعہ میں اپنی جولانگاہ بنائے ہوئے ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہو چکا ہے۔ کہ یہ دمدار ستارے اپنی سیر میں فلک نبتون سے

اس قدر دور ہو جاتے ہیں۔ جونپتون کے آفتاب سے چودہ گُنے بُعد کے برابر ہے۔ پھر تقریباً چھ سو برس میں مدار بیضوی یا اہلیلجی پر واپس آجاتے ہیں ۱۸۹۲ء کے دمدار ستارے کا دورہ تو اسّی برس میں تمام ہوتا ہے۔ اور جب یہ بات مسلّم ہو گئی۔ تو غور کیجئے۔ کہ اُن دمدار ستاروں کے مدار جن کا دورہ دو ہزار برس یا تین ہزار برس میں تمام ہوتا ہے۔ کتنے وسیع ہونگے۔ کیا ایک ہزار برس کی راہ سے کم ہونگے؟ ہرگز نہیں۔ اسی سے دیگر نظامات شمسیہ کے باہمی بُعد کا اندازہ کیجئے۔ کہ جب یہ دمدار ستارے اُن سے اس قدر دور رہتے ہیں کہ نہ وہ ان کو اپنی طرف جذب کر سکتے ہیں۔ اور نہ اُن کے ماتحت سیاروں کو ضرر پہنچا سکتے ہیں۔ تو خود اُن میں باہم کس قدر فاصلہ ہوگا۔ اور اسی سے اپنے نظام شمسی کی وسعت کو بھی اندازہ کر لیجئے۔ جس کے ماتحت اس قدر سیارات کام کر رہے ہیں۔ اور ہر ایک دوسرے سے کس قدر بعید ہے۔ اور ان کا طول مسافت کس درجہ تک ہے۔ اور کرسی سلطنت شمسی کتنی حدود تک پھیلی ہوئی ہے۔ غرض یہ کہ احادیث میں جو تعداد مسافت ہزار برس یا دو ہزار برس بتائی گئی ہے۔ وہ ہرگز قابل استبعاد نہیں ہے۔ بلکہ بالکل صحیح اور مطابق فلسفہ جدیدہ ہے۔ سمجھئے اور پھر سمجھئے۔

سولھواں مقالہ شریعت

کتاب انوار النعمانیہ اور شرح صحیفہ کاملہ ملا نعمت اللہ جزائری میں بعد ایک طولانی تقریر کے جس میں اُنہوں نے حدیث کے بالکل صحیح ہونے کی نسبت لکھا ہے۔ یہ روایت نقل فرمائی ہے۔ کہ طاہرین یعنی جناب رسالت مآب صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُن کے اوصیائے معصومین علیہم السلام سے مروی ہے "ان اللہ تعالے خلق مئة الف قندیل وعلقھا بالعرش والسماوات والارض وما فیھا حتی الجنة والنار کلھا فی قندیل واحد ولا یعلم ما فی القنادیل الباقیة الا اللہ سبحانہ" یعنی خدائے تعالے نے ایک لاکھ قندیلیں پیدا کی ہیں۔ اور انہیں عرش سے معلق فرمایا ہے۔ یہ کل سماوات و ارض حتےٰ کہ جنت و نار بھی ایک ہی قندیل کے اندر ہے۔ باقی اور قندیلوں کا حال سوائے خدائے سبحانہ وتعالے کے کوئی نہیں جانتا۔ ہم تے

پہلے بھی کہا ہے۔ اور آئندہ بھی بیان کرینگے۔ کہ نظام شمسی قندیل سے مشابہ ہے۔ اس کے وجوہ پہلے ہی لکھے گئے ہیں۔ اور بعد میں بھی لکھے جائینگے۔ جن میں سے ایک وجہ یہ ہے۔ کہ قندیل کی شکل بیضوی اور نورانی ہوتی ہے۔ اُسی طرح آفتاب اور اُس کا نظام نورانی اور بیضوی دائرہ پر واقع ہے۔ (دیکھو نقشہ نمبر ۷) + نیز دوسری وجہ یہ بھی ہے۔ کہ قندیل کے اندر ایک جسم لطیف نورانی آگ کی طرح دہکتا ہوا ہوتا ہے۔ یعنی وہ بتی جو اُس میں روشن ہوتی ہے۔ اسی طرح نظام شمسی کے اندر بھی آفتاب مثل ایک چراغ کے ہے۔ اور اُس کے گرد اُس کا کرہ بخار یہ اور اُس کی کرسی اُسے محیط ہے + تیسری وجہ یہ ہے۔ کہ قندیل فضا ہی میں لٹکائی جاتی ہے۔ کسی جسم کے شکم میں جڑی ہوئی نہیں ہوتی۔ علیٰ ہذا القیاس آفتاب بھی کسی جسم کے اندر جڑا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ اپنے مرکز پر فضائے عالم میں معلق ہے + چوتھے یہ کہ قندیل کے اندر جو چیز روشن ہوتی ہے۔ وہ ٹھیک بیچوں بیچ میں نہیں ہوتی۔ بلکہ بعض اطراف سے زیادہ دُور اور بعض اطراف سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ اُسی طرح نظام شمسی میں آفتاب کی حالت ہے۔ کہ بعض سے قریب اور بعض سے بعید واقع ہے۔ اسی وجہ سے کبھی سورج گہن اور کبھی چاند گہن آپ کو دکھائی دیتا ہے۔ (حدائق النجوم میں) لکھتے ہیں۔ کہ "ہمارے عالم کا مرکز حقیقی مرکز آفتاب نہیں ہے۔ بلکہ وہ تقریبی مرکز ہے مرکز حقیقی تو آفتاب سے بقدر نصف قطر آفتاب کے تقریباً خارج ہے" +

جب یہ امر ثابت ہو گیا۔ کہ نظام شمسی سے قندیل کی مشابہت بہت درست ہے۔ تو اس حدیث کا انطباق نظام جدید پر بھی بہت اچھی طرح ہو سکتا ہے۔ اور منافقت فلسفہ قدیمہ سے بھی واضح ہے +

اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ کہ ہزاروں ہی عالم اور نظامات شمسیہ علاوہ ہمارے اس عالم کے ہیں۔ جن کی زمینیں۔ چاند۔ مخلوقات۔ اُن کے اندر آباد ہونے والے جنت اور اور نار وغیرہ سب الگ ہیں۔ اور ہر ایک کے امور معاش و معاد ایک دوسرے سے جدا +

سماوات وارض جتنے کہ جنت و نار کا بھی ایک ہی قندیل میں ہونا صاف بتا رہا ہے کہ "ہر قندیل یعنی ہر عالم کے سماوات وارض جدا جدا ہیں۔ جس طرح ہمارے اس نظام شمسی کے"۔ "معلقة" کا لفظ بھی نظام جدید پر منطبق ہے جیسا کہ سابق میں بیان ہوا "عرش" کی تفسیر پہلے گذر چکی۔ لا یعلم ما فی القنادیل الباقیه سوی الله سبحانه کا جملہ بھی

متاخرین ہی کی رائے سے مطابق ہے۔ کیونکہ درحقیقت ہر عالم کو دوسرے عالم سے بنا بر فلسفہ جدیدہ کی رائے کے اس قدر بُعد ہے۔ کہ ایک کا حال دوسرے کو معلوم نہیں ہوسکتا سوائے پروردگار عالم کے۔ اور جبکہ ہم نے اب تک اپنے ہی نظام شمسی کے اندر والے سیارات کے باشندوں کا مفصل حال معلوم نہیں کیا۔ بسبب اس کے کہ ہمارے پاس ابھی تک کوئی ایسا آلہ اور ذریعہ موجود نہیں ہے۔ تو دیگر عوالم کے باشندوں کا حال کیونکر معلوم کرسکتے ہیں۔ یا وہ کیونکر ہمارا حال معلوم کرسکتے ہیں۔ خصوصاً اُس زمانے میں جب کہ یہ حدیث ارشاد فرمائی گئی ہے۔ اُس وقت تو اور بھی ان حالات سے کوئی واقف نہ تھا سوائے ہمارے ہادیان برحق اور ائمہ طاہرین علیہم الصلوات والسلام کے۔ البتہ جو کچھ کسی کو معلوم ہوا۔ وہ ان ہی حضرات ع کے کلمات اور ان ہی کے گھر سے معلوم ہوا۔ البتہ آئندہ امید ہے۔ کہ اس زمانے کے لوگ شائد ترقی کرکے کچھ اور حالات مزیدہ بھی دریافت کرسکیں +

ناظرین کو اس مقام پر بہت غور و تامل سے کام لینا چاہئے۔ اور سوچنا چاہئے۔ کہ ہمارے ہادیان برحق علیہم الصلوات والسلام اور معلمان دین اسلام اور نائبان رسول انس و جان کتنے بڑے عالم اور کیسے دقیقہ رس اور کیسے حامل اسرار الٰہیہ تھے۔ اور اُن کے نفوس قدسیہ کس قدر لطیف اور صاف تھے۔ کہ بغیر کسی آلہ اور ذریعہ کے ایسے ایسے باریک اور دقیق مضامین کو جانتے اور اُنہیں تعلیم کرتے تھے۔ جن میں سے بہت سے آج تک نئے محققین کے نزدیک مشکوک ہیں۔ مگر اُن کے نزدیک وہ مثل بدیہیات کے تھے۔ اور جب کہ ان امور میں اُن کی سچائی معلوم ہوگئی۔ تو کوئی وجہ نہیں۔ کہ اس کے علاوہ اور دعووں میں وہ سچے نہ ہوں۔ بیشک اُن کے مقالات سچے اور اُن کے کُل ارشادات حق ہیں۔ جن کا اتباع ہر عاقل پر فرض ہے۔ کیونکہ وہی سچے خدا کے ولی اور خدائی دین کے عالم و محافظ تھے۔

"ذلک الدین القیم" +

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

خاتمۂ کتاب ترجمہ

الہیئۃ والاسلام

اُن چند اقوال کے بیان میں جو ہیئت جدیدہ کے مطابق ہیں

(۱) کافی - وافی اور بحار الانوار وغیرہ میں بسند قوی امام ششم جناب صادق آل محمدؑ سے ایک خبر میں مروی ہے - جس میں آپ کا امتحان لینا ایک منجم عراقی کا مذکور ہے - کہ آپ نے اُس سے بطور امتحان کے پوچھا "ستارۂ سکینہ کی روشنی زہرہ کی روشنی کا کونسا جزء ہے"؟ منجم نے کہا - "یہ تو وہ ستارہ ہے - جسے میں نے کسی سے نہیں سُنا - کہ کوئی اس کا ذکر بھی کرتا ہو" آپ نے فرمایا "سبحان اللہ العظیم (تعجب سے) کیا تم نے ایک ستارے کو بالکل حذف ہی کر دیا - تو پھر حساب کس طرح پر لگاتے ہو؟

اِس حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے - کہ "نجم سکینہ" منجملہ سیارات کے ہے - ثوابت میں سے نہیں ہے - اور جو علامتیں معصومؑ نے بیان کی ہیں - اُن سے معلوم ہوتا ہے - کہ مراد اس سے "ارانوس" ہے - جو بہت ہی چھوٹا دکھائی دیتا ہے - اور جس کا حال سر ولیم ہرشل نے سنہ ۱۱۹۵ھ مطابق سنہ ۱۷۸۱ء میں دریافت کیا +

(۱) علامت تو یہ ہے - کہ اس ستارے کو جہاں کہیں ائمہ معصومین علیہم السلام نے ذکر کیا ہے - مشتری و زہرہ وغیرہ کے ذیل میں ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے - کہ یہ بھی مثل ان سیارات کے سیارہ ہے ثابت نہیں ہے +

(۲) علامت یہ ہے - کہ آپ نے اس کی روشنی کا مقابلہ زہرہ کی روشنی سے کیا ہے - جس سے معلوم ہوتا ہے - کہ دونوں ایک ہی صفت کے ہیں - تب تو ایک کی زیادتی دوسرے

پر دریافت فرمائی ہے۔ اور اگر یہ ستارہ منجملہ آفتابیوں کے ہوتا۔ تو اس کا مقابلہ آفتاب سے کرنا چاہیئے تھا۔ نہ کہ زہرہ سے +

(۳) علامت یہ کہ آپ نے فرمایا ہے "کیا تم نے ایک ستارے کو بالکل حذف کر دیا ہے تو پھر حساب کس طرح پر لگاتے ہو؟" اس سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ ستارہ سیارہ ہے۔ (اور ارانوس ہی ہے) کیونکہ حساب کا لگانا ثابت ستارے کے ذریعے سے نہیں ہوتا۔ بلکہ سیارستاروں کی حرکت اور گردش سے منجمین اپنے حساب لگایا کرتے اور احکام بیان کیا کرتے ہیں مثلاً سعادت۔ نحوست۔ شرف۔ ہبوط۔ مقابلہ اور اجتماع وغیرہ۔ یہ بات ثابت ستاروں کو کہاں حاصل ہے +

(۴) آپ کا تعجب کرنا اور سبحان اللہ العظیم فرمانا جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ ستارہ ایسا نہیں ہے۔ جس سے لوگ ناواقف رہ کر منجم بن سکیں۔ اگر یہ ستارہ کوئی ثابت ستارہ ہوتا۔ تو تعجب کا کیا محل تھا۔ کیونکہ ایسے ہزاروں ہی ثابت ستارے آج تک لوگوں کو معلوم نہیں ہیں۔ جن کے نہ معلوم ہونے سے کوئی خلل حساب میں واقع نہیں ہوتا۔ اور نہ اُس سے ناواقفیت محل تعجب ہو سکتی ہے۔ البتہ اگر ہم اس سے سیار ستارہ مراد لیں تو تعجب بجا ہو سکتا ہے۔ کہ حکمائے سابقین نے باوجودیکہ بہت کچھ مال و دولت اور بہت سا عمر کا حصہ سیارات کے حالات دریافت کرنے اور اُن کے حسابات درست کرنے میں صرف کیا۔ پھر بھی ایک ضروری ستارہ جس کے بغیر حساب درست نہیں ہو سکتا معلوم نہ کر سکے +

(۵) مسئلہ تعداد سیارات میں ہم نے بیان کیا ہے۔ کہ یہ ستارہ یعنی ارانوس بعض اہل ہند کو بھی معلوم تھا جس سے اُن کے قواعد حسابیہ درست ہوتے تھے۔ پس اس صورت میں اس سے ناواقف رہنا ضرور قابل تعجب ہو سکتا ہے +

نکتہ

جس طرح معصومؑ کے تعجب کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ ستارہ سیارات میں داخل ہے۔ اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ ستارہ وہی ہے جسے آج کل "ارانوس" کہتے ہیں۔ اور یہ بات میں نے کئی وجوں سے سمجھی ہے +

(۱) یہ کہ حضرتؑ کا اس قدر تعجب کرنا بتاتا ہے کہ اُس وقت بھی یہ ستارہ دکھائی دیتا تھا۔ اور قابل رصد کرنے کے تھا۔ ورنہ اگر اس قابل نہ ہوتا تو نہ جاننے والے معذور سمجھے جانے کے قابل تھے۔ نہ یہ کہ اُن کی ناواقفیت پر تعجب کیا جاتا۔ اور ظاہر ہے کہ اُس زمانے میں دکھائی دینے کے قابل سیارہ سوائے چھ ستاروں کے اور کوئی نہیں تھا۔ (۱) عطارد ہے۔ (۲) زہرہ۔ (۳) مریخ۔ (۴) مشتری۔ (۵) زحل۔ (۶) ارانوس + پہلے پانچ تو سب ہی کو معلوم تھے۔ باقی رہا ارانوس۔ اس کا حال البتہ لوگوں کو معلوم نہ تھا پس اسی کی ناواقفیت قابل تعجب ہو سکتی ہے +

(۲) یہ کہ زہرہ سے اس کا مقابلہ کرنا بھی بتاتا ہے کہ "ارانوس" ہی اس سے مراد ہے۔ کیونکہ ان سیارات میں سب سے زیادہ روشن زہرہ دکھائی دیتا ہے۔ اور سب سے زیادہ خفی (یعنی پانچویں حد پر) ارانوس معلوم ہوتا ہے بلکہ کبھی رات کو نہیں بھی دکھائی دیتا۔ تو پھر قابل اس کے تھا کہ معصومؑ اُس کا امتحان اس کی بابت لیتے۔ اور دریافت کرتے کہ اس کی اور زہرہ کی روشنی میں کے درجہ کا تفاوت ہے +

(۳) اس ستارہ کو معصومؑ نے "سکینہ" کے نام سے یاد فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بطئے الحرکت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ سیارات مرصودہ میں سے سوائے "ارانوس" کے کوئی زیادہ سست حرکت والا سیارہ نہیں ہے کیونکہ یہ "اسّی برس" میں دورہ تمام کرتا ہے۔ گویا نہایت سکون و وقار سے چلتا ہے۔ اور کمال اطمینان کے ساتھ حرکت کرتا ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال +

دوسرا قول شریعت۔ بحار ج ۱۴۔ اور فرج الہموم سید ابن طاؤس میں بسند ہائے مختلفہ حسین بن غضائری سے روایت کی ہے۔ اور انہیں نے اُن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی جلد ثانی کتاب الدلائل سے نقل کیا ہے۔ جو تصنیف سے عبداللہ بن حمیری کی ہے وہ اپنی سند سے بیاع سابری (سابری یعنی زرہ بیچنے والے) سے روایت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے عرض کی کہ "ستاروں میں غور کرنے سے مجھے ایک لذت ملتی ہے"۔ اس کے جواب میں معصومؑ نے جو کچھ ارشاد کیا ہے۔ اُن میں سے یہ بھی تھا "آفتاب کس قدر اپنا نور چاند پر ڈالتا ہے۔ یعنی کے درجے کی روشنی آفتاب کی چاند پر پڑتی ہے جس سے یہ روشن دکھائی دیتا ہے؟ میں نے کہا "مجھے

یہ نہیں معلوم" پھر امام علیہ السلام نے فرمایا" آفتاب کس قدر روشنی لوح محفوظ سے لیتا ہے"؟ میں نے کہا" یہ بھی ایسی بات ہے۔ جسے میں نے آج تک سُنا نہیں" آپ نے فرمایا" یہ بات ایسی ہے کہ اگر اسے کوئی جان لے۔ تو وہ یہ بھی جان سکتا ہے۔ کہ جھاڑی کے اندر پیچ کی سے کونسی ہے" پھر آپ نے فرمایا" نجوم کو سوائے قریش کے ایک گھر والوں کے اور ہندوستان کے ایک گھر والوں کے کوئی (اچھی طرح) نہیں جانتا" (میں عرض کرتا ہوں کہ) اس حدیث سے ایک لطیف معنی کو میں سمجھتا ہوں۔ جو ہیئت جدیدہ سے موافق ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ سیارات بالذات نورانی نہیں ہیں۔ بلکہ آفتاب سے اکتساب نور کر کے روشن دکھائی دیتے ہیں یہی رائے حکمائے حال کی ہے۔ کیونکہ ان کا قول ہے۔ کہ باقی سیارات بھی مثل ہماری زمین کے پہاڑوں اور ریگ وغیرہ سے بھرے ہوئے ہیں۔ تو جس طرح زمین پر آفتاب کی روشنی پڑتی اور اس سے دن ہوتا ہے۔ اسی طرح دیگر سیارات پر بھی اس کی روشنی سے پر چمک معلوم ہوتی ہے۔ بخلاف ثوابت کے کہ وہ خود روشن اور بجائے خود آفتاب ہیں۔ پس حدیث مذکور تصدیق کرتی ہے ہیئت جدیدہ کی۔ نہ قدیمہ کی۔ کیونکہ اُن کی رائے میں بطلیموس سے لے کر ایک ہزار سن ہجری تک یہی مشہور تھا۔ کہ سوائے چاند کے تمام سیارے بجائے خود روشن اور آفتاب کی روشنی سے مستغنی ہیں۔ جیسا کہ حدائق النجوم میں اُن کی اس رائے کو نقل کیا ہے۔ اور علامہ مجلسیؒ اور علامہ بہائیؒ نے بھی بحار الانوار اور حدیقہ ہلالیہ میں منجمین کی یہی رائے لکھی ہے۔ کہ قمر کو چند ایسی خصوصیتیں حاصل ہیں۔ کہ دیگر سیارات کو حاصل نہیں ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک یہ ہے۔ کہ قمر بہ نسبت اور سیاروں کے نہایت سریع السیر ہے۔ دوسری یہ کہ اپنی شکل بدلتا رہتا ہے۔ تیسری یہ کہ آفتاب سے اکتساب نور کرتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ صرف یہی ایک سیارہ آفتاب سے روشن ہے۔ باقی اور ستارے خود بخود روشن ہیں۔ حالانکہ آج کل کی ہیئت نے تسلیم کیا ہے۔ کہ اور سیارات بھی اس صفت میں ماہتاب کے شریک ہیں +

روایت مذکورہ بھی اسی مطلب کو بتاتی ہے۔ کیونکہ پہلے معصومؑ نے چاند کو پوچھا ہے۔ کہ آفتاب کی روشنی اس پر کس قدر پڑتی ہے۔ پھر زہرہ کو دریافت کیا۔ کہ اسے کس قدر حصہ نور آفتاب کا پہنچتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ دونوں ہی آفتاب سے کسب ضیا کرتے ہیں +

لوح محفوظ ایک نہایت لطیف امر خفی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ جسے ہم انشاء اللہ کسی اور کتاب میں بیان کرینگے۔ جس سے آفتاب بلکہ کل فی عالم الکون استفادہ و استفاضہ کرتا ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ درجات نور جو آفتاب کی طرف سے دیگر سیارات پر واقع ہوتے ہیں۔ اُن کا علم معصومؑ کو تھا۔ اگرچہ کسی اور کو اُس کی حقیقت اُس وقت تک معلوم نہ تھی۔ اس زمانے میں البتہ چند عالی ہمتوں نے اپنے مال اور اپنا عزیز وقت صرف کر کے آلات و نظارات کے ذریعے سے کسی قدر تقریبی اندازہ اس بات کا لگایا ہے۔ کہ کس قدر آفتاب کی حرارت اور اس کا نور دیگر سیارات تک پہنچتا ہے۔ اس کی نسبت ان کا بیان ہے۔ کہ آفتاب کے نور میں سے تین گنا زیادہ حصہ بہ نسبت زمین کے زہرہ کو ملتا ہے۔ اور عطارد کو آٹھ گنا زمین کا۔ زحل کو بہ نسبت زمین کے صرف نوّے جزوں میں سے ایک جزو کے بقدر پہنچتا ہے۔ اور انوس کو بہ نسبت زمین کے تین سو ساٹھواں حصہ۔ نبتون کو نوسوواں حصہ۔ جیساکہ فلامریوں فرانسیسی حکیم نے لکھا ہے۔ نیز یہ بھی دریافت کیا ہے۔ کہ آفتاب ہر سیارہ پر سے کتنا بڑا دکھائی دیتا ہے۔ زمین سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کوئی اتنا بڑا دائرہ ہو جس کا قطر ایک بالشت کا ہو۔ اور زہرہ والوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے جس کا قطر ڈیڑھ بالشت کا ہو۔ دو قدم کے قطر والے دائرہ کے برابر عطارد سے معلوم ہوتا ہے۔ نصف قدم کے قطر والے دائرے کے برابر مریخ والوں کو دکھائی دیتا ہے۔ ایک انار کے برابر مشتری سے معلوم ہوتا ہے۔ ایک نارنج کے برابر زحل والوں کو محسوس ہوتا ہے۔ ایک انڈے کے برابر ارانوس والوں کو۔ اور لوز کے برابر نبتون والوں کو۔"

ان امور کی تحقیق اُس زمانے میں جبکہ یہ حدیث بیان کی گئی ہے۔ تو ناممکن ہی تھی۔ سوائے خدا اور ائمہ ہدیٰ کے کوئی بھی ان اسرار سے مطلع نہ تھا۔ اسی وجہ سے معصومؑ نے یہ فرمایا۔ کہ یہ وہ بات ہے۔ کہ جو اسے جان لے۔ تو جھاڑی کے بیچوں بیچ والی لنے کو بھی جان سکتا ہے۔" یعنی کہ از بسکہ اس زمانے میں کوئی آلہ ان باتوں کے جاننے کا نہیں ہے۔ اس وجہ سے بغیر وحی و الہام کے کسی کو معلوم نہیں ہو سکتیں۔ البتہ اصحاب وحی و الہام بتعلیم الہی معلوم کر سکتے ہیں۔ اس بنا پر یہ مطلب کہ جھاڑی کے بیچوں بیچ کی لنے کو جاننا کہ کونسی ہے۔ اور ایک ستارہ کے لوز کا اندازہ دونوں مساوی حالت میں ہیں۔ کہ جب تک مبدء فیاض

کی طرف سے تعلیم نہ ہو معلوم نہیں ہو سکتی +

تتمۂ مطلب - اس مضمون سے قریب ایک اور حدیث بحار الانوار اور احتجاج طبرسی میں ابان بن تغلب سے مروی ہے - کہ جناب صادق آل محمدؐ امام ششم نے ایک یمنی منجم سے فرمایا "مشتری کی ضوء کا کتنا حصہ قمر پر پڑتا ہے"؟ اُس نے جواب دیا - "مجھے معلوم نہیں" پھر آپ نے پوچھا "عطارد پر کتنا پڑتا ہے"؟ اُس نے جواب دیا "مجھے خبر نہیں" +

اس حدیث سے بھی کئی لطیف مضمون کا استنباط ہوتا ہے - (۱) تو یہی کہ سیارات کُل مُظلم بالذات ہیں - (یعنی فی الحقیقت اور اصل یا سب کے لحاظ سے اتنے روشن نہیں ہیں - جتنے یہاں سے دکھائی دیتے ہیں - اگرچہ کسی قدر ذاتی روشنی ان میں ہے) - آفتاب سے روشنی کا اکتساب کر کے روشن ہوتے ہیں - کیونکہ معصومؑ نے عطارد - مشتری - قمر تینوں کو ایک ہی ذیل میں فرمایا ہے - اور ایک کا قیاس اور مقابلہ دوسرے سے اسی وقت کلام میں صحیح ہو سکتا ہے - جب کہ دونوں ایک نوع کے ہوں - لہذا معلوم ہوا - کہ جس طرح قمر مظلم بالذات ہے - اُسی طرح مشتری و عطارد وغیرہ بھی +

(۲) یہ کہ ضوء مشتری چاند کی ضوء سے فی نفسہ بہت زیادہ ہے - (جو اس قابل ہے - کہ کچھ اپنی طرف سے دوسرے سیارہ کو بھی دے سکے) - اگرچہ بظاہر نظر چاند کی روشنی زیادہ معلوم ہوتی ہے - اسی طرح بہ نسبت عطارد کے بھی مشتری کی ضیا زیادہ ہے - لہذا معلوم ہوا - کہ اس مقام پر اسلامی شریعت اور فلسفہ دونوں ہی موافق ہیں - اگرچہ ہماری شریعت ہی بحمد اللہ اس مطلب کی توضیح میں مقدم اور فلسفہ مؤخر ہے +

(۳) اس بیان سے ترتیب سماوات بھی سمجھ میں آئی - کیونکہ معصومؑ نے جس ترتیب سے انہیں بیان کیا ہے - وہی ترتیب نظام جدید کی بھی بیان کی ہے - یعنی اوّل آپ نے مشتری کو عدد سیارات میں سے ذکر کیا ہے - اُس کے بعد جو اس سے نیچے واقع ہے - یعنی قمر - اُسے بیان کیا - اُس کے بعد جو نیچے ہے - یعنی عطارد اُسے بیان کیا - یہی بیان ہیئت جدیدہ کا بھی ہے - جو فلسفہ قدیمہ سے بالکل مخالف

ہے۔ کیونکہ اس کی ترتیب یہ ہے۔ کہ قمر۔ عطارد۔ زہرہ۔ شمس۔ مشتری۔ مریخ اور زحل۔ اور اس میں اُس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

تیسرا قول شریعت۔ کتاب فرج المہموم میں سید علی ابن طاؤس علیہ الرحمۃ و بحارالانوار میں علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ نے بسند ہائے کثیرہ جناب امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے روایت کی ہے۔ کہ آپ نے سرسفیل منجم دہقان فارسی سے بر سبیل امتحان دریافت کیا۔ اخبرنی عن طول الاسد وتباعدہ من المطالع والمراجع وما الزھرۃ من التوابع والجوامع "بتاؤ کہ اسد کا طول کتنا ہے۔ اور مطالع و مراجع سے اس کا فاصلہ کس قدر ہے۔ اور توابع و جوامع سے زہرہ کو کیا نسبت ہے"۔

(اقول) متاخرین کے نزدیک "توابع" چاندوں کو کہتے ہیں۔ کیونکہ اپنی سیر اور رفتار میں کرات سیارہ کے تابع ہیں۔ اور مولد و منشا میں بھی ان ہی کے تابع ہیں۔ جس طرح دیگر سیارات کا مولد و منشا وہی ہے۔ جو آفتاب کا ہے۔ "اور شموس" یعنی آفتابوں کو "جوامع" سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیونکہ اپنے نظام کے ذریعے سے دیگر سیارات متفرقہ کے جامع اور ایک سلسلہ میں بسبب اپنی قوت جاذبہ کے قائم رکھنے والے ہیں۔

اور یہ بھی متاخرین کا خیال ہے۔ کہ سیارات درمیان میں اقمار اور شموس کے واقع ہوئے ہیں۔ اور یہ کہ سیارات اُن شموس کے لئے تو بجائے بیٹوں کے ہیں۔ اور چاندوں کے لئے بجائے ماؤں کے۔ اُن کے مجذوب اور ان کے جاذب ہیں۔ علٰے ہذاالقیاس اکثر جہات سے سیارات کو جوامع یعنی شموس سے ارتباط حاصل ہے۔ اور اسی طرح توابع یعنی اقمار سے بھی۔ اور سیر۔ جذب۔ خلقت۔ محل اور حجم وغیرہ میں ان دونوں کے درمیان متوسط ہیں۔

اس بنا پر کلام معصومؑ کے معنی بالکل واضح ہیں۔ جو آپ نے فرمایا ہے کہ ما الزھرۃ من التوابع والجوامع۔ یعنی "سیارہ زہرہ کی نسبت ان دونوں سے یعنی چاندوں اور آفتابوں سے کس قسم کی ہے۔ اگر سرسفیل اس ہیئت جدیدہ کو جانتا ہوتا۔ تو یہی جواب دیتا کہ توسط کی نسبت ہے۔ یعنی چاندوں کو سیارات سے وہی نسبت حاصل ہے

جو سیارات کو آفتابوں سے ہے۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔ اس لحاظ سے زہرہ کا ذکر بالخصوص کرنا یا تو اس وجہ سے ہے۔ کہ مطلق سیارات کی ایک فرد کو آپ نے پوچھا ہے۔ تاکہ ایک ہی جواب سے اوروں کا حال بھی معلوم ہو جائیگا۔ اور یا اس وجہ سے کہ بہ نسبت اور سیارات کے یہی زیادہ روشن اور نظروں میں زیادہ واضح و مشہور ہے۔ واللہ اعلم +

ختم ہوا ترجمۂ کتاب الہیئۃ والاسلام

التماس مترجم

مترجم کی التماس ناظرین کتاب سے یہ ہے۔ کہ اگر ترجمہ میں کسی قسم کا سقم پائیں۔ تو اُس سے مطلع فرمائیں۔ صرف اپنے مقام پر خوردہ گیری سے جو غیبت مذمومہ میں داخل ہے۔ اپنے تئیں بچائیں۔ اور اگر پسند آئے۔ تو دعاے خیر سے یاد کریں۔ والسلام +

الملتمس الداعی

محمد ہارون۔ زنگی پوری

۱۲ شوال المکرم ۱۳۲۹ سنہ ہجری

فہرست کتب موجودہ دفتر "البرہان"

البرہان جلد اوّل - تمام وکمال نمبرات "البرہان" کے ذخیرہ رکھے گئے ہیں۔ تاکہ وہ حضرات جن کو اطلاع نہیں ہوئی - یا کسی وجہ سے اس سال اس سے مستفید نہیں ہو سکے آئندہ بوقت ضرورت اس کی نایابی پر افسوس نہ کریں - قیمت میں رعایت کر دی گئی ہے۔ یعنی صرف دو روپے مع محصول ڈاک +

تحفۃ الاتقیاء - یعنی فخر العلماء والفقہاء جناب سید مرتضے علم الہدے کی کتاب مستطاب **تنزیہ الانبیاء** کا اردو ترجمہ - کتاب مذکور **تخطیۃ الانبیاء** کا جواب ہے۔ جس کے مصنف نے حضرت آدمؑ سے جناب خاتمؐ تک اکثر انبیاء پر تہمت و الزام لگانے اور بیجا اعتراض کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا - سید علیہ الرحمہ نے عصمت انبیاء پر دلائل و براہین عقلیہ قائم کرنے کے بعد ہر ایک ایراد و شبہے کا جواب نہایت خوش اسلوبی سے دیا ہے۔ اصل کتاب پر بہت سی آیات و احادیث اڈیٹر "البرہان" کی طرف سے اضافہ کی گئی ہیں - اور بعض ضروری مقامات کی تشریح بھی کی گئی ہے جس سے کتاب کی خوبی دوبالا ہو گئی ہے۔ ہر مومن کے واسطے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے - قیمت ۱۲؍ رعایتی ۸؍ بلا محصول ڈاک +

طریقۃ الصلوٰۃ - جس میں جملہ واجب اور سنتی نمازوں کے طریق اور ان کے احکام کو سلیس و بامحاورہ اردو میں بیان کیا گیا ہے - کہ معمولی لیاقت کا آدمی بھی بلا کسی کی امداد کے سیکھ سکتا ہے - گویا یہ مختصر رسالہ استاد کا کام دیتا ہے قیمت ۲؍ علاوہ محصول ڈاک +

توحید القرآن - یہ مانی ہوئی بات ہے - کہ مذاہب عالم کے مقابلہ میں توحید کو اسلام نے نہایت خوبی کے ساتھ ثابت کیا ہے - اور خدا کی آخری کتاب قرآن مجید نے دوسری آسمانی کتابوں کے مقابلہ میں اس خاص ضروری مسئلہ میں بھی فصاحت کے دریا بہائے ہیں - اس دعوے کے ثبوت میں توحید القرآن ایک زبردست شہادت ہے - یہ کتاب کتاب خدا کی توحیدی شان کو اردو زبان میں اس خوبی سے پیش کرتی ہے جو اس کا حق ہے - اس کے مصنف جناب مولوی سید محمد ہارون صاحب ممتاز الافاضل دام مجدہ ہیں اسے قرآنی توحید کے بے بہا جواہرات کا خزانہ اپنی وضع کی بالکل نئی اور پہلی کتاب کہنا چاہئے - تقطیع ۲۰×۲۶ ۸ حجم ۳۰۸ صفحے قیمت ۱۲؍ بلا محصول ڈاک +

المشتہر: مینجر رسالہ "البرہان" لاہور

اعلان